جلد (۷) - اگست ۱۹۰۴ء نمبر (۵)

ایڈیٹر
شیخ عبد القادر بی - اے

مخزن



اردو علم ادب کی دلچسپیوں کا ایک ماہوار مجموعہ

مضامین

سمندر - شیخ عبد القادر (لنڈن) ۱
ناکام محبت - میر نذیر حسین بی - اے - ۷
لاہور کی اک شام - مضطر ایم - اے - ۱۳
پٹنہ - ایڈیٹر ---- ۱۸
طہران - منشی ظفر علی خان بی - اے - ۲۶
حکیم گلیلیو - میر فیض الحسن بی - اے - ۳۳
کانِ نمک - سرسری نظر ۳۷
اُجڑا ہوا گھر - پیرزادہ بشیر احمد (لنڈن) ۴۰
بہارِ کباد سفر - سرور جہان آبادی - ۴۱
کلام ثاقب - محمد احسن اللہ خان ثاقب رئیس آگرہ ۴۲
برسات کا سماں :-
(۱) میر نیرنگ ---- ۴۴
(۲) حضرت داغ ---- ۴۵
(۳) سید علمدار حسین (پنڈی) ۴۶
(۴) مولینا ضمیر الدین عرش گیاوی
(۵) طالب بنارسی ---- ۵۰
(۶) محمد فخر الدین عاجز ---- ۵۲
(۷) منشی دوارکا پرشاد گہر لکھنوی ۵۴
بادکش کی تقریر - منشی رام سہا تمنا لکھنوی - ۵۷
محبت - میاں محمد شفیع بیرسٹرایٹ لا - ۵۸
قطعات آہ - ابو النصر آہ دہلوی ---- ۵۹
کلام شاطر - مولینا عبد الرحمن صاحب شاطر (مدراس) ۶۰ - غزل ناداں ۶۴

نو کروڑ ہندوستانی اردو بولتے ہیں - اور اسی قدر اور ہندوستانی اردو سمجھتے ہیں -
○ ان شہروں میں اردو مادری زبان ہے - □ ان شہروں میں اردو مروّج ہے - ⊕ ان شہروں میں اردو سمجھی جاتی ہے -

لاہور خادم التعلیم سٹیم پریس لاہور میں باہتمام منشی محمد عبد العزیز مینیجر کی اہتمام سے چھپا اور کانپینہ کے خانہ اخبار
اور شیخ محمد اکرام اسسٹنٹ ایڈیٹر نے شائع کیا

مخزن

سمندر

یکے دریانہ وے را بُن پدید و نے کراں پیدا

درو اندیشہ حیراں وہم سرگرداں خرد شیدا

پیارے اقبال! آپ گذشتہ خط میں مجھ سے سمندر کی کیفیت پُوچھتے ہیں۔ متحیر ہُوں کہ کیا لکھوں۔ ہم لوگوں کو خُدا نے ہندوستان جیسے وسیع برّ اعظم کے اندرونی حصّہ میں سمندر سے صدہا میل کے فاصلہ پر پیدا کیا ہے۔ اور ہمیں عموماً ساحلِ سمندر کی سیر کے بھی مواقع کم ملتے ہیں۔ پس خُدا کی مخلوقات کے اُس عجیب اور نہایت زبردست حصّے کی کیفیت کا ذہن نشین ہونا جسے ہم لفظِ "بحر" سے تعبیر کرتے ہیں۔ بغیر جنابِ بحر کی زیارت کے ہمارے لیئے ناممکن ہے۔ جب مَیں جہاز پر سوار ہُوا تو ایک خاص کیفیت میرے قلب پر طاری تھی اور جُوں جُوں سمندر میں دُور نکلتے گئے۔ وُہ زیادہ ہوتی گئی۔ سمندر کی ناپیدا کنار سطح کا نظّارہ طرح طرح کے خیالات دل میں پیدا کرتا تھا۔ الفاظ اُن خیالات کی تصویر کیا کھینچ سکینگے۔ مگر۔ خیر۔ کوشش کرتا ہُوں کہ اُن جذباتِ دلی کو آپ کے روبرو کھول کے رکھدوں۔ اور آپ اپنی بے نظیر قوّتِ متخیلہ سے کام لے کر وُہ کیفیت اپنے اُوپر وارد کرلیں۔

جن لوگوں کا علم سمندر کے متعلق جغرافیہ کی کتابوں کی اصطلاحی تعریف۔ اور نقشہ کے

نیلگوں رنگ سے لیا گیا ہے۔ انہیں کیا معلوم۔ کہ صانعِ حقیقی نے اپنی صنعتِ کاملہ کا کتنا پُر زور نمونہ دن رات سائیں سائیں کرنے والے سمندر میں دکھایا ہے۔ دُنیا میں کونسی طاقت ہے جو اندازہ لگا سکتی ہے۔ کہ صدہا میل کی لمبائی اور صدہا میل کی چوڑائی میں جو پانی پھیلا ہوا ہے اور جس کے عُمق کا اندازہ عقلِ انسانی کے احاطہ سے باہر ہے۔ حجم میں یا وزن میں کتنا ہے۔ کسے خبر ہے کہ اُس کی گہرائیوں میں کیا کیا چھپا ہُوا ہے۔ اور کون کون سے اغراض اُس کے وجُود سے وابستہ ہیں۔ خشکی پر آپ ایک وسیع سے وسیع میدان میں کھڑے ہو کر دیکھیں۔ کہیں نہ کہیں آپ کی نظر رُکے گی۔ اور کچھ نہیں تو کہیں کوئی ٹیلہ۔ کہیں کوئی تعمیر۔ کہیں کوئی درختوں کا جھُنڈ۔ کہیں سبزہ۔ کہیں ویرانہ۔ نظارہ کی یکرنگی میں خلل انداز ہو گئے۔ مگر واہ رے سمندر۔ کنارہ سے تھوڑی دُور نکل جانے کے بعد۔ جس وقت نظر دوڑاؤ۔ جدھر نگاہ ڈالو۔ جس طرف آنکھ پھیرو۔ پانی کی ایک مسلسل سطح دکھائی دیتی ہے۔ جہاز ہے کہ دِن کو بھی چلتا ہے اور رات کو بھی۔ اہلِ جہاز تھک کر سو جائیں۔ مزدُور باری باری سے آرام کریں۔ مگر انجن ہے کہ چل رہا ہے۔ اور راستہ ہے کہ طے ہوتا جاتا ہے۔ لیکن اگر اس کا ثبُوت چاہو اور کوئی نشان ڈھونڈھو۔ تو ندارد۔ وُہی پانی کا ایک احاطہ جہاز کے گرد کل تھا۔ وُہی آج ہے۔ جہاں تک حدِ نگاہ جاتی ہے۔ خشکی کا نام نشان نہیں۔ بہت ہوا تو کبھی دُور سے کسی دُوسرے جہاز کی دُھندلی سی تصویر نظر آگئی۔ جیسے ایک بڑی تقطیع پر ایک باریک سا نُقطہ ہو۔ مگر یہ نسبت سمندر کے اُس جُزو سے کہی جا سکتی ہے۔ جو ایک وقت میں پیشِ نظر ہوتا ہے۔ کُل کا تو کیا کہنا۔ اُس کا تو کوئی حساب ہی نہیں۔

مَیں نے جب پہلی مرتبہ سامنے سے ایک جہاز آتا ہوا دیکھا۔ اور اس کی چھوٹائی پر اظہارِ تعجب کیا۔ تو ایک رفیقِ سفر جو پاس کھڑا تھا۔ کہنے لگا۔ "یہ آپ کا جہاز بھی تو انہیں اِسی طرح چھوٹا نظر آتا ہوگا"۔ بات تو اُس نے ٹھیک کہی۔ مگر ہم تو اپنے جہاز کو چھوٹے پیمانے

پر ایک دُنیا مانے ہُوئے تھے۔ اُسکا قول فوراً خاطر نشین نہیں ہوا۔ خیال آیا کہ شاید وُہ جہاز چھوٹا ہی ہو۔ اپنے جہاز کے ایک افسر سے جو دُوربین لئے دُوسرے سٹیمر کو دیکھ رہا تھا۔ جاکر پُوچھا۔ کہ وُہ جہاز کتنا بڑا ہے۔ اُس نے کہا اسی کمپنی کا جہاز ہے اور دو نو قریب قریب یکساں ہیں۔ اب یقین تو کرنا پڑا۔ اور اس یقین کا نتیجہ تھا۔ یہ سلسلۂ خیالات۔ کہ کیا ہم سب ملکر فی الحقیقت اس دریائے ناپید اکنار کی ہستی کے مقابلے میں ایک نُقطہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یا اُس سے بھی کم"۔ عقل سلیم نے آواز دی "بیشک" "کیا ہندوستان کے گردن کش اور بالا دست حکمرانوں کا ایک کثیر گروہ بھی اسی نُقطہ میں آگیا"؟ "بلاشبہ"۔ "گیا اُنکی سچی غمگسار بیبیاں۔ جو حُسن و جمال میں چندے آفتاب چندے ماہتاب ہیں اور جن کے باریک ریشمیں کپڑے اپنی لپیٹ میں دم رفتار کئی دلوں کو لئے جاتے ہیں وُہ بھی اِسی نُقطہ کا ایک جُزو ہیں"۔ (اگر ریاضی دانوں کے مذہب کے خلاف ہم نُقطہ کا جُزو کہنے کے مجاز ہیں)۔ "ہاں وُہ بھی اسی میں شامل ہیں"۔ کیا ہندوستان کے وُہ چیدہ چیدہ آدمی جن میں سے ہر ایک اپنی اپنی قوم میں یا باعتبار تجارت۔ یا ثروت۔ یا علم۔ یا مرتبت امتیاز رکھتا ہے۔ اور جو اپنے خیال میں بڑی اُونچی ہوا میں اُڑتے ہیں۔ اُن کا شمار بھی اسی میں ہے"۔ عقل نے خیال کی گوشمالی کی اور کہا۔ کہ "باولا ہو گیا ہے۔ جب ایک دفعہ کہدیا کہ یہ تمہارا سارا جہاز مع تمام مسافروں اور مال اور اسباب اور زر و جواہر کے سمندر کے مقابلے میں ایک نُقطہ سے بھی کم ہے تو تُو ایک ایک جُزو کا کیوں نام لیتا ہے"۔

خیال۔ (بے صبری سے) "تو گویا حضرتِ انسان خشکی پر بیٹھے یُونہی اترایا کرتے ہیں۔ اِنکی اصل ہستی اتنی ہی ہے۔ یہ تو غنیمت ہے کہ سمندر سکون میں ہے اور ہم مزے سے جا رہے ہیں۔ لیکن اگر ذرا غصہ میں آجائے اور جوش میں مُنہ کھولدے تو ہم سب ایک نوالہ بھی نہیں"۔

عقل "۔ اس میں کیا کلام ہے۔ ابھی تو وسطِ بحر میں ہو۔ کیا معلوم انجامِ سفر تک

۵ ـ کیا پیش آئے

"دامِ ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہوتے تک"

اس شعر میں جو گہرے معنے غالبِ مرحُوم نے بھر دیئے ہیں۔ ان کی حقیقت بھی پُورے طور پر نہیں کھلتی ہے۔ موج کے دام کا تو ہمیں مشاہدہ ہوتا ہے اور اس کے بیان کے لئے "صد کامِ نہنگ" سے بہتر الفاظ خیال میں بھی نہیں آ سکتے۔ ہم نے تو موج کو مُنہہ کھولے نہیں دیکھا۔ مگر جن لوگوں کو اکثر بحری سفر کا اتفاق ہُوا ہے۔ وُہ بتاتے ہیں کہ بعض اوقات ایک ایک لہر ایسی پُر شور اور تُند آتی ہے۔ کہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک بڑا نہنگ مُنہہ کھولے ہُوئے آ رہا ہے۔ جو جہاز کو نگل جائیگا۔ پانی جہاز کے تختہ سے بہت بلند ہو کر اس کے دُوسرے پار جا گرتا ہے اور جہاز سے ٹکرا جائے تو اس پر ایک شدید زلزلہ آ جاتا ہے۔

ہمیں تو حُسنِ اتفاق سے سمندر حالتِ سکون میں مِلا۔ اور اسی لئے خیالات کی گنجائش تھی۔ ورنہ گھبراہٹ میں سوائے خوف کے اَور کیا خیال رہتا ہے۔ قطرہ کا لفظ زبان سے نکلنا تھا کہ مجھے سعدی شیرازی کے دو شعر یاد آئے۔ ہائے کیا لوگ تھے۔ فرماتے ہیں:۔

یکے قطرہ باراں زابرے چکید　　　خجل شد چو پہنائے دریا بدید
کہ جائے کہ دریاست من کیستم　　　گر او ہست حقا کہ من نیستم

کس طرح روزمرّہ کے واقعات سے سبق حاصل کرتے تھے اور معمولی مشاہدات میں کیسے دفترِ حکمت اور معرفت کے بند کر گئے ہیں۔ لفظ دریا سے یہی سمندر تو مراد ہے۔ ہمارے ہاں کے ندی نالوں کو تو دریا نہیں کہنا چاہیئے۔ قطرہ پر واقعی دریا کے مشاہدے کا یہی اثر ہونا چاہیئے۔ کہ وُہ اپنی ہستی کے ناچیز ہونے سے آگاہ ہو جائے۔ سمندر کا اثر انسان کے دل پر اگر اتنا بھی نہ ہو۔ تو حیف ہے۔ سمندر کی وسعت سے موجُودات

کی وسعت کی طرف خیال دوڑتا ہے اور جہاز اور اہلِ جہاز کی مجموعی ہستی کا پہنائے دریا کے مقابلے میں ہیچ ہونا یہ یقین دلاتا ہے کہ انسان باوجود اپنی ساری لن ترانیوں کے ہیچ ہے۔ یہ انکسار طبعِ انسانی کے لئے اکسیر کا حکم رکھتا ہے اور غرور و تکبر کے مرض کا علاج ہے۔ لیکن اس کا نتیجہ یہ نہیں ہونا چاہئے۔ کہ ہمت اور تدبیر میں کمی آجائے۔ ہمت اور تدبیر ہی کمزور انسان کو یہ قوت عطا کرتی ہیں کہ وہ اس طرح ہوا اور لہر دونو سے بے پروا خدا کی توکل پر پانی میں کود پڑتا ہے۔ اور ننانوے فی صدی سے زیادہ مواقع ایسے ہیں۔ جن میں وہ پار جا لگتا ہے۔

سکون کے وقت سمندر کا دیدار آنکھوں کو فرحت بخشنے والی چیز ہے۔ تختۂ جہاز پر کھڑے ہو کر دیکھیں تو لہروں کا ایک لاتعداد سلسلہ نظر آتا ہے۔ جو ہوا کے نرم نرم جھونکوں کے اثر سے جو سمندر پر قریب قریب ہر وقت آتے رہتے ہیں۔ ایکدوسرے کے پیچھے حلقے بناتا ہوا چلا جاتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لہریں ایکدوسرے کے پیچھے دوڑ رہی ہیں۔ صبح کے وقت جب آفتاب نکلتا ہے۔ اور جھلتی ہوئی لہروں کی سفید جھاگ پر اس کی کرنیں گرتی ہیں۔ تو قوسِ قزح کے سارے رنگ دفعتاً شفاف پانی کے تختوں میں چمک جاتے ہیں اور دور افق کے قریب تو سنہری روپہری فرش بچھتا ہوا نظر آتا ہے۔ گویا شاہِ خاور کے خیر مقدم کے لئے سامان ہو رہا ہے۔ جوں جوں آفتاب اونچا ہوتا آتا ہے۔ سمندر کا قدرتی اور مستقل نیلگوں رنگ اپنی اصلی آب دکھاتا ہے۔ ہوا میں کچھ دیر کے لئے نہایت خفیف سی حدت پیدا ہوتی ہے اور لہریں ذرا غیر معمولی طور پر ساکن رہنے کی طرف مائل ہوتی ہیں۔ گویا قدرت بھی دوپہر اور قیلولہ کو جمع کرنا چاہتی ہے۔ سورج ڈھلا۔ اور لہروں نے ہاتھ پانو مارنے شروع کئے۔ شام کا وقت ان کی بھی سیر تفریح کا ہوتا ہے۔ سکون کے دنوں میں بھی ذرا سی حرکت شام کے قریب ان میں آجاتی ہے۔ شاید اس وقت ورزش کے طور پر مشقِ ستم کرتی ہیں۔ ہنستی ہنستی جہاز کی طرف دوڑتی ہیں اور بہت

سے ناواقفِ حال چہروں کی رنگت متغیر کر دیتی ہیں۔ کبھی کبھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جہاز کی گستاخانہ رفتار سے ناراض ہو کر اُسے تھپیڑے مارنا چاہتی ہیں۔ مگر پھر ہنس کے پیچھے ہٹ جاتی ہیں۔ ان کے رمز شناس مسکراتے ہُوئے ان اٹکھیلیوں کے مزے لیتے ہیں۔ شام ہُوئی اور مسافروں نے بسیرے لئے۔ رات کو ستارے ہوتے ہیں اور موجیں اُنکے راز و نیاز میں ہم کو کیا دخل۔ ہاں کہیں اتّفاق سے شبِ ماہ ہو۔ جیسا کہ ہمیں چند دن نصیب ہُوئی۔ تو سبحان اللہ۔ یہ سماں سمندر پر عین شباب کی مستی کا ہوتا ہے۔ پانی کیا اُچھلتا ہے۔ پگلی ہُوئی چاندی کی لہریں ہیں جو ماہتاب کی طرف دستِ شوق بڑھاتی ہیں۔ اور اُس سے ہم آغوش ہونا چاہتی ہیں۔ اور ماہتاب ہے کہ انکی جسارت کو چشمِ محبّت سے دیکھتا ہے اور اُن کی طرف کھینچتا ہُوا معلوم ہوتا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ خیال ہی خیال ہو۔ مگر اتنا تو ضرور ہے۔ کہ اُس کی روشنی میں اس وقت ایک عجیب سرور کی کیفیّت پائی جاتی ہے۔ جس کی تاثیر محبت ہوتی ہے۔ مہجوروں کو بھولے ہُوئے یارانِ وطن یاد آتے ہیں۔ جن کے دوست عزیز ساتھ ہیں۔ وُہ اُن سے گھُل مِل کے باتیں کر رہے ہیں اور جو چاہنے والے شوہر اور چہیتی بیبیاں جہاز پر ہیں اُن کی تو اُسوقت کچھ نہ پُوچھئے۔ دستِ شوق بے خبری میں کمر کے گِرد خمِ کمند بنا رہا ہے۔ اور لبِ اظہار سے فصاحت کے دریا بہ رہے ہیں۔ جن کا ماحصل اس فقرہ میں ہے۔ کہ "سمندر کا سفر۔ اس خوشگوار موسم میں۔ اور خصوصًا ایسی چاندنی کے وقت کتنا پیارا سفر ہے"۔ خیر۔ یہ تو با اقبال لوگوں کی کیفیتیں ہیں۔ ہمیں اِن سے کیا۔ مَیں تو زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتا ہُوں۔ کہ اقبال کو بُلاؤں۔ کہ "تُو آ۔ اور دیکھ"۔

عبد القادر

ناکام محبّت

ایک روز کا ذکر ہے مَیں ٹہلتا ٹہلتا دیہات کی طرف جا نکلا۔ چُونکہ دُور بہت نکل آیا تھا واپس ہوتا ہُوا دم لینے کے لئے راستے میں بیٹھ گیا۔ تھوڑی ہی دیر گذری تھی کہ دُور سے ایک جنازہ آتا دکھائی دیا۔ نزدیک آیا تو معلوم ہُوا کہ کچھ نوجوان لڑکیاں ایک تابُوت کو اُٹھائے ہیں اور ایک جو اُن سب سے کسی قدر بڑی عمر کی ہے تابُوت کے آگے آگے سفید پُھولوں کا ایک ہار ہاتھ میں لئے آ رہی ہے۔ پوشاک ان سب نازنینوں کی سفید رنگ کی تھی۔ تابُوت کے پیچھے پیچھے متوفّی کے والدین تھے۔ جن کی وضع سے ظاہر تھا کہ کوئی اچھے خوشحال کسان ہیں۔ باپ کے چہرے سے صبر و استقلال عیاں تھا مگر جمی ہُوئی نظر چڑھی ہُوئی تیوری اور جُھریوں دار چہرہ بتا رہا تھا کہ اندر دِل کی حالت کچھ اَور ہے۔ ماں اپنے خاوند کے بازو پر جُھکی تھی اور رہ رہ کر بیتاب ہوتی تھی۔ مَیں جنازے کے ساتھ ہولیا اور دفن کے بعد تک لوگوں کے ساتھ رہا۔ جب تابُوت کو قبر میں اُتارا ہے۔ سہیلیاں پُھوٹ پُھوٹ کر روتی تھیں باپ کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور ماں کا یہ حال تھا کہ کوئی تسلّی دیتا تھا تو اَور بیچَین ہوتی تھی۔ افسوس جس ماں کا گُلِ گلزارِ خوبی عینِ بہار میں یکایک یُوں پژمردہ ہو کر رہ جائے وہ اگر یہ بھی نہ کرے تو اَور کیا کرے!

قبرستان سے واپس ہو کر میں نے سارا حال معلوم کر لیا۔ اور معلوم کرنے کو کیا ایک نہایت سادہ کہانی تھی۔ متوفّی گاؤں کی ممتاز حسین اور سارے کسانوں کی لاڈلی نوجوان لڑکی تھی۔ یہ اپنے ماں باپ کی اخیر عمر کی ایک ہی بچّی تھی اور دیہات کی سیدھی سادی معاشرت میں بڑے نازوں سے پَل کر جوان ہُوئی تھی۔ تعلیم اِس نے

گاؤں کے پادری سے پائی تھی اور وُہ اس پر بیحد شفقت کیا کرتا تھا۔ اس کا نازک ڈیل ڈول دلفریب خدوخال البیلا حُسن خداداد دلرُبا بھولا پن غضب کا الھڑ پن اور بیحد نیک دِل یہ کہتا تھا۔ کہ کھیت کے مضبُوط مضبُوط درختوں میں حُسنِ اتّفاق سے باغ کا ایک نازک نونہال پھلنے پھُولنے کو آپڑا ہے۔ سہیلیاں اُس کے حُسن کی برتری کو تسلیم کرتی تھیں۔ مگر حسد نہ کرتی تھیں۔ اس کی بلا تصنّع نرم مزاجی اور دلرُبا خوش اطواری ایسی تھی کہ یہ خیال ناممکن کیسا محالِ محض تھا۔ دیہات کا کونسا تہوار تھا جس میں ہماری خوبصورت کسان کی لڑکی اپنی سہیلیوں سمیت شریک نہ ہوتی تھی۔ کونسی خوشی کی تقریب تھی جس میں اس کے قدوم میمنت لزوم سے لُطف دوبالا نہ ہو جاتا تھا۔ ہرے بھرے جنگل میں جھُولے ڈالے جاتے تھے۔ پھُول پہنے جاتے تھے۔ لُٹائے جاتے تھے۔ اور ہزاروں طرح طرح کے دِل بہلاوے ہوتے تھے۔ یہ جلسے گاؤں میں اکثر ہا کرتے تھے اور ان موقعوں پر کبھی کبھی شہر کے رہنے والے بھی تماشا دیکھنے کو آنکلتے تھے۔ ایک دفعہ ایسے ہی موقع پر سپاہیوں کا ایک دستہ گاؤں کے قُرب وجوار میں آکر ٹھہرا۔ بہت سے سپاہی تماشا دیکھنے کو آئے۔ ان میں ایک نوجوان افسر بھی تھا اُس پر اس گاؤں کی رہنے والی ملکۂ حسن و جمال مرجعِ خاص و عام کا اثر ایسا ہُوا کہ بیدھڑک اظہارِ محبت کرنے لگا۔ اُس کے محبّت بھرے جملوں۔ اُلفت کی نظروں پیار کے لہجوں اور سینکڑوں ملائم اور دل پسند حرکات وسکنات نے اس ننھے نازک بھولے بھالے دل کو چٹکیوں میں موہ لیا۔ اس کے دِل میں نوجوان سپاہی کی محبت روز بروز بڑھتی جاتی تھی۔ مگر اِسے معلوم نہ تھا کہ کیا ہو رہا ہے اور آخر کیا ہو گا۔ اِسے آئندہ کا خیال تک نہ آتا تھا۔ اُس کا منظورِ نظر جب پاس ہوتا تو یہ اُس کی باتوں اُس کے حرکات وسکنات میں محو رہا کرتی اور وُہ پاس نہ ہوتا تو یہ ایّام گذشتہ کے شیریں واقعات کو یاد کر کر کے جی بہلایا کرتی۔ اُفّو! اس لڑکی کو اپنے محبُوب سے کتنی محبّت تھی! نوجوان

بادکش کی تقریر

از منشی رام سہائے صاحب تمنّا لکھنوی - ڈپٹی انسپکٹر مدارس اوناؤ

جو ہیں اربابِ غرض ان کا نہیں پنہاں ہے حال
اپنے مطلب کے لئے لیتے ہیں یہ ہیریں نکال

یہ غرض وُہ ہے کہ جسکو الغرض ہے اپنی فکر
سب کے آگے ہے یہ پھیلائے ہُوئے دستِ سوال

جتنی ایجادیں ہُوئی ہیں "ہے ضرورت اُنکی ماں"
جس سے ہو پُوری غرض - طالب وہی چلتے ہیں چال

فصل گرمی کی جو سرگرمی سے آئی خلق میں
ہو گیا بیچین ہر پیر و جوان و خورد سال

بارشِ آتش ہُوئی وُہ چشمۂ خورشید سے
دھوپ میں باہر نکلنا ہو گیا امرِ محال

الاماں گرمی کی شدّت اُف ری حدّت فصل کی
ہر مسامِ مُو سے نکلا ہے پسینے کا ابال

تنگ ہے حبسِ ہوا سے رُوح کا بھی قافیہ
ہر مکاں میں ہر مکیں ہے بیقرار و پُر ملال

دیکھ کر یہ حالِ نازک لوگ گھبرائے بہت
دُور ہو کس طرح گرمی" کی یہ باہم قیل و قال

پہلے کوشش کی کہ ہو بادِ صبا اُن کی کنیز
لیکن اس کے آگے اُنکی گل سکی ہرگز نہ دال

جب ہوا آئی نہ قبضے میں تو سوچا اَور ڈھنگ
آیا دل میں بادکش تیار کرنے کا خیال

تاڑ کر اک تاڑ کو توڑیں کچھ اُس کی پتّیاں
اُنکو یکجا کر کے جمعیّت کا دکھلایا جمال

دستکاری بھی دکھائی - کام بھی اپنا کیا
ہاتھ میں لیکر گھمایا - مُجھ کو دُنیا کی مثال

جب مَیں گھُوما خود ہوا اُڑ اکے پیدا ہو گئی
ہو گئی غایب اُمس دِل ہو گئے سب کے نہال

جب تلک مَیں دُوسری صُورت میں تھا بالائے شاخ
کوئی بھی میری طرف مطلق نہ کرتا تھا خیال

جب سے پنکھا بن گیا بکنے لگا بازار میں
مجھ کو ہاتھوں ہاتھ اب لینے لگے نازک خیال

اب جسے گرمی لگی اُس کو ہُوئی میری تلاش
میری فرقت عاشق و معشوق کو بھی ہے وبال

بزمِ سُلطاں میں بھی مَیں پہنچا بفضلِ کبریا
دیکھو برگِ خشک نے دکھلا دیا کیا رنگِ جلال

دیکھئے تبدیلِ صورت بھی عجب اِک چیز ہے — بد پیدا ہو اِسی سے اور اِسی سے ہو ہلال
سچ جو پوچھو قدر کے قابل ہے یہ قولِ خرد — ہر کمالے را زوال و ہر زوالے را کمال
خشک پتّوں سے نہ گر پنکھا بناتے مجھ کو لوگ — آج کیونکر اِس قدر حاصل مجھے ہوتا کمال
اپنی بے قدری سے افسردہ نہ ہو انساں کبھی — وقت جب آتا ہے اچھا۔ دُور ہوتا ہے ملال
جو کرے کوشش کسی کی بہتری کے واسطے — اُس پہ رہتا ہے ہمیشہ فضلِ ربِّ ذوالجلال
بادکش کے قبضے میں جس طرح رہتی ہے ہوَا — اہلِ محنت کے بھی قبضے میں ہے جاہ و ملک و مال

اَے تمنّا ہے بیانِ بادکشِ ہندِ نفیس
ہو گیا شاداب و تر اسکی ہوَا سے باغِ قال

تمنّا لکھنوی

محبّت

(ترجمہ از انگریزی)

بتائے کوئی عشق کیا چیز ہے؟ — زبانیں ہیں جس کے بیاں پر فدا
یہ کیسی تڑپ ہے کہ جس کے بغیر — نہیں چین انساں کو آتا ذرا؟
یہ ہے کیوں مثالِ ہوَا بے قرار؟ — تُنا سا تغیّر سے ہے کیوں مدام؟
یہ موجِ خوشی ہے کہ طوفانِ غم؟ — دیا ہے یہ دونوں کے ملنے کا نام؟
محبّت ہے آقا محبّت غلام — یہ ہے مہرباں بھی، دل آزار بھی
اگر ہو تو رہتا ہے دِل بے قرار — نہ ہو تو نہیں دِل کو راحت کوئی
ہے ممکن کریں اس سے ہم اجتناب؟ — یقیناً مجھے اس میں شک ہے کمال
خوشی ہے یہی اس کے صدمے سہُوں — بغیر اس کے ہے زندگانی محال

(محمد شفیع بیرسٹر ایٹ لا)

قطعاتِ آہ

ہر سمت سے آرہی ہے آواز — اللہ بھلا بشر بُرے ہیں
اللہ ہماری شرم رکھ لے — تیرے ہی تو ہیں اگر بُرے ہیں

اسراف کی دُھوم ہر کہیں ہے — پابندیِ رسم دلنشیں ہے
اور اس کا نہیں خیال دل میں — "اب گھر میں ہمارے کچھ نہیں ہے"

رات کٹتی ہے بہر صورت فقیر و شاہ کی — اس نے ہنستے کاٹ دی اور اُسنے رو کے کاٹ دی!
گو کہ انکا جاگنا بھی غفلتوں کے ساتھ ہے — پر ہمیں دیکھو کہ ہم نے رات سوتے کاٹ دی!!

پی کے کرتا مذمتیں مے کی — تُو نے واعظ! مری سُنی ہی نہیں
جس میں "حق الیقین کی" بُو ہو — ایسی تو نے کبھی کہی ہی نہیں
تیری باتوں میں خاک ہو تاثیر — "ہائے کمبخت تُو نے پی ہی نہیں"

یہ تمکو کیا ہوا ہے اسیرانِ ہمصفیر؟ — اُٹھتے نہیں ہلائے سے بھی! سو گئے ہو کیا؟
ہم تو وُہی ہیں اگلے تمہارے نیازمند — چُپ چاپ کیوں ہو؟ ہم سے خفا ہو گئے ہو کیا؟

پیری میں رو رہا ہے جوانی کو پیر مرد — یعنے وُہ اگلے رنگ کے اب کھیل ہی نہیں
ایک خواب تھا زمانۂ ماضی کی چاہتیں — اگلا سا اب ملاپ نہیں میل ہی نہیں

پہلو میں دل ہے، دل میں امنگوں کا کال ہے
کیونکر جلے چراغ کہ اب تیل ہی نہیں

آرام کی چیزوں سے میسّر نہیں آرام
تھک تھک کے رہے جاتے ہیں کیوں راہِ طلب میں

دُنیا میں ہر اک طرح سے مشکل ہے بشر کو
کیا سر پہ کوئی لیکے چلے پائے سفر کو؟

شاعری اصلاً غلط گوئی نہیں
سب انہیں گندوں کے ہیں گندے خیال

جھوٹ کہنا شاعروں کا کام ہے
شاعروں سے شاعری بدنام ہے

ابوالنصر آہ دہلوی (از بمبئی)

کلامِ شاطر

اِس طرح اب عمر کٹتی ہے تری فرقت میں یار
مجھ سے شرمندہ اجل ہیں زندگی سے شرمسار

جل بجھیں پروانے ناحق یہ کسے منظور ہے
دوستو مجھ کو نہیں ہے حاجتِ شمعِ مزار

ماجرا گلشن کا بھولے اب کہاں وہ ولولے
کیوں قفس میں چھیڑتی ہے ہم کو اے بادِ بہار

فیضِ وصلِ گل سے تھی سب زمزمے اور چہچہے
کر رہا صیاد اگر سُننا ہے گلبانگِ ہزار

دوزخ و جنت ہے پنہاں تجھ میں اے صہبائے عشق
یا وہ نشے کے مزے تھے یا یہ تکلیفِ خمار

ہم وہی ہیں اور وہی گلشن ہے لیکن گل نہیں
چشم و دل میں اب کھٹک جاتا ہے یہاں ایک ایک خار

ناامیدی چشم و دل پر ہے میرے چھائی ہوئی
میری خاکستر میں اب باقی نہیں کوئی شرار

پاس سا دلسوز تو کب تھا بتا اے داغِ عشق
جل گئے سب دل میں رہ رہ کر کھٹکتے تھے جو خار

اِک نہ اِک کی یاد ہم دیکھا کئے ہیں عمر بھر
اب اجل کا ہے تمہارا ابھی کبھی تھا انتظار

چرخ کے سنگِ حوادث کا نشانہ ہیں ہمیں
اے حصارِ عافیت اے کنجِ تاریکِ مزار

مر گئے پر کون لپٹاتا تھا سینہ سے ہمیں — یہ بھی حسرت تو نے آخر کو نکالی اے فشار
عمر بھر جلتی ہے پروانہ کے سوزِ غم سے شمع — خوابِ راحت سے مگر ہوتا نہیں وہ ہوشیار
یاد ہے اے زندگی جو کچھ کیا تو نے سلوک — وقتِ آخر کہ سنائینگے اجل کو حالِ زار
اے بقائے رُوح ہر ہر آرزو میں خوف ہے — کیا کریں جیبِ تمنائے اجل میں بھی ہے خار

اب ہی دلسوزِ اک باقی ہے اے بادِ بہار — تیرے جھونکوں سے نہ بجھ جائے کہیں شمعِ مزار
زور تیرا کیا کہیں اے نشۂ جامِ الست — کاہ سے کوہِ گراں کا تو نے اُٹھوایا ہے بار
زالِ دُنیا تو نے مردوں کو دیے کیا کیا فریب — تیرا منہہ کالا ہوا ہے قحبہ خدا کی تجھ پہ مار
نیک و بد میں کیا تمیز اسکو فلک انصاف کر — عشق کا رہتا ہے جس کے سر پہ کافر جن سوار
اے زمانِ ہجر تو طولِ امل سے ہے دراز — توبہ رنداں سے بڑھ کر وصل تھا ناپائدار
دولتِ بیدار ہاتھ آکر گئی ہے خواب میں — کس سے ہم تعبیر پوچھیں اے اجل اے رازدار
شور کر کے کیوں جگاتی ہے ہمیں اے عندلیب — ہو گیا جی سیر ہم نے دیکھ لی گل کی بہار
اے لبِ ساغر تجھے اب منہہ لگائینگے نہ ہم — عیش سے در گذرے جھیلے کون تکلیفِ خمار
گر جُدا کرتا ہے اے صیاد کر دے ہم کو ذبح — کس طرح آئیگا مُرغِ دست پرور کو قرار
سخت جانی ۔ جیتے فرقت میں ہوئے ہیں ہم ذلیل — ہم کو دل پر دل کو ہم پر اب رہا کیا اعتبار
تو بھی اے بلبل کبھی گل تھی کبھی صیاد تھی — نالے کیوں کرتی ہے یہ ہے انقلابِ روزگار
جز اشارہ بات کرنی نزع میں ممکن نہیں — میرا مطلب اسکو اب سمجھا دیں میرے رازدار
رازِ الفت کیا چھپے جب دل ہی قابو میں نہ ہو — زور تجھ پر کیا چلے اے گریۂ بے اختیار
بال و پر بلبل کے ہیں اے گل ہوا میں منتشر — مژدہ لاتی ہے سُنانے اب کسے فصلِ بہار

کس لئے آغوش کو کھولے ہوئے ہے تو کنار — اپنی کشتی ہو چکی بادِ مخالف کا شکار
حسرتیں گن گن کے کٹتی تھیں جو راتیں اب کہاں — کیا ہوا جادو جو تھا وہ تم میں اے شب ہائے تار
تو نے پتھر کو جلایا جل گئے ہم رشک سے — وہ تری شوخی ہے برقِ طور اب تک یادگار

کس طرح آسان ہو تیغ و گلو کا مرحلہ
کیا کریں اے تشنہ کامی کُند ہی خنجر کی دھار

تجھ سے مجنوں! کان میں آکر اجل نے کیا کہا
کیا ہُوئی وُہ دشت پیمائی وُہ سیرِ کوہسار

ناخدا کے ناز ہم کب تک اُٹھائیں یا خدا
ڈوب جائینگے یہیں۔ در گذری تجھ سے ای کنار

خیر میخانہ کی ساقی ہم کو بھی کر دے خراب
سخت نادانی ہے یہاں مستوں میں ہنا ہوشیار

حوصلہ تیرا پتنگے کو کہاں بلبل نصیب
جل کے ہو جانا ہے ٹھنڈا بیوفائی کا شعار

آفریں ہمّت پہ تیری سہتی ہے کس کس کے ظلم
باغباں بد دل۔ عدو صیّاد۔ دشمن برق و خار

میری کشتی کب تک اے طوفان چکراتی رہے
یا ڈبو دے اسکو یا پہنچا دے ظالم تا کنار

اے طلسم خانۂ زندانِ ہستی ٹوٹ جا
شاہدِ مقصد سے اے یُوسف ہو جلدی ہمکنار

توڑ ہی ڈالا تری موجوں نے تو آخر کو دم
اب حوالے ہیں ترے اے بحرِ ناپیدا کنار

آہنِ تیرہ درول آلودۂ صد زنگ ہے
جذبِ مقناطیس کر اعجاز اپنا آشکار

عمر بھر تڑپا کیا اور ہم کو تڑپا یا کیا
ساتھ کیوں لاتے تجھے ایدل جو ہوتا اختیار

کیوں جئیں مر مر کے دل ہی پر نہ ہو جب اختیار
یُوں بھی ناصح ایک دن ہونگے اجل کا ہم شکار

دیکھتا ہُوں میں نگاہِ یاس سے وُہ قہر سے
اے منجّم کیا ستاروں سے رہُوں اُمّید وار

عالمِ غربت میں یارانِ وطن! جب تم نہیں
ہے برابر ہر جگہ گلزار ہو یا خار زار

دُور منزل حرص ساماں اور وقتِ شب قریب
کر کرم اے راہزن تا دوش سے اُترے یہ بار

اب وُہی تو ہے مگر اے جان ہے مار آستیں
یاد ہیں وہ دن کبھی جب آتا تھا تجھ پر ہم کو پیار

ہم ترے نیرنگ کے جب ہونگے قائل ای خیال
گر دلِ مُردہ بھی دیکھے تیرے جلووں کی بہار

ناصح ناداں نہیں واللہ اسکا نامِ صبر
مر گیا جب دِل ہی کیسا غم کہاں کا اضطرار

اسقدر مایُوس کرنا تھا نہ اے ناداں ہمیں
ہو چکے اب اے فلک ہر خوف و غم سے رستگار

دِل لرزتا ہے تری قسمت پر اے مینائے مے
دیکھئے کب تک سنبھالے تجھ کو دستِ رعشہ دار

خواب سے خوش تھے تو اب تعبیر سے گھبرائیں کیوں
ہم کو اب تعبیر در تعبیر کا ہے انتظار

ڈھونڈھتا پھرتا ہے دشت و در میں ای دیوانے کیا — نخل لیلیٰ ہی ترا دل ہی اَے مجنون زار
اَے دلِ مرحوم برسوں تک رہا غمخوار تو — بعد تیرے ہم بھی مرجاتے جو ہوتا اختیار
آنیوالی ہے بلا کوئی الٰہی خیر ہو — ورنہ کیوں ہے بے سبب ہم سے زمانہ سازگار
قید کرتا ہے دکھا کر دانہ چرخ مکر کیش — ذبح سے پہلے پلانا آب ہے اسکا شعار
چارہ اپنے درد کا ہم آپ کر گذرینگے یار — جب نہیں اُمّید تجھ سے موت کا کیا اعتبار
حقِ خدمت کرچکا ابرِ کرم اپنا ادا — برقِ خرمن سوز کے اب فرض کا ہی انتظار
ہم سے اور اَن بن تری کیا مصلحت ہی ای فلک — محرمِ اسرارِ نہاں اور رہے اس طرح خوار
رندِ دریا نوش ہیں ہم دیکھ اَے ساقی ادھر — یُوں تو میخانہ میں ہیں تیرے ہزاروں جرعہ خوار
شُعلۂ آوازِ نَے سے لگ گئی تن من میں آگ — غرقِ مے کردے مجھے اَے ساقیِ حکمت شعار
بجلیوں سے کب ڈرے تھے ہم جو اب ڈر جائینگے — ننگے سر پھرتے ہیں لے اَے آسمانِ ژالہ بار
ظرف عالی رکھتے ہیں ساقی نہیں منصُور ہم — رازِ پنہاں اور مستی میں ہو ہم سے آشکار!
ڈھونڈھتے ہیں رند ساقی کا پتا ملتا نہیں — العطش کی ہر طرف اس میکدہ میں ہے پکار
بھاگ کر تم سے کہاں جائینگے ای چرخ و زمیں — زندہ رہکر یا سہینگے ظلم یا مر کر فشار
بدلے مے کے اب میسّر ہے مجھے تلخابِ یاس — میکدہ تیرا ہے ای ساقی مرا کیا اختیار
روز لاکھوں خُون کیوں کرتا یہ جلّادِ فلک — بر سرت خاک ای زمیں گر تو نہ ہوتی پردہ دار
گرمیِ ہنگامۂ دُنیا و دیں ہی تجھ سے عشق — ق ۱ ہے ہر اِک شئے ذرہ تو ہے آفتابِ نُور بار
جذبِ ثقلی ایک ادنیٰ سا کرشمہ ہے ترا — ۲ دفترِ عالم کا شیرازہ ہے تجھ سے اُستوار
راہرو تیرے گذر جاتے ہیں بےخوف و خطر — ۳ چاہے دریا راہ میں انکے پڑے یا کوہسار

عبدالرحمٰن شاطر (از مدراس)

(باقی آئندہ)

غزلِ شاد

جسم کا ساتھ چھُٹا آپ سے باہر ہم ہیں
اب تو اپنے لئے اِک غیر سے بدتر ہم ہیں

زندگی جن کے سبب سے تھی وُہ سب چھوٹ گئے
آج تک عالمِ اسباب میں کیونکر ہم ہیں

تھک گئے پاؤں گئی دربدری شکرِ خدا
اب یوں ہی تابہ قیامت تیری در پر ہم ہیں

ان سوالات کا پایا نہ کہیں ہم نے جواب
کیا ہیں کس واسطے ہیں کون ہیں کیونکر ہم ہیں

حُسن و عشق ایک ہیں ظاہر میں فقط ہیں دو نام
یہ اگر سچ ہے تو کیا اُن کے برابر ہم ہیں

جلوۂ یار پہ ٹھہری رہیں تا دیر آنکھیں
نہ خدا ہیں نہ امام اور نہ پیمبر ہم ہیں

مُبتدا کی نہ خبر سمجھی ہو تم نے نہ سہی
گر ضمائر پہ کرو غور تو مُضمر ہم ہیں

تا قیامت رہے آئینہ سلامت یارب
ہر حسیں کو ہے یہ دعوےٰ کہ سکندر ہم ہیں

کان مُشتاق ہیں آنکھوں کی طرح مُدت سے
دید و آواز کہ اس پردہ کے اندر ہم ہیں

دشتِ اُمید کی جانب جو بڑھاتا ہوں قدم
موت آہستہ یہ کہتی ہے کہ سر پر ہم ہیں

عقل سے راہ جو پُوچھی تو پکارا یہ جنُوں
وُہ تو بھٹکی ہوئی خود پھرتی ہے رہبر ہم ہیں

دِل یہ کہتا ہے ہمیں دیکھ کتابوں پہ نہ جا
قدرتِ صانعِ مخلوق کے دفتر ہم ہیں

پھر تو ہو جائینگے بازارِ جہاں میں مہنگے
شاد ارزاں ہیں جبھی تک کہ میسّر ہم ہیں

تصحیحِ اغلاط

(۱) اپریل سنہ ۱۹۰۴ء کے رسالے میں سید نذیر حسین صاحب کی نظم بُلبلِ شیدا میں ایک دو غلطی رہ گئی ہیں ناظرین درست فرمالیں :-

بند ۳ - شعر ۱ - صحیح :- ترا پیارا سا ....

بند ۳ - شعر ۵ " تو فراقِ ستم آزار سے ....

بند ۴ - شعر ۲ " دِل تڑپتا ہے جو آتے ہیں ....

(۲) جولائی سنہ ۱۹۰۴ء کے رسالے میں حضرت شاد کی غزل کے پہلے شعر میں بجائے تب کے بت پڑھیں ۔

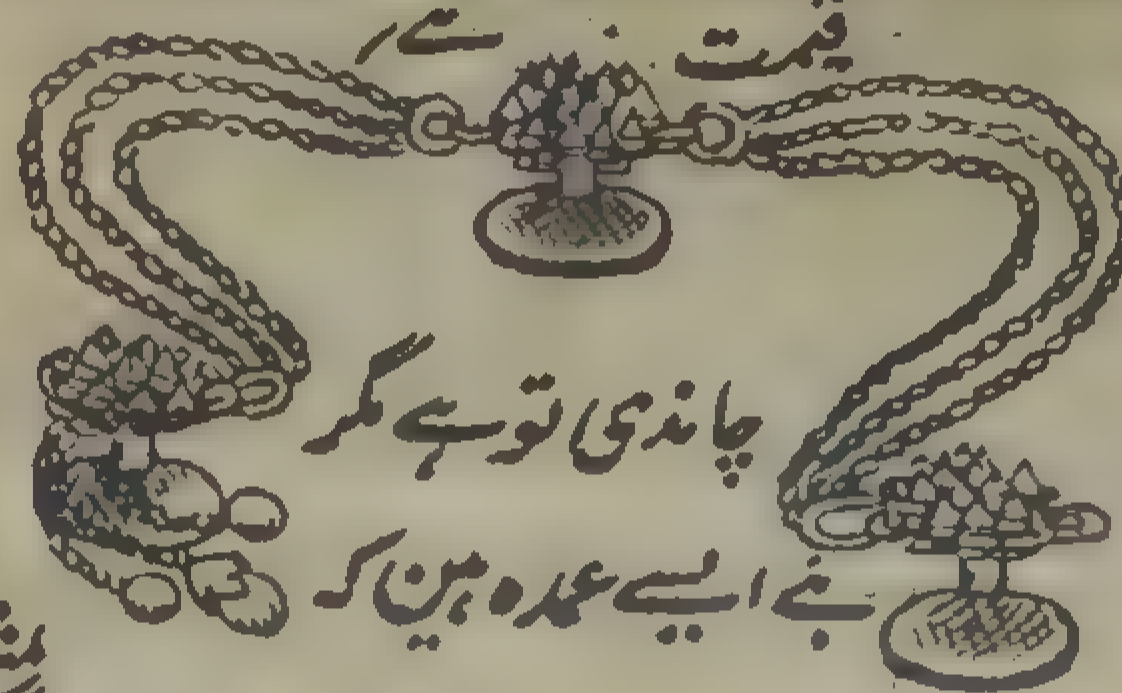
خالص چاندی کے عمدہ قفل نما بٹن



یہ بٹن خالص چاندی کے ہین اس کو
کاریگر نے بشکل قفل کنجی تیار کئے
ہین منگوا کر قمیص میں لگائے
قیمت فی سٹ دو روپیہ

کرتہ کے گریبان کے لئے چاندی کی زنجیر دار بٹن

قیمت ۳/



چاندی تو ہے مگر
بنے ایسے عمدہ ہین کہ
بابد شاید۔ یہ بٹن خالص چاندی کے بنے ہین جو اور جگہ بمشکل
تیار ہو سکتے ہین اسکا ڈائمنڈ کٹ بنا ہوا کام ہیرے کی طرح چمکتا ہے
قابل دید زنجیر مین آویزاں ہے قیمت فی عدد تین روپے

ناک کی طلائی اور مرصع کیلین

سونے کی شرط
نمبر ۱ نمبر ۲ نمبر ۳



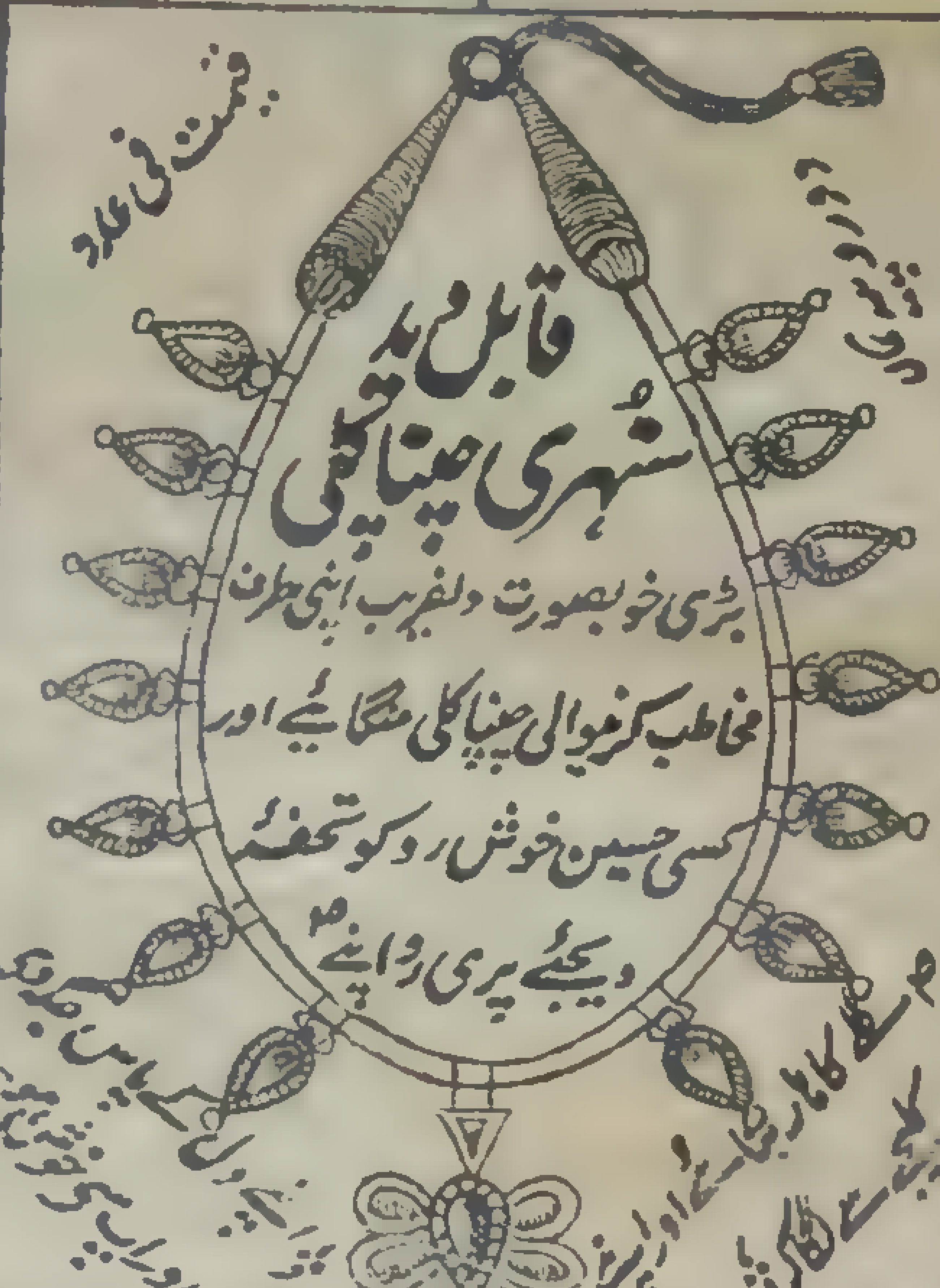
نمبر ۳ للعہ
کسی حسین کو منگا کر تحفہ دیجئے اور حسن خداداد کا تماشا دیکھئے۔

خالص چاندی کی کیری عطردانی

قیمت فی عدد ... روپیہ



اس کے اندر کاریگر نے
تین خانے بنائے ہین
جنمین الائچی اور عطر وغیرہ
آپ حفاظت کی ساتھ رہ سکتی
ہین اور بہت ہی خوبصورت
بنی ہوئی ہے۔



قیمت فی عدد

قابل دید سنہری چنپا کلی

بڑی خوبصورت دلفریب اپنی طرف
مخاطب کرنیوالی چنپا کلی منگائیے اور
کسی حسین خوش رو کو تحفہ
دیجئے پری روانہ

طلائی ملمع کیا جڑاو پھول جھمکا



یہ جڑاو کرنپھول جھمکا نہایت
نازک اور خوبصورت تیار ہوا ہے اسپر
پختہ سونے کا ملمع کیا ہوا ہے اور
نیچے کے رخ نہایت عمدہ
آویزے جھوم رہے ہین

طلائی ملمع شدہ خوشنما جڑاو آرسی

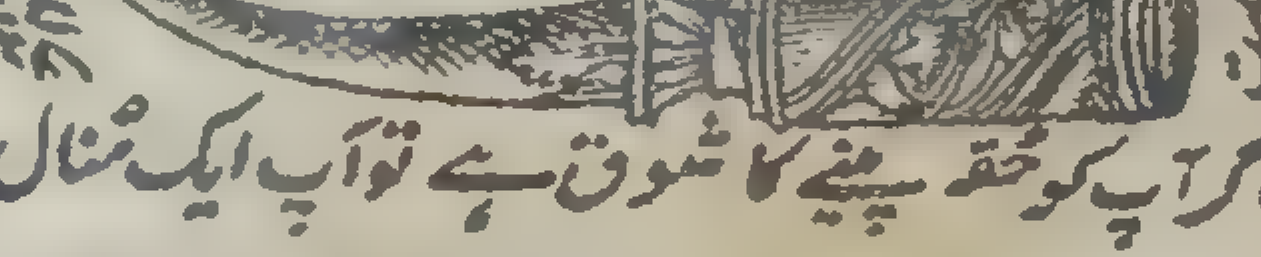


قیمت یہ آرسی جس کا نقش آپکے
پیش نظر ہے۔ ہم سے
منگائیے میرا خیال ہے
اگر کسی حسین کو یہ آرسی دیکر
پھر آپ مانگین گے۔ تو بجائے
آرسی کے انگوٹھا ملے گا۔ ضرور منگائیے

خالص چاندی کی قابل قدر عمدہ

خالص چاندی قابل دید عمدہ منال

خالص چاندی کی شرط
قیمت دو روپیہ بارہ آنہ



اگر آپ کو حقہ پینے کا شوق ہے تو آپ ایک منال
ہمارے کارخانہ سے منگائین۔ اسپر نقش و نگار
قابل تعریف ہین اصلی خوبی دیکھنے پر ظاہر ہوگی
قیمت دو روپیہ بارہ آنہ ۱۲/۲

اس پتہ سے طلب فرمائیے شیخ رحیم الدین زیور فروش شہر دہلی اندرون حویلی کابلی بیگم متصل چاوڑی بازار

بولتی ہوئی تصویریں

ہم نے انتظام کیا ہی کہ اپنے سلسلۂ تصاویر کے لئے جو جنوری ۱۹۰۲ء سے شروع ہی ہاف ٹون تصویریں ولایت سے بنوا کر منگوائیں چنانچہ اس مہینے کے پرچے میں جو تصویریں درج ہیں وُہ انگلستان سے چھپ کر آئی ہیں۔ یہاں ابھی اس کام کی ابتدا ہی اور انگلستان میں درجۂ کمال کو پہنچ گیا ہی۔ وہاں جو تصویریں چھپتی ہیں انہیں ایک ایسا قدرتی رنگ ہوتا ہے کہ گویا مُنہہ سے بولتی ہیں۔ اگر کوئی صاحب اپنی کسی کتاب یا رسالے کے لئے یا ویسے شوقیہ ایسی تصاویر کھنچوانا چاہیں تو ہم سے خط و کتابت کر کے نرخ دریافت کریں۔ ہمارا دعویٰ ہی کہ ہم انہیں کلکتہ بمبئی مدراس کے کارخانوں سے عمدہ کام تیار کرا دینگے۔ اور نسبتاً ارزاں بھی۔ ان کارخانوں سے تانبے کی پلیٹ کی تیاری چھپوائی اور کاغذ کی قیمت کی مفصل نرخ منگوا کر مقابلہ کر لیجئے اگر مقابلہ میں ہمارے نرخ نیچے نظر آئیں تو ہماری معرفت کام بنوائیے۔ نرخ دریافت کرنے کے لئے دفتر مخزن لاہور سے خط و کتابت کیجائے۔

جست کے پلیٹ کی نسبت تانبے کی پلیٹ پر تصاویر نہایت صاف اور خوبصورت چھپتی ہیں۔

مینجر مخزن

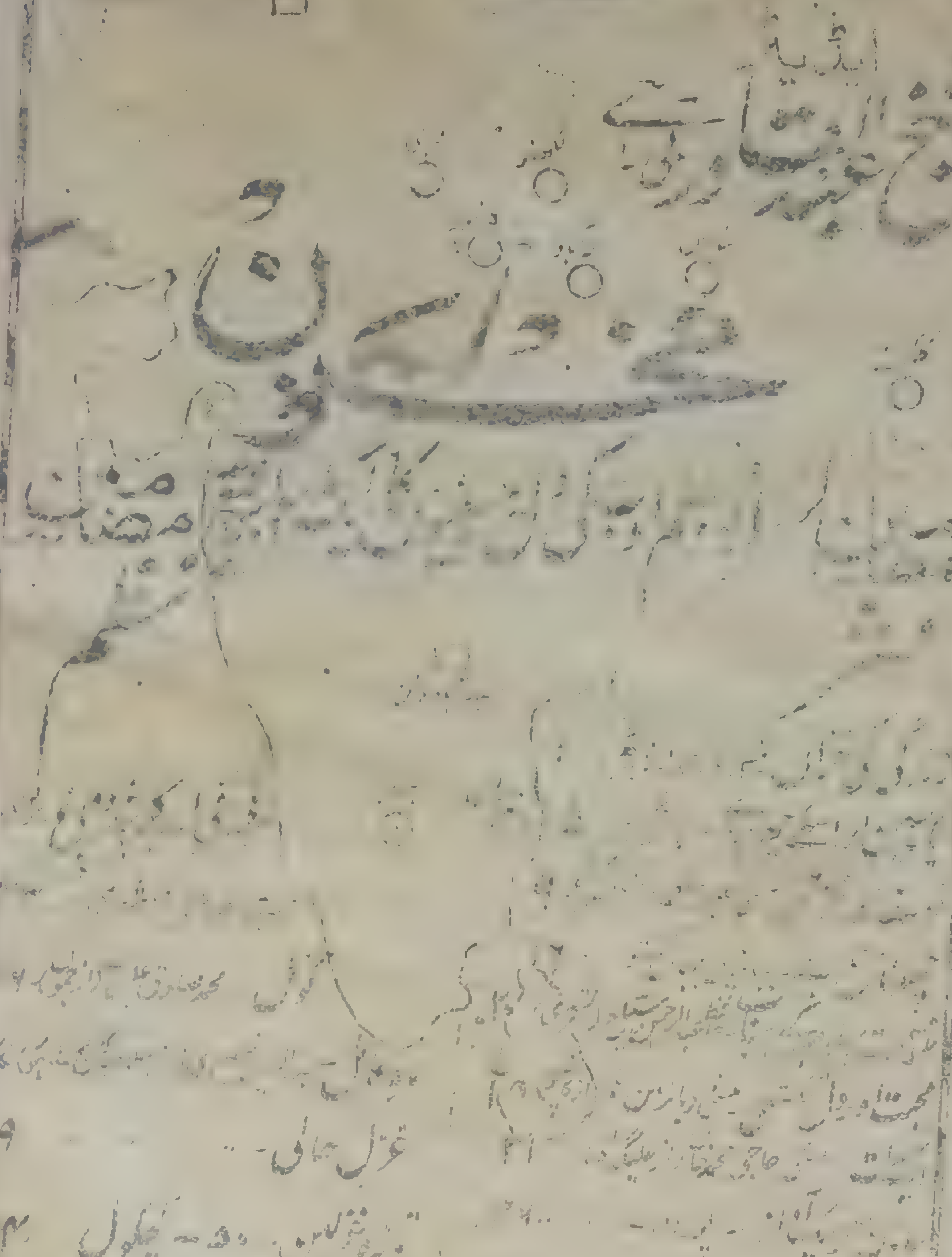
ضروری اِطّلاع

مخزن کے قلمی معاونین کیخدمت میں التماس ہی کہ جب مضمون بھیجیں تو اپنا نام اور پتہ صحیح اور مفصل تحریر فرمایا کریں۔ اکثر دفعہ انکے مضامین کی رسید بھیجنے میں دقت ہوتی ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ ہم انکی اجازت کے بغیر انکے نام کو شائع کریں۔ نام چھپیگا وُہی جو وُہ پسند فرمائیں۔ لیکن یہ ضروری ہی کہ دفتر میں انکا پتہ و نشان موجود ہو۔

اسسٹنٹ ایڈیٹر

نمبر ۵

انجمن ترقی اردو



مضامین

غزل ... ۲۹

۵۴

[illegible]

اردو ... ہندوستانی اردو بولتے ہیں ... اور ہندوستانی اردو سمجھتے ہیں

ان شہروں میں اردو مروج ہے ... ان شہروں میں اردو سمجھی جاتی ہے

[illegible]

مخزن

لاہور سے ہر انگریزی مہینے میں ایک بار شائع ہوتا ہے۔ ملک کے مستند اور مشہور نامہ نگاروں کے علاوہ ایک معقول تعداد نئے اور ہونہار اہل قلم کی اس کی اعانت میں مصروف ہے۔ یونیورسٹیوں کی ڈگریاں پائے ہوئے اصحاب جن کو آجتک ملکی علم ادب سے غافل سمجھا جاتا تھا۔ شوق سے اس کے بنانے میں شریک ہو رہے ہیں۔ اور کوئی رسالہ ایسا نہیں ہوتا۔ جس میں کم از کم دو چار مضمون ڈگری یافتہ اصحاب کی طرف سے نہ ہوں۔ مضامین عام دلچسپی کے ہوتے ہیں۔ اور کوشش کی جاتی ہے کہ ہر قسم کے مذاق کے لئے کچھ نہ کچھ ہر پرچہ میں موجود ہو۔ رسالہ کا حجم ۱۸×۲۲ کی تقطیع پر (مع سرورق) ساٹھ صفحہ کا ہے۔ **قیمت** عمدہ دبیز کاغذ پر بلا محصول تین روپے اور دوم درجہ کے کاغذ پر دو روپیہ۔ اس حجم کا کوئی اور اردو رسالہ ایسی لکھائی اور چھپائی کے ساتھ ان قیمتوں پر نہیں دیا جاتا۔ محصول ڈاک دونوں صورتوں میں چھ آنہ سالانہ ہے۔ درخواست خریداری کے ساتھ پیشگی قیمت یا ویلیو پی ایبل کی اجازت آنی چاہئے۔ مابعد کا کوئی حساب نہیں۔ پرچہ نمونہ کے لئے ۴ آنہ کے ٹکٹ آئیں

شیخ عبد القادر مالک و ایڈیٹر

یادگار دربار

جس عظمت و شان کے ساتھ گورنمنٹ نے یہ دربار کیا تھا۔ اسی اہتمام بلیغ کے ساتھ مولوی **فیروز الدین صاحب** مؤلف یادگار سعدی و یادگار وکٹوریہ نے یہ نادر اور لاجواب تاریخ بنائی ہے جس میں نہ صرف دربار دہلی کا ہی مفصل حال درج ہے بلکہ ملک معظم کی مکمل سوانح عمری اور دربار انگلستان کا بھی کامل حال قلمبند ہوا ہے۔ اسکے علاوہ شرکائے دربار دہلی میں سے مشہور حکام انگریزی اور تمام والیان ریاست اور بعض امرائے ہند کے ضروری حالات بھی نہایت خوبی سے دیئے گئے ہیں۔ کتاب کا حجم سات سو صفحہ کا ہے اور تصاویر و نقشہ جات کی تعداد قریباً ایک سو ہے۔ تصاویر دستی نہیں بنوائی گئیں بلکہ اعلیٰ قسم **ہاف ٹون عکسی** تیار ہوئی ہیں۔ غرضکہ اس کی شانداری میں ہزارہا روپیہ صرف کر کے امرا و رؤسائے حکام ہند کے مطالعہ کے قابل بنا دیا گیا ہے۔ واقعات بھی نہایت تحقیق اور احتیاط سے قلمبند ہوئے ہیں اور حتی المقدور کوئی ضروری مضمون چھوڑا نہیں گیا۔ یہ کہنا بغیر مطالعہ کتاب کے شاید مبالغہ سمجھا جائے کہ کتاب ہذا ملک اور گورنمنٹ دونوں کے لئے ایک اعلیٰ کامیابی ہے۔ قیمت قسم اول جسکا کاغذ اور جلد بھی عمدہ ہے فی مجلد **دس روپے**۔ اور قسم دوم جسکا کاغذ اور جلد بھی ہے فی مجلد چھ روپے۔ مشتری پیشگی بھیجنے والوں سے محصول بھی نہ لیا جائیگا۔ کتاب بالکل تیار ہے۔ شائقین **مینیجر صاحب ہند بک ایجنسی لاہور** سے منگا سکتے ہیں۔ صرف فہرست مضامین ہی چوبیس صفحوں پر آئی ہے۔

مخزن

زِندگی کی خزاں

ظاہر کی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی
ہو دیکھنا تو دیدۂ دِل وا کرے کوئی

اِس میں شک نہیں کہ اگر زندگی کو موت کا اور بہار کو خزاں کا جانفرسا اندیشہ نہ ہوتا تو زندگی و بہار اپنی خوبی و دلفریبی میں نہایت ہی بے نظیر چیزیں تھیں۔ مگر خزان و موت کا خیال آتے ہی ہماری تمام بہارِ زندگی بے لُطف ہو جاتی ہے۔ اِسی طرح ہماری فضولخرچی اور بیجا رسوم پرستی کا نتیجہ ہماری مفلسی و بربادی نہو تو بے شک ہماری بہارِ زندگی بہارِ بیخزاں ہو جاوے۔ کون نہیں چاہتا کہ اِنسان کی زندگی کی بہار اور رنگینی میں کوئی مزاحمت کرنے والا نہ ہو مگر سیم وزر کی کمی خود بخود اپنی مہیب صورت دکھلا کر ہمارے عیش وعشرت میں مخل ہو جاتی ہے اور پھر سارا مزہ کِرکِرا ہو جاتا ہے۔ اگر قانونِ قدرت آدمی کو کبھی نہ ختم ہونے والے جواہرات کے دفینوں سے خبردار کر دیتا تو نہایت ہی شرم کی بات ہوتی اگر ہم ہر چوبیس گھنٹے میں چوبیس رسمیں کر کر کے نت نئی نیرنگی کے ساتھ اپنی دولت صرف نہ کیا کرتے۔ مگر افسوس ہے کہ اس قانون میں ایسا کوئی قاعدہ نہیں رکھا گیا جس کے ذریعہ سے وُہ خاص چیز جو بہار کو ترقی دینے کے سامان مہیا کرتی ہے - آپ ہی بلا طلب ہمارے ہاتھ میں آجاوے اور ہم اس کو بے دریغ افزایشِ لُطفِ زندگی میں صرف کرتے رہیں

اور دِل خوش کُن سُروں میں بہارِ رنگینی کا نغمہ سُنتے رہیں۔ مشاہدات بتلا سکتے ہیں کہ بلا انجام بینی بہت سے آدمیوں نے جن کو بارگاہ ایزدی سے اشرف المخلوقات کا معزز لقب عطا ہوا ہے وُہ سراپا بہار جس کی تعریف ستار عیوب و قاضی الحاجات کے شاندار الفاظ میں کی گئی ہے۔ ہمہ تن رنگینی۔ پوئیٹری۔ گھر کو رشکِ جنت بنانے۔ سامانِ راحت بہم پہنچانے اور عیش سے زندگی بسر کرنے میں تباہ و برباد کر دی اور جب وُہ بار ود ختم ہو گئی جس سے یہ ساری آتشبازی چھُٹ رہی تھی تو پھر زندگی وبالِ جان ہو گئی اور تجربہ نے ثابت کر دیا کہ وُہ کُل کائنات جس کو عشق کی بدولت بتایا جاتا تھا در اصل زر کی بدولت تھی اور جب وُہ سرچشمہ نہیں رہا تو ساری کایا پلٹ ہو گئی۔ اب کوئی بھی۔ خواہ کیسا ہی محبت والا۔ نرم دِل۔ بُردبار اور لطیف طبیعت ہو کچھ بھی کام نہیں آتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کی ساری طراوت بخش چاشنی ختم ہو گئی۔ نہ صحنِ چمن کی فضا۔ پھُولوں کا خوش رنگ ہونا اور ان کی بھینی بھینی خوشبو اچھی معلوم ہوتی ہے اور نہ کوئی حُسن مجسم یا کسی کا ناز و انداز دِل کو بھاتا ہے۔ ایسی حالت میں حسرت و ملال ہی اُن کا غمگسار ہے اور تمنائے موت مددگار ؎

جدھر دیکھو اُدھر ویرانہ ہی ویرانہ پاتے ہیں
عجب ہو حق کا عالم ہے جہاں اوسان جاتے ہیں

یہی وُہ خزاں ہے جو چندروزہ بہار اور رنگین زندگی کے بعد آدمی کے لئے وبالِ جان اور سوہانِ رُوح بن جاتی ہے۔ اب نہ اپنا آیا اچھا معلوم ہوتا ہے۔ نہ دوست احباب کی صحبت لُطف دیتی ہے اور وُہی دِن جس کا آنا جانا معلوم بھی نہیں ہوتا تھا پہاڑ ہو گیا ہے اور کاٹے نہیں کٹتا۔ ہر وقت انتظار ہے کہ کب رات ہو اور قرضخواہوں سے آنکھ بچا کر بازار میں کچھ ضروری کام کاج کر آویں کہ اندھیرے میں کوئی پھٹے پُرانے کپڑے بھی نہ دیکھ سکے۔ عورتوں کو عمدہ لباس اور زیور پہنانے اور شادی

غمی وغیرہ کی زندگی بخش رسموں سے بہار زندگی قائم رکھنے کا تو ذکر بھی کیا۔ یہ انجام اُس شخص کے لئے کیسا دردناک ہے جس کی عمر اب تک کیفیت اور رنگینی میں گذری ہو۔ ایک وُہ وقت تھا جب فکر و ملال کا نام تک نہ تھا اور ہر طرف چین ہی چین نظر آتا تھا بخلاف اُس کے اب دُنیا دار المحن معلوم ہوتی ہے۔

کیا یہ قابلِ تاسف نہیں ہے کہ جس نے لڑکے کے عقیقے جیسی چھوٹی چھوٹی تقریبوں پر زندگی کو استحکام بخشنے اور ترقی دینے کے لئے خُوب ہی دادِ سخاوت دی ہو۔ جس کے یہاں اربابِ نشاط کے جلسوں سے تمام شہر کو لُطفِ زندگی حاصل ہو گیا ہو اور جس نے دھوم دھام کرنے اور بچے کو ناز و نعمت سے پالنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا ہو۔ وُہ اب اپنے اسی لختِ جگر کا احکامِ شرعی کے موافق بھی کسی شریف خاندان میں عقد نہ کر سکے اور جس کو قرضداری دِن رات میں ایک منٹ بھی چین نہ لینے دے۔ ع یہی ہیں جو چراغِ خانہ تھے اور شمعِ محفل تھے + اُس زندگی کی بہار میں تو کبھی بھُول کر یہ خیال نہیں آیا کہ "چڑھ کر اُتار بھی تو بُرا ہے سُرور کا"۔ اور اب جو حالت متغیر ہوگئی تو در و دیوار سے یہ صدا چلی آتی ہے ؎

خود نمائی نے تمہیں غیر کے ہاتھوں میں دیا
کیا ہوا تم کو تم اپنے بھی نگہباں نہ رہے

عُمدہ لباس۔ قیمتی زیور اور شادی وغیرہ کی فرحت بخش رسمیں ایسی ہیں جن کی ہر شخص کو خواہش ہوتی ہے۔ مگر اُن میں فضول خرچی اور غیر ضروری رسموں کی پابندی یقینی وُہ چیزیں ہیں جو جلد ہم کو زندہ درگور کر دیتی ہیں ع ہستی سے دم کے دم میں پہنچے عدم میں ہم + اور جہاں رسمیں بھی حدود شمار سے زیادہ ہوں تو بے اختیار یہی زبان سے نکلتا ہے ؎

جگہ کس کس کو دُوں دل میں ترے ہاتھوں سے اے قاتل

کٹاری کو چھری کو بانک کو خنجر کو پیکاں کو

جیسے اِن میں سے ایک ہتھیار قتل کر دینے کو ویسے ہی ایک تقریب آدمی کو فقیر کر دینے کے لئے کافی ہے اور پھر وُہ دراصل غمی ہو جاتی ہے - اب قلیل آمدنی یا جائداد کا مالک قرضخواہ ہے اور گھر میں فاقہ کشی پر زندگی کا مدار ہے - وُہ وقت کہاں کہ کسی کے حُسن سیرت وصُورت کو دوبالا کر دینے کے لئے زرم رنگین لباس - پھُول - عطر - زر و جواہرات سب اُس کے پاس اکٹھے کر دیئے جاویں - بلکہ اب تو وُہی حُسن فقر و فاقہ کے ہتھیاروں سے مسلح ہو کر حیاتِ انسانی کے رو کھے پن - شدّت - کرختگی - نامعقولیّت اور رنج و ملال کو ہر وقت ترقی دینے کے لئے تیار ہے - آخرش یہ خزاں ہے جو زندگی کی بہار کے بعد انسان کو پریشان و خستہ حال کر دیتی ہے -

چُونکہ یہ گوارا نہیں ہے کہ اُمرا و رؤسا اِس خزاں میں بے خانماں ہو کر سائیسول اور گراس کٹوں کی وردیاں پہنیں - اِسی لئے مصلحانِ قوم چاہتے ہیں کہ اُن کو اُن تباہ کُن اخراجات سے باز رکھیں جو انجام کار اِن سے بھی بد تر وردیاں پہننے پر انسان کو مجبور کرتے ہیں - جیسے پُرانی رسمیں اور اُن کے بیجا اخراجات ناپسندیدہ ہیں ویسے ہی نئے فیشن کے بھی غیر ضروری مصارف گراں اور قابلِ انسداد خیال کئے جاتے ہیں اور یہ سراسر انصاف کا خون ہے کہ پُرانی لغویات چھڑا کر نئی لغویات کا رواج منظور ہے -

یہ وُہ قابلِ قدر مقاصد ہیں جو عصر جدید اور اس کے فاضل ایڈیٹر کے ہر وقت پیشِ نظر ہیں اور جو مآل اندیش لوگ یہ چاہتے ہیں کہ انسان کی زندگی میں تلخ کامی و ناشادی کے اجزا جہاں تک ہو سکے نہ آنے دیں وُہ انکی باتوں کو ضرور گوش ہوش سے شنیدنگی اور یقین ہے کہ اُن پر عمل کرینگے اور کراوینگے ~

تقلید چھوڑ عقل کے میداں میں رکھ قدم -
نزدیک ہے یہ راہ وُہ رستہ ہے دُور کا +

نیاز احمد (از میرٹھ)

ایک سین اور اُس کے چھ پردے

دیدنی ہے شکستگی دِل کی
کیا عمارت غموں نے ڈھائی ہے

۱۔ دریا کا کنارہ۔ برسات کا موسم۔ شام کا وقت۔ اور پانی برس گیا ہے۔ دریا اپنے زوروں پر بہ رہا ہے۔ موج پر موج۔ لہر پر لہر آتی ہے۔ اور اپنے ساتھ خدا جانے کہاں کہاں کے خس و خاشاک بہائے لئے چلی جاتی ہے۔ خُشک لکڑی کا ٹکڑا۔ کسی درخت کی تازہ ٹوٹی ہوئی شاخ۔ اور کچھ نہیں تو خالی پانی ہی ہے۔ مگر ایک عجیب سُرعت اور سنجیدگی سے ہر ایک شَے بہتی چلی جاتی ہے۔ دریا کی روانی سوچنے والوں کے دِل میں دُنیائے فانی کی طرف سے بدگمانیاں پیدا کر رہی ہے۔ بے ثباتی کا تصوّر اُس وقت کے مشاہدۂ عینی سے امداد پاکر ایسی روشن تصویر دیدۂ دِل کے سامنے پیش کرتا ہے کہ پھر اور کسی عینک کی حاجت نہیں رہتی۔

۲۔ ناؤ کا پُل بندھا ہے۔ لوگ اُس پر سے گذرتے ہیں۔ اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر آتے جاتے ہیں۔ کوئی رواں رواں جلدی جاتا ہے۔ کوئی رُک رُک کر سیر دیکھتا ہوا چلتا ہے۔ کوئی کہیں۔ اپنے ہم مذاق دوستوں کے مجمع میں کسی کشتی کے ایک کونہ پر بیٹھا تماشا دیکھتا ہے۔ دِل خوش کیا۔ اور سب اُٹھکر چل دیئے۔ غرضکہ چلنا ہر حال میں مقدم ہے۔ اُس سے خالی کوئی بات نہیں۔

۳۔ دریا کے اُس پار عین کنارے پر ایک پُرانی بارہ دری ہے۔ اُسکی یہ حالت ہے کہ چھت ندارد۔ کبھی کی پڑی ہوئی بیچاری ایسی گری کہ پھر کسی نے بنوانے کا نام نہ لیا۔ دریا کے قریب کے حصّہ کی دیواریں بھی پانی کے لگاتار اثر سے نرم ہو کر دریا میں گر پڑیں

پانی بالکل ملا ہوا گذرتا ہے اور مکان کے باقی حصّوں کے رہنے کی بھی کوئی اُمّید چنداں نظر نہیں آتی۔ جو ننگے ستون اور دیواریں اب تک کھڑی ہیں۔ گویا زبانِ حال سے پکار رہی ہیں۔ کہ ع ہم کو دیکھو ہمارا حال سنو ٭ اور دُنیا اور اس کی بیوفائیوں کا سبق خوب ذہن نشین کرلو۔ مگر ایسے اہلِ دل کہاں سے آئیں۔ جو دریا کے شور وغل میں اُن بیچاری دیواروں کی خاموش آوازوں کی طرف کان دھریں!

ع صَدَا طُوطی کی سُنتا کون ہے نقّار خانے میں۔

۴۔ اُس پار دریا سے تھوڑے فاصلہ پر تین پُرانے مقبرے نظر آتے ہیں۔ ایک تو کسی بادشاہِ جمجاہ کا۔ وُہ تو خیر بہت کچھ اپنی شان کو قائم رکھے ہوئے ہے اگرچہ تا کے۔ دُوسرا اُس سے کچھ دور اُسی بادشاہ کے کسی امیر کبیر کا۔ مگر اُس کے گُنبد کی عجب حالت ہورہی ہے۔ اُس کے نیچے کی استرکاری اینٹوں سے علیحدہ ہوکر گرا ہی چاہتی ہے۔ واہ رے معمارو! تم نے تو مصالحہ کے بنانے اور اس کے لگانے میں کوئی کسر اپنی طرف سے نہیں چھوڑی۔ مگر اِس کو کوئی کیا کرے کہ قانونِ قدرت ہی ہمیشہ ہر چیز کی حالت میں ایک تبدیلی چاہتا ہے۔ چونہ کی تہ اپنے آپ میں تو ابھی تک ایسی پیوست ہے کہ پھٹنے کا نام نہیں لیتی۔ مگر کمبخت اینٹوں کو کوئی کہانتک کوسے۔ جنہوں نے اپنے سے علیحدہ کر کے اُس بیچارے کو اُسی کے حال پر چھوڑ دیا ہے۔

ع تیری بلا سے کوئی مرے یا کوئی جئے ٭ تیسرا مقبرہ نیچی چھت والا۔ ذرہ اَور فاصلہ پر اُسی بادشاہ کی سب سے پیاری بیگم کا ہے۔ اِس مکان کی ناگفتہ بہ حالت کا کیا کہنا! دیکھو تو اُس کی مکین خود اپنی نہ بولنے والی زبان سے کیسی پیشین گوئی کر گئی ہے۔

بر مزارِ ما غریباں نے چراغے نے گُلے
نے پرِ پروانہ سوزد نے صدائے بُلبلے

دن کو قریب کے گانوں کے چرواہے اپنے اپنے جانور چرانے لے آتے ہیں۔ مکان

میں گو ہر سب طرف جا بجا پڑا ہے۔ کہیں گائیں بھینسیں بیٹھی ہیں۔ کہیں بچھڑے کھڑے ہیں۔ کہیں بکریوں کے پاس انکے بچے کلیل کر رہے ہیں۔ آس پاس لڑکے بے تکلفی سے مختلف کھیل کھیلتے ہیں۔ اور اپنی نادانی میں انکو یہ بھی معلوم نہیں کہ ہم کس کی خاک کو پامال کر رہے ہیں! آہ! وُہ جس نے اپنے زمانہ میں اپنے علم اور عقل۔ خوبی اور سخاوت کے نُور سے ایک جہان کو منوّر کر رکھا تھا۔ آج اُسی کے قول کے موافق اس کی قبر پہ دیا تک بھی نہیں ہے۔ پھُولوں کا تو کیا مذکور!

۵۔ ناؤ کے پُل سے اُوپر کی طرف لوہے کا پُل ہے۔ ریل گاڑی اُس پر سے آتی اور گذر جاتی ہے۔ اگرچہ ظاہرا وُہ اس منظر کے اثر سے متاثر ہوتی بالکل معلوم نہیں ہوتی۔ مگر ایک روانی ہے کہ جس سے وُہ خود بھی خالی نہیں۔ دُنیا کی کسی بات کو قرار نہیں۔ قیام نہیں۔ واقعی ع سخت بے اعتبار ہے دُنیا!

۶۔ دریا کے اِس پار ایک لکڑی کا لٹھا کسی پہاڑی مقام سے بہکر آیا پڑا ہے۔ اس پر ایک اجنبی شخص اپنی بے خودی کے عالم میں غرق۔ خاموش بیٹھا ہے۔ اُسکا پیارا اور پیار کرنے والا باپ۔ ابھی تھوڑے دن ہُوئے اُس کے سر سے اُٹھ گیا ہے۔ اسکو بالکل مضمحل اور دِل شکستہ چھوڑ گیا ہے۔ وُہ ہر چند اس صدمہ کو اپنے دِل سے دُور کرنا چاہتا ہے۔ اور اس کی کوشش بھی کرتا ہے۔ اور شائد کیا عجب ہے کہ وُہ اسی خیال سے اپنا جی بہلانے کو دریا کے کنارے بھی آ بیٹھا ہے۔ مگر کہاں! جو دِل خدا نے ایسے بنائے ہیں۔ کہ ہمیشہ غم کی چاشنی سے لذّت گیر رہتے ہیں۔ وُہ کہیں ایسے صدموں کو آسانی سے بھُول سکتے ہیں! اُس نے دریا۔ پُل۔ بارہ دری اور مقبروں کی طرف یکے بعد دیگرے نگاہ ضرور ڈالی۔ اور سب میں ایک روانی۔ تغیّر اور شکستگی کی کیفیت بھی پائی۔ مگر رہ رہ کر اُسکا خیال اس کو اپنی ہی جانب متوجّہ کرتا تھا اور بار بار بے ساختہ اس کی زبان سے نکل جاتا تھا۔

دیدنی ہے شکستگی دل کی
کیا عمارت غموں نے ڈھائی ہے

(جہانگیر)

میٹھی نیند

ملکہ ہوں میں رات کی اور ۔ آرام پری کہلاتی ہوں
کوئی نہ دے الزام ہیں اپنے حسن پہ آپ اتراتی ہوں

فطرت ہی مخدومہ میری ۔ محنت میری سہیلی ہے
قدر کرے جو کوئی نہ انکی خوب اُسے ترساتی ہوں

ہاں ۔ جو کوئی اُن سی پیار رکھی بس وہی میرا پیارا ہے
پوچھو ۔ اُس سی کیا ہوں کرتی ۔ آؤ تمہیں بتلاتی ہوں

ٹھم ٹھم کرتی مٹکتی لچکتی ناز دکھاتی آتی ہوں
ایک نگاہِ لطف سی سارا جی کا رنج مٹاتی ہوں

میٹھے میٹھے بول سُنا کر جی کو شگفتہ کرتی ہوں
ریجھ ہی جائے سُننے والا ایسا گانا گاتی ہوں

ناز و ادا یہ دیکھ کے کوئی لوٹ نہ جائے ممکن ہی
رحم بہت ہی مجھ میں ظالم ۔ میں بھی لپٹ ہی جاتی ہوں

چومتی ہوں کچھ دیر تو ۔ پھر آغوش میں لیکے دباتی ہوں
ساغرِ لذت دیتی ہوں بھر بھر سُدہ بُدہ ساری بھلاتی ہوں

بے سُدہ کرکے بیخود کرکے رنگ نیا دکھلاتی ہوں
ہاتھوں پیاری پیارے ہاتھوں سے اپنے ذہن کا پردہ ہٹاتی ہوں

خادم میرا اک ہی تصور اسکو یہ پھر فرماتی ہوں
سیر کرا و خوب اِسے ۔ اغوش میں میں گرماتی ہوں

کون ہی جو ہو سامنے میرے میں کیا کہیں شرماتی ہوں
خوبیاں میری دیکھی بھالی ۔ کس سے میں آنکھ ملاتی ہوں

(سیّد نذیر حسین بی ۔ اے (انبالہ)

یہ تو غلط کہ حُسن پہ مائل نہیں ہوں میں
ہاں حُسن ظاہری کا ہی گھائل نہیں ہوں میں

ہوں کاہ بھی تو کوہ کی رفعت مجھی میں ہے
کیوں اس کی کشتِ صنع کا حاصل نہیں ہوں میں

جب تک خرد پہ خوب پرکھ لوں نہ بات کو
لوگوں کے کچھ بتانے کا قائل نہیں ہوں میں

اے رند مجھ کو لہو و لعب کا کہاں دماغ
ہاں بیشمار فرض ہیں کاہل نہیں ہوں میں

(ر ر ر)

فلسفہ اور خوشی

(ترجمہ از گولڈ سمتھ)

قریب قریب یہ ناممکن ہے کہ ہم حصولِ مسرت کا کوئی فلسفیانہ اصول ایسا بتا سکیں جو زندگی کی ہر حالت کے مناسب ہو۔ ہر شخص جو خوشی کی طلب میں نکلتا ہے ایک جُداہی راستہ اختیار کرتا ہے۔ مختلف رنگ ہیں جو بعض چہروں پر پھبتے ہیں اور انکے لئے باعثِ رونق وسببِ زینت ہوتے ہیں۔ اور مختلف قسم کی خوشیاں ہیں جو مختلف دلوں کو بھاتی ہیں۔ مختلف فرقے ہیں حصول مسرت کی راہ دکھانے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ لیکن وُہ ہمارے مذاق کا لحاظ کئے بغیر روحانی یا جسمانی لذتوں کو صرف اپنے مذاق کے موافق پسند کر کے ہمارے سامنے بھی وُہ ہی پیش کرتے ہیں۔ اِن فرقوں کے پیرو ایک تنگ دائرہ میں محدود ہو جاتے ہیں اور ان کی اصلی خوشی میں کسی قسم کا کوئی اضافہ نہیں ہو سکتا۔

اگر مجھے ناچنے سے خوشی حاصل ہوتی ہے تو یہ کس قدر مضحکہ انگیز ہے کہ میں ایک لنگڑے کے لئے بھی یہی تجویز کروں۔ اور اگر اُس کو نقاشی سے خوشی حاصل ہوتی ہے تو یہ کس قدر فضول ہے کہ وُہ ایک اندھے کے واسطے بھی جو مختلف رنگوں میں تفریق اور تمیز نہیں کر سکتا یہی طریقہ پسند کرے۔ پس کسی عام ہدایت سے اس جگہ کام نہیں چلتا۔ اور ایک خاص خوشی کی نسبت کچھ کہنا بھی فضول ہے۔ کیونکہ ہر شخص اپنے مذاق کے موافق اپنی خوشی کو ایک جُدا اور خاص چیز پر منحصر پاتا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ ہر دل میں خوشی کی مقدار سے حظ اُٹھانے کی قابلیت ہوتی ہے اور اُسکا ایزاد کرنا ہمارے امکان میں نہیں۔ نہ اُس پر بیرونی واقعات کا چنداں

اثر ہوتا ہے۔ اور اگر کوئی شخص اپنی موجودہ حالت کا اپنی گذشتہ حالت سے مقابلہ کرے تو وُہ بہت کچھ اندازہ اور موازنہ کے بعد غالباً یہی نتیجہ نکالیگا۔ کہ پہلے سے نہ مَیں اچھی حالت میں ہُوں نہ بُری میں۔

ایسا ہوتا ہے کہ ہماری کسی بڑی خواہش کا پُورا ہو جانا یا کسی لاعلاج مصیبت میں ہمارا یکایک مبتلا ہو جانا ہماری عارضی خوشی یا فوری صدمے کا موجب ہو۔ یہ فوری اثرات اپنے زور اور قوت کی نسبت سے رفتہ رفتہ زائل ہوتے رہتے ہیں۔ یا ہمارا دل اُن سے موافقت پَیدا کر لیتا ہے۔ اوّل اوّل روح اگرچہ ایسے ناگہانی واقعات کو محسوس کرتی ہے لیکن رفتہ رفتہ ایسے بیرونی حوادث سے متاثر نہیں ہوتی۔ اور اطمینان کی تہ میں پہنچکر سکون اختیار کرتی ہے۔ اگر خلاف اُمید کوئی تقدیری انقلاب ایسا واقعہ ہو۔ مثلاً کسی کو زندان سے نکال کر تخت شاہی پر بٹھادیں۔ تو وُہ طبعاً اس تبدل پر خوشی سے پھُولا نہ سمائیگا۔ لیکن طبیعت بھی چہرہ کی طرح اپنے اصلی رنگ پر جلدی ہی عَود کر آئیگی۔

ہر ایک خواہش جو ہمیں خوشی یا راحت کی اُمید دلاتی ہے۔ جو ہمارے خیال کے مطابق ہمیں موجُودہ حالت میں میسّر نہیں ہے۔ اور کسی دُوسری صُورت میں حاصل ہوگی۔ حقیقت میں وُہ ہمارے دِل میں ایک بیقراری پیدا کرنیکا باعث ہوتی ہے اور ہر ایک اصُول جو ہمیں ایک ایسی نئی چیز کا علم دیتا ہے جس کے حصُول سے ہماری حالت بہتر ہو جائیگی اور ہم ایک زینہ اَور بلند ہو جائینگے۔ دراصل اضطراب کی بنیاد ہمارے دِل میں ڈالتا ہے وگویا ہم وُہ قرضہ لیتے ہیں جس کی ادائیگی سے ہم قاصر ہیں۔ اس وقت ہمارے کانوں میں ایک صدا آتی ہے کہ کوئی شے خواہ ہم اس پر قابض بھی ہوں ہماری خوشی میں اضافہ نہیں کر سکتی۔

بجائے اس کے کہ ہم گذشتہ زمانہ پر افسوس کریں اور آیندہ زمانہ سے اُمیدیں رکھیں۔ ہمیں موجُودہ زمانہ سے حتی الوسع حظ اُٹھانا چاہیے۔ یہ قول ایک شاعرانہ خیال ہے نہ حکیمانہ تاہم یہ بات دل کو لگتی ہے اور ایک حد تک معقول معلوم ہوتی ہے۔ خوشی کے طالبوں کے

لئے منجملہ اور نصائح کے صرف یہی ایک ایسی بات ہے جو زندگی کی ہر حالت اور ہر منزل سے منطبق ہوتی ہے۔

عشرت پسند۔ دُنیادار۔ اور حکما۔ یہ تینوں قسم کے لوگ اس مسئلہ پر متفق ہیں کہ اگر ہم اس موجودہ وقت میں خوشی حاصل نہ کرسکیں۔ تو پھر کونسا وقت آئیگا؟ یا تو گذشتہ زمانہ پر حسرت کی نگاہ ڈالنا۔ یا آئندہ کامیابیوں کی خیالی دُنیا میں سیر کرنا۔ یہ دو صورتیں اسکے علاوہ اور ہیں۔ لیکن ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ یہ صورتیں کس طرح باعثِ تسکین ہوسکتی ہیں۔

گذشتہ کو یاد کرنا اور آئندہ کی امید باندھنا یہ دو تو خاصیتیں ایسی ہیں جو انسان کو حیوان سے تمیز کراتی ہیں۔ لیکن زیادہ تر ان کی زندگی میں گذشتہ یا آئندہ کے خیالات نہیں پائے جاتے۔ بلکہ زمانۂ حال ہی میں محدود ہوتی ہیں۔ انسان برخلاف اس کے انہی دو ذریعوں سے اپنی خوشیوں سے بہرہ ور ہوسکتا ہے اور مصیبتوں کو نظر انداز کرسکتا ہے۔

کیا یہ تخیل کی پرواز ایسی چیز ہے جس پر ہم فخر کریں۔ اور جس کے سبب ہم نیچر کا شکر کریں۔ یا یہ ایک ایسی مصیبت ہے جس کی ہم عاجزانہ شکایت کریں۔ گو ہماری یہ شکایت اس کے بُرے استعمال اور حوادث کے وقوع پر مبنی ہو۔ یہ درست ہے کہ یہ قوت ہماری حالت کو ایک درجہ تک مصیبت زدہ بناتی ہے۔ اگر ہم میں تذکر کی ایسی قوت ہوتی کہ جس سے ہم انہی واقعات کو یاد کرلیا کرتے جو باعثِ مسرت تھے۔ اور انکو رنجیدہ اور ناگوار واقعات سے علیحدہ کرلیا کرتے۔ تب ایک خیالی خوشی کا لطف اُٹھا سکتے جو شاید اصل سے بھی زیادہ ہوتی۔ لیکن افسوس ایسا نہیں ہوتا۔ ماضی کا خیال کبھی اس طرح نہیں آسکتا۔ جب تک اس میں خوشگوار اور ناگوار دونوں قسم کے واقعات ملے جلے نہ ہوں۔ یہ ناگوار واقعات اُن پسندیدہ اور مسرت انگیز واقعات کی خوبصورتی کو بھی دھبا لگا دیتے ہیں۔ ہم ایک ایسے گذشتہ رنج دہ واقعہ کو یاد کرسکتے ہیں جس میں

خوشی کا کوئی حصّہ نہ ہو۔ لیکن کوئی خوشی ایسی دھیان میں نہیں آسکتی۔ جس میں کوئی نہ کوئی بدمزگی ملی ہُوئی نہ ہو۔ پس ہم بجائے نفع کے اس طریقِ عمل سے بھی نقصان اُٹھاتے ہیں گذشتہ کی نسبت کسی آئندہ واقعہ کی اُمید کرنا اور اُس کا خیال باندھنا زیادہ تکلیف دہ ہے۔ کسی آئندہ مصیبت کے خوف سے نہایت تکلیف اور کسی آئندہ خوشی کی اُمید سے بے چینی پیدا ہوتی ہے۔ اور وُہ بے چینی انتظار ہے اُسوقت کا جب وہ فی الحقیقت ہمارے تصرف میں آجائے۔

اس لئے خواہ ہم کسی طرف دیکھیں۔ منظر ناگوارِ خاطر ہے۔ پیچھے ہم وُہ خوشیاں چھوڑ آئے ہیں۔ جن سے ہم ہمیشہ کے لئے محروم کر دیئے گئے اور اس لئے افسوس کرتے ہیں۔ اور آگے ہم وُہ خوشیاں دیکھتے ہیں جنکے حصُول کی بیتابی سے آرزو کرتے ہیں۔ اور اس وقت بے چین ہیں جب تک وُہ حاصل نہ ہو جائیں۔ اگر کوئی ایسا طریقہ ہوتا جس سے ہم موجُودہ زمانہ کا اس قسم کی بدمزگی کے بغیر بھی جو ایسے خیالات سے پیدا ہوتی ہے لُطف اُٹھا سکتے تو شائد ہماری حالت کسی قدر اچھی ہوتی۔

ہر شخص جو فلسفہ سے عاری ہے بیشک اس کا متمنّی ہے کہ حتی الوسع ایک خوش اور پُر لُطف زندگی بسر کرے۔ ہر طبقہ کے لوگ اور ہر درجہ سمجھ والے اسی کو اپنا مقصُود سمجھتے ہیں۔ اور اگر اس سے علیحدہ ہوں تو گویا خوشی سے محروم ہیں۔ عشرت پسند اپنی خوشی کو حظ نفسانی تک محدود کرتے ہیں۔ دُنیا دار بھی اِن سے کچھ کم متلاشی اس خوشی کا نہیں ہوتا۔ جسکو وُہ اپنی ہر کوشش میں پنہاں رکھتا ہے۔ لیکن ہاں فلسفی جب کبھی کسی مضمون پر دلائل لاتا ہے اور بحث کرتا ہے۔ اسوقت نہ اُسے کسی خوشی کا خیال ہوتا ہے۔ نہ اس کا علم اس کا مقصود ہوتا ہے۔ محض اُن خیالات سے حظ اُٹھاتا ہے۔ جو اس کے دِل میں پیدا ہوتے ہیں کہ وُہ کیا تھا اور کیا ہو جائیگا۔

پس حاصل کلام یہ ٹھہرا کہ کامل خوشی کس صُورت میں ممکن ہے۔ عشرت پسندی یں مشاغل

دُنیا میں۔ یا فلسفہ میں؟ اُن میں سے وُہ کونسی ہے جو وُہ بے چینیاں جنہیں تذکرا و اُمید پیدا کرتی ہے مُطلقاً دِل سے نکال دے۔

خوشی کا جوش صرف چند ساعت تک اثر کرتا ہے۔ اعلیٰ سے اعلیٰ خوشی صرف چند لمحے تک رہ سکتی ہے۔ اور تمام حواس کچھ ایسے مشترک العمل معلوم ہوتے ہیں کہ اگر اُن میں سے ایک کی خواہش پُوری کیجاوے تو سب کے سب گویا جلدی ہی تھک کر سُست ہوجاوینگے۔ صرف شعرا ہی کی نسبت سُنا جاتا ہے۔ کہ جب وُہ ایک خوشی سے سیر ہوجاتے ہیں تو اُس کو دُوسری سے بدل لیتے ہیں۔ فطرت کے یہ بالکل خلاف ہے۔ جب ایک بسیار خور خوب پیٹ بھر کر کھالیتا ہے تو پھر شرب کا اصلی لُطف نہیں اُٹھا سکتا۔ ایک شراب خوار اُن مختلف حظائظ سے بالکل بے بہرہ ہے جن کے حصُول سے عشاق اپنی خوشی پر فخر کرتے ہیں۔ اور جب ایک عاشق کی دلی تمنا پُوری ہوجاتی ہے تو وُہ اور خواہش کو بالکل زائل شدہ پاتا ہے۔ پس اگر ایک ہی حاسہ کو بوجہ اتم محظوظ کیا جائے۔ تو ایک عیش پسند شخص اور حاسوں میں (اور حظائظ اُٹھانے کی) ایک ناقابلیت دیکھتا ہے۔ وُہ گذشتہ اور آیندہ خوشی کے بیچ میں ایک غار دیکھتا ہے۔ اور یہ غار وقت کا ہے۔ جو کسی نہ کسی طرح ضرور بھرا جانا چاہیئے۔ زمانہ موجُودہ سے کسی قسم کی تسکین حاصل نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ اس طالب خوشی نے اس خوشی کی دلفریبی کا ذائقہ (بذریعہ اُمید) پہلے ہی چکھ لیا تھا۔ پس دِل جب اس طرح اپنے آپ کو بیکار پاتا ہے تو فطرتاً گذشتہ یا آیندہ کی طرف اُمید کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور اُس ساعت کا منتظر رہتا ہے کہ کب آئے۔ اس طرح اس کی زندگی کی ہر ساعت (سوائے اس نہایت ہی قلیل وقت کے جو اس خوشی کے حظ اُٹھانے میں صرف ہوا تھا) بیقراری میں کٹتی ہے۔ کسی شخص کو سوا ایک عشرت پسند کے زندگی میں ایسی بدمزگیوں سے سابقہ نہیں پڑتا۔ اُس کے جوشش چندروزہ عارضی ہوتے ہیں۔ اس کی خواہشیں ہمیشہ قرضخواہوں کی طرح ایسے بے سُود

مطالبے کرتی ہیں۔ جنہیں وُہ ادا نہیں کرسکتا۔ جس قدر زیادہ اُس کی سابقہ خوشیاں ہونگی اتنا ہی زیادہ اُسکو افسوس ہوگا۔ اور اتنا ہی زیادہ وُہ اپنی اُمیدوں کے برآنے کے واسطے بے صبر ہوگا۔ پس وہ زندگی جو عشرت پسندی میں بسر کیجاتے۔ نہائت بدمزہ ہے۔

ایک دُنیادار کو اس کی عادت اس کی خواہشوں کے پُورا ہونیکی طرف سے بےپرواہ کردیتی ہے۔ گذشتہ خوشیوں کا نہ اُسے رنج اور نہ آیندہ کی بیقراری۔ جو زندگی وُہ بسر کرتا ہے۔ اگرچہ ایک حدتک اُمید سے وابستہ ہو لیکن افسوس اور حسرت سے کسی قدر دُور ہے۔ عارضی خوشیوں اور دائمی رنج سے امن میں ہے۔ وُہ خوشیاں جن کا اُس نے لُطف اُٹھایا ہے نہ اس قدر غیر معمُولی تھیں اور نہ وُہ جنکی وُہ آس میں ہو۔ اسقدر تفکر اور بے چینی کا موجب ہیں۔

فلسفی اپنے دائرہ کو وسیع کرکے اپنے تعلقات تمام بنی نوع انسان سے رکھتا ہے اور اپنے ذاتی معاملات کی نسبت اس قدر سرگرداں نہیں ہوتا۔ کہ کسی گذشتہ واقعہ کا اثر اُس پر کیا پڑیگا اور آیندہ کا کیا۔ اُس کی خاص توجہ دُوسروں کے معاملات کی طرف ہوتی ہے اور یہی اُس کی خوشی ہے۔ یہ خوشی بذاتہ دیرپا ہوتی ہے جب چاہو اس کو بدل لو۔ اس کو اُن رنج آمیز اوقات سے جو آیندہ کی اُمید اور گذشتہ کی یاد میں صرف ہوتے ہیں کچھ تعلق نہیں ہوتا۔ ایسے ذرائعہ سے فلسفی اپنی زندگی ایک دائمی خوشی میں بسر کرتا ہے اور وُہ فکر و غور جو اَوروں کے لیئے باعثِ تکلیف ہے۔ اُس کے لیئے ایک رفیقِ صحبت اور اُستادِ شفیق کا کام دیتا ہے۔

مختصر یہ کہ اصلی خوشی دائمی ہوتی ہے۔ جو زیادہ نہیں ہوسکتی۔ رنج کسی خود کردہ فعل کا نتیجہ ہوتا ہے اور عموماً ہماری غلطی یا بیوقوفی کا ثمرہ ہوتا ہے۔ فلسفہ ہماری خوشی صرف اسی طرح بڑھاتا ہے کہ ہمارے رنج کی کمی کا باعث ہوتا ہے۔ اس کا کام

ہماری خوشی کے موجودہ ذخیرہ کو زیادہ کرنا نہیں ہے۔ بلکہ یہ ہمیں اُس خوشی سے جو ہمیں حاصل ہے۔ کفایت شعاری سے حظ اُٹھانیکا سبق دیتا ہے۔ مصیبت کا سرچشمہ افسوس ہے یا اُمید۔ پس وُہ شخص نہائت عاقل ہے جو موجودہ کو غنیمت سمجھتا ہے اور گذشتہ یا آئندہ کا خیال بھی نہیں کرتا۔ ایک عشرت پسند شخص کے واسطے یہ ناممکن ہے۔ ایک دُنیاوی آدمی کے لئے یہ مشکل ہے۔ لیکن فلسفی اسے ایک درجہ تک حاصل کرسکتا ہے۔ خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو فلسفی ہی پیدا ہوئے۔ اور جن میں یہ قابلیت بھی ہے کہ اپنے تفکرات کو بنی نوعِ انسان پر تقسیم کرکے اپنے تفکرات سے حظ اُٹھایا کریں ✣

لطیف احمد (از علیگڈھ)

حسرت شروانی۔ جن بزرگوں نے میرے زمانۂ قیامِ انگلستان میں **مخزن** کے حال پر پہلے سے بھی زیادہ توجہ رکھنے کے وعدے فرماکر میری حوصلہ افزائی کی ہے اور گویا مخزن کے مستقل قیام کو متیقن بنادیا ہے۔ اُن کی قابلِ فخر فہرست میں ہمارے مخلص کرمفرما جناب مولوی حبیب الرحمٰن خاں صاحب حسرت شروانی ہیں۔ جن کی تصویر آج زینتِ ورقِ اوّل ہے۔ مولوی صاحب ضلع علیگڈھ کے مشہور رؤسا میں سے ہیں اور خوانینِ بھیکم پور میں کیا بحیثیتِ وجاہتِ دُنیوی اور کیا باعتبارِ علم و ہنر امتیازِ خاص رکھتے ہیں۔ شانِ امارت کے ساتھ اس درجہ علم دوست اور قدردان اہلِ علم ہونا اور نشۂ مذاقِ علمی سے سرشار رہنا رؤسائے علیگڈھ کا حصّہ ہے اور پھر اُن میں حسرت شروانی کا۔ اُن کی تصویر جو اصل صُورت کا ایک دُھندلا سا خاکہ ہے۔ اُن کی لیاقت اور طبّاعی کا پتہ دے رہی ہے اور آج حصّۂ غزلیات میں اُن کے کلامِ نظم کا ایک پاکیزہ نمونہ درج ہے۔ جو کہہ رہا ہے کہ تصویر دھوکا نہیں دیتی ✣

(ایڈیٹر)

چھونا منع ہے

سرکاری اور دُوسرے باغوں میں جن میں جانے کی عوام کو اجازت ہو۔ عموماً لکھا ہوتا ہے ۔ "پھولوں کو چھونا منع ہے"۔ مجھے ایک باغ کی سیر کا اتفاق ہوا۔ جس کے ہر درخت ۔ ہر بوٹے ۔ ہر بیل ۔ ہر پھول ۔ بلکہ ہر پتّے پر لکھا ہوا تھا ۔ کہ "چھونا منع" ہے ۔ مگر یہ ہدایت ایسے حروف میں لکھی ہوئی تھی ۔ جنہیں صرف باغ کے مالک کی نگاہِ جُزرس ہی پہچانتی تھی اور معمولی ظاہر بین آنکھ اُن حروف کی شناخت نہیں رکھتی تھی ۔ اس لئے باغ کے مالک اور اُس کے چند رفقا میں جنہیں وہ سیر کرانے ہمراہ لے گیا تھا ۔ ایک عجیب اندرونی کشمکش جاری تھی ۔ باغ میں ایک طرف پھولوں کا تختہ اِس بات پر خنداں تھا ۔ کہ وُہ یہاں اہلِ تطاول کے ہاتھ سے محفوظ ہے ۔ مگر کہیں کہیں کوئی شرارت پسند غنچہ مُسکرا کر اہلِ نظر کو اپنی جانب بُلا رہا تھا ۔ اور آہستہ سے چٹک کر یہ اشارہ کرتا تھا کہ اب اگر مجھے چُن لو تو وقت ہے ۔ کل دُھوپ کے اثر سے اسی شاخ پر سُوکھ کے رہ جاؤنگا اور میری رنگینی بغیر قدردان کے ہاتھ تک پہنچنے کی بیرنگی سے بدل جائیگی دُوسری طرف پکے پکے میوے جن سے شاخیں جُھکی پڑتی تھیں ۔ آنے والوں کو فرشی سلام کر کے یہ پیام دیتے تھے ۔ کہ کیا ہم اسی لئے ہیں کہ کوئی زردوست دوکاندار ہمیں توڑ کر دمڑی دمڑی دھیلے دھیلے کے واسطے سرِبازار لے جائے اور کیا ہماری قسمت میں یہ نہیں کہ کوئی صاحب شناخت شوق کے ہاتھوں سے ہمیں توڑے ۔ ذوق کے لبوں سے چکھے ۔ اور دلی فرحت حاصل کرے ۔ تاکہ ہمیں اپنی زندگی کا مقصد اعلیٰ حاصل ہو ۔ ان اشاروں کنایوں کو سمجھ کر سیر کرنے والوں کے دل میں ہاتھ بڑھانے کا شوق بے اختیار گدگدی کرتا تھا ۔ اور اُن کی للچائی ہوئی نگاہیں گل و ثمر دونوں کو

یقین دلاتی تھیں - کہ تمہاری کشش بے سُود نہ جائیگی - اور تمہاری ایسی قدر کیجائے گی جس کے تم مستحق ہو - مگر جب کبھی یہ نگاہیں باغ کے مالک کی نگاہ سے دوچار ہو جاتی تھیں - تو جانیں سُن سے رہ جاتے تھے - مالک کا دل تھا کہ دہل رہا تھا - کہ مبادا یہ ہاتھ پھیلا بیٹھیں اور روکنا بہ تقاضائے اُلفتِ قدیم دشوار ہو جائے - اور اُس کے رفقا اس کی آنکھ سے ممانعت کا حکم پاتے تھے اور اس کے لبوں کی جُنبش سے یہ خیال کرتے تھے - کہ بغیر صاف آواز نکالنے کے یہ کہہ رہے ہیں کہ "چھونا منع ہے" - اس کشمکش سے گھبرا کر مالک ایک درخت کی طرف بھاگا - اور اُس کے ہمراہیوں کو یہ یقین ہوا - کہ کچھ آتا ہے - میوہ کے ایک گچھے سے دانہ پر اُس کا ہاتھ پہنچا - اور رفقا کے مُنہہ میں پانی بھر آیا - مگر اُن کے دیکھتے دیکھتے مالک کا رنگِ رُخ بدلا - اُس کی فیاضی میں اور "چھونا منع ہے" کے اصُول کی پابندی میں اندر ہی اندر لڑائی شروع ہُوئی - آخر فیاضی مغلوب ہُوئی - اب وہاں سے ہٹ آئیں تو کس تدبیر سے - میوہ کی نبض دیکھنے لگے - یعنی دو انگلیاں اس کے ایک حصّہ پر اس طرح رکھیں جیسے کوئی طبیب کسی بیمار کی نبض دیکھتا ہو - ذرا میوہ کو دبایا اور باعلان بلند کہا - "جتنے تیار دانے تھے کمبخت سب توڑ لے گئے ہیں - اب یہ رہ گئے ہیں - دو چار دن میں کھانے کے لائق ہونگے" - معلوم نہیں "لے گئے" کی ضمیر کن کمبختوں کی طرف راجع تھی - گو سُننے والوں کا خیال تھا - کہ اس دشنام سے ہوا کے کانوں کو ہی صدمہ پہنچا - دراصل اس کا مخاطب کوئی تھا نہیں - کیونکہ جیسا آگے چل کر معلوم ہو گیا - "چھونا مت" وہ اصول تھا - جس سے اس باغ میں مالک کے علم میں کبھی سرتابی نہیں کی گئی تھی - ہمارے سیر کرنے والے دوست چند قدم آگے بڑھے - اُن میں ایک بہت کم سن بچہ تھا - اُسے وہاں کی حکمت عملیوں کی کیا خبر تھی - اُس نے نادانستہ دستِ گستاخ ایک اور پھل کی طرف بڑھایا - مالک نے آگے بڑھ کر نہایت ملائمت سے اُس کا ہاتھ توروک لیا - اور اپنے دوستوں کو یہ قول محفوظ کرنا شروع کیا - "یہ آم کا بوٹا اپنی قسم کا ایک

ہے۔ ایک ہزار کوس سے تو یہ منگوایا گیا ہے۔ جہاں سے منگوایا گیا ہے۔ وہاں بھی ایک ہی بوٹا تھا۔ اور یہ بچہ فرمائش سے مہیا کیا گیا ہے۔ اس کے آم لذت میں لاجواب ہیں۔ اس خیال سے کہ اس سرزمین میں یہ خوب پنپے بہت سی مٹی وہیں کی منگوائی گئی تھی۔ پانی کی بجائے عرق کیوڑہ منوں اس مٹی میں کھپایا گیا ہے۔ اور اس کے بعد دودھ کو اس پیڑ کی غذا مقرر کیا گیا ہے۔ غرض یوں تو آم کو بہشت کا میوہ کہتے ہی ہیں۔ مگر یہ آم وہ ہے کہ بہشت میں بھی شاید کسی ولی کے حصے میں آئے"۔ یہ کہکر چند قدم آگے بڑھے۔ اور ننھے سے رفیق کا ہاتھ پھر بے ساختہ ایک اور درخت کی طرف جھکا۔ ہاتھ کا جھکنا تھا۔ کہ مالکِ باغ لپک کے پہنچا۔ اور ایک دانہ کو فی الواقع توڑ لایا۔ بچے کا دل خوشی سے بلیوں اُچھلنے لگا اور وہ پکار اُٹھا: "اہا۔ یہ تو میں لونگا"۔ مگر مالک بااصول آدمی تھا۔ اُس نے پہلے تو اس بچے کو انتظار کا مزا چکھایا اور دیر تک رومال لیکر اُس سے پھل کو پونچھتا رہا۔ تاکہ اُس کی آب وتاب بڑھ جائے۔ آخر یہاں تک چمکا۔ کہ اس کی ایک طرف کی سُرخی رخسارِ یار کی تشبیہ کے قابل نکل آئی اور دوسری طرف کا زردی مائل رنگ کسی عاشقِ بیتاب کے چہرہ کی جھلک دینے لگا۔ بچہ بے صبری کے ساتھ اُس کا انتظار کر رہا تھا۔ جب وُہ میوۂ نورس اُس کے مُنہ میں گرے۔ اُس کی آنکھیں اُوپر کو اُٹھی ہوئی تھیں۔ لب اُس کے کھُلے تھے۔ اور ہاتھ دونو دبوچنے کو آمادہ تھے۔ کہ اتنے میں انصاف پسند مالک نے اُسے ہاتھ سے دو ٹکڑے کر ڈالا۔ اور پھر اُن دو ٹکڑوں کے دو ٹکڑے کئے۔ تین تو تینوں رفقا کو دیدیئے اور چوتھے کے دو حصے کر کے ایک حصہ اپنے منہ میں ڈال لیا۔ اور دوسرا حصہ بچے کو دیکر کہا۔ بھائی تم ابھی چھوٹے ہو۔ تمہارا حصہ بھی چھوٹا ہی چاہیئے"۔ یہ منصفانہ تقسیم کرتے ہوئے وُہ زبانِ حال سے کہہ رہا تھا۔ کہ خدا جانے کس مجبوری سے مَیں نے آج مدت العمر تک باغ کے دستور کے خلاف عمل کیا ہے اور دوبارہ یہ نہیں ہو سکتا کہ "چھونا مت"

پر عمل نہ ہو۔ اپنے احباب کو کشاں کشاں پھر تختۂ گل کی طرف لے گیا۔ اور ایک ایک پنکھڑی کی داستان سُنانے لگا۔ اگر گلاب ہے تو بتایا جا رہا ہے۔ کہ قلمیں کہاں سے منگوائیں۔ پھر انہیں عرقِ گلاب میں کس طرح سینچا گیا۔ گاڑتے وقت کیا کیا تکلفات اور سامان کئے گئے۔ کتنے دِنوں میں درخت بڑھ گیا۔ اللہ کب سے پھول لگتے ہیں۔ اِتنے میں پھول کی طرف جُھکا۔ ناک اُس کے قریب لیجا کر خوشبو لی اور احباب سے فرمائش کی ذرا جُھک کے سُونگھئے گا۔ کیسی بھینی بھینی۔ مست مست اور کس قدر مرکب خوشبو ہے۔ ایک دُوسری کیاری میں گئے۔ وہاں موتیا کھلا ہُوا تھا۔ موتیے کی تعریف کے پُل باندھ دیئے اور تصدیق کے لئے ایک پھول توڑا۔ مگر توڑتے وقت ایک طرف تو اپنے ملازم نگہبانوں پر آنکھ رکھی۔ کہ کہیں دیکھ نہ لیں۔ کہ میاں نے خود ہی اصول توڑ دیا اور دوسری طرف یہ شعر وردِ زبان تھا اور لہجۂ درد میں پڑھ رہے تھے:۔

اگر یہ جانتے چُن چُن کے ہم کو توڑینگے
تو گل کبھی نہ تمنائے رنگ و بو کرتے

وُہ پھول لا کر ایک ایک کو سنگھایا۔ اور ایک ایک سے حکماً داد لی۔ انجام معلوم نہیں ہو سکا۔ کہ آخر وُہ کسے عطا ہُوا۔ جہاں تک یاد پڑتا ہے۔ رفقا میں سے کسی کو یہ دولت نصیب نہیں ہوئی۔ باغ تو بہت سے دیکھے۔ مگر "چھونا منع ہے" اُسوقت تک یاد رہیگا۔ جب باقی سیروں کے نقش صفحۂ دِل سے مٹ نہیں جائینگے تو دھندلے ضرور ہو چکینگے۔ نام قائم رکھنا چاہیئے خواہ کسی طرح ہو۔ سخاوت میں تو حاتم میدان چھوڑ نہیں گیا۔ اِس لئے بعض طبیعتیں صحنِ تنگنائے بخل کو ہی اپنا جولانگاہ بنانے پہ قانع ہو رہتی ہیں +

جہانیانِ جہاں گشت

فتوحاتِ اسلامیہ کے اسباب

(گزشتہ اشاعت سے آگے)

۷ - **واپسی کا رستہ محفوظ رکھنا** - عربوں کا عام قاعدہ تھا کہ لڑائی میں واپسی کے راستہ کی بڑی حفاظت کرتے اور ایرانیوں و رومیوں سے جنگ کے وقت اپنی حفاظت کا پورا خیال کر لیتے تھے۔ ایسے راستہ کا محفوظ رکھنا اُن کے نزدیک بہت سہل کام تھا کیونکہ وہ جنگل کو پس پشت رکھتے کہ یہی اُنکی جائے پناہ ہوتا تھا۔ اور جب اُنہیں واپسی کا اتفاق ہوتا تو ایرانی و رومی جنگل میں اُنکا تعاقب نہیں کر سکتے تھے اور نہ اُنکو اُن کے تعاقب کا کچھ اندیشہ ہوتا تھا جب رومی اپنے گھروں کو واپس آجاتے تو عرب اُنکا پیچھا کرتے اور اسطرح سے اُنکے آرام میں خلل انداز ہوتے اور صبر و آہستگی سے اُنکی قوت کو ضعیف کر دیتے اگرچہ خود اُن سے تعداد میں کم ہوتے تھے۔ اسبارہ میں اُنکی مثال ایسی ہے جیسے پچھلے دنوں ٹرنسوال کی لڑائی میں بوئیروں کی انگریزی سلطنت کے ساتھ تھی۔ باوجودیکہ بوئر قلیل التعداد تھے اور انگریز لشکر و سامان میں اُنسے زیادہ اور اُنہوں نے چند قلعے اور قدرتی مورچے بھی حاصل کر لئے تھے مگر پھر بھی بوئروں نے انگریزی فوجونکے آرام میں کئی سال تک خلل ڈالا۔ صبر اور آہستگی سے وقتاً فوقتاً انگریزی فوجوں پر حملہ آور ہوتے۔ پھر پہاڑوں اور اپنی کمین گاہوں کے اندر واپس چلے جاتے تھے جہاں انگریزی فوجیں بغیر خطرہ کے اُنکا پیچھا نہیں کر سکتی تھیں۔

عرب لوگ اس قاعدہ کی بڑی رعایت رکھتے اور ایک دوسرے کو اسپر عملدرآمد کرنیکی ترغیب دیتے تھے۔ چنانچہ عرب کے سپہ سالار مثنیٰ ابن حارثہ شیبانی نے جب مسلمانوں کے آنے اور عراق میں ایرانیوں کے ساتھ قتال کی خبر سنی تو اُنکو کہلا بھیجا۔ ایرانیوں کے ساتھ اُنکی سرحد پر لڑائی کرو مگر عرب کی اراضیات سے بہت آگے نہ بڑھو۔ اُنکے گھروں میں جا کر کبھی لڑائی نہ کرو۔ اگر اللہ تعالیٰ نے مسلمانونکو کامیابی عطا کی تو ایرانیوں کا تمام مال اُنہی کی ملک ہوگا اور اگر خدانخواستہ دوسری صورت پیش آئی تو یہ

اپنے لشکر میں واپس آجائینگے۔ اپنے ارادوں میں بہت باخبر اور اپنے وطن میں زیادہ دلیری سے تجاویز پر سوچ سکینگے۔ یہانتک کہ اللہ تعالیٰ اُنکو دوبارہ حملہ کرنیکا موقعہ دے۔

اِس اصول کی تائید حضرت عمرؓ کی اُس خواہش سے بھی ہوتی ہے جو اُنہوں نے دارالخلافہ (مدینہ) اور باقی اطراف ممالک اسلامیہ میں میل ملاپ قائم رکھنے کے واسطے ظاہر کی تھی کہ اُن میں اور مسلمانوں میں کوئی دریا حائل نہو۔ چنانچہ آپ نے فارس اور مصر کے فتح ہونیکے بعد اس بارہ میں اپنے سپہ سالاروں کو لکھا۔ اسوقت سعد بن ابی وقاص ایران کے پایہ تخت مدائن میں تھا جو فرات کی پرلی طرف ہے اور عمرو بن عاص مصر کے دارالحکومتہ سکندریہ میں تھا جسمیں جانے کے واسطے دریائے نیل پر عبور کرنیکی ضرورت پیش آتی تھی "مجھ میں اور اپنے میں دریا کو حائل ہونے دو تاکہ جب میں تمہارے پاس آنا چاہوں تو سواری پر آسکوں"۔ اِس حکم کے مطابق سعد نے اپنا صدر مقام کوفہ اور عمرو نے اپنا دارالحکومتہ فسطاط میں منتقل کرلیا۔ اور اپنے لشکروں سمیت خیموں میں اقامت کی جو آخرکار بڑے شہر بن گئے۔

۸۔ رومیوں اور ایرانیوں کی باہمی نے اتفاقی و اُن کی ہیت مجموعی کا تنزل۔ اور عادات کا بگاڑ علاوہ اُس رنجش کے تھا جو رعایا اور حکام کے درمیان خصوصاً ملک مصر اور شام میں تھی۔ کیونکہ مصر کے اصلی باشندے جو قبطی کہلاتے تھے مدت دراز تک غیر قوموں مثلاً ایرانیوں پھر یونانیوں اور رومیوں کے غلبہ سے تکلیفیں دیکھ چکے تھے اور اُنکو ایک بادشاہ کے ظلم اور سخت گیری سے بھاگ کر دوسرے بادشاہ کے پاس چلے جانا آسان کام تھا۔ شام کے باشندے جو آرمنی۔ سریانی۔ نبطی اور یہودی قوموں سے ملے جلے ہوئے تھے۔ اِس معاملہ میں اُن کا حال بھی اپنے پڑوسی مصریوں کی طرح تھا جو ایک جگہ جمکر نہیں رہتے تھے۔ انہیں اِس امر کی کچھ پروانہ تھی کہ اُن کا فرمانروا رومی ہے یا عربی بلکہ اُنہیں فکر تھا تو صرف یہ کہ انہیں کس بادشاہ کے ماتحت آرام ملتا ہے۔ اور یہ لوگ بسا اوقات عربوں کو اِسلئے ترجیح دیتے تھے کہ عرب زبان نسب اور اخلاق میں ان سے قریب تھے۔ مزید براں انسان کی یہ طبعی

عادت ہو رہی ہے کہ وہ قریب کی نسبت بعید سے زیادہ فائدہ کا متوقع رہتا ہے اور موجودہ حالت کے مقابلہ میں مستقبل نامعلوم کو ہمیشہ بہتر سمجھتا ہے۔ خاصکر جبکہ دونوں میں صریح فرق بھی نظر آتا ہو۔ جیسا کہ رومیوں اور عربوں میں تھا۔ اِن دنوں رومیوں کی حکومت کا زمانہ تنزل پر تھا۔ اِن کے احکام اور قواعد درہم برہم ہو چکے تھے۔ لیکن اسطرف عرب بہ ترقی تھے۔ اِن میں تحریک کا آغاز ہو چکا تھا۔ انہوں نے عدل اور باہمی مساوات کو اپنا اصل مدعا قرار دے رکھا تھا۔ جو تفرقہ اِن دونوں ملکوں کے باشندوں اور ان کے رومی فرمانرواؤں کے مابین مذہبی دھڑا بندی کے باعث تھا۔ وہ اسکے علاوہ تھا۔ اور یہی امور تھے جن سے اُن کو ہر ایک سلطنت کی اطاعت آسان اور اپنے حکام کے خلاف میں اُن کی مدد کرنی ضروری معلوم ہوتی تھی۔

۹ - یہودیوں کی موجودگی۔ رومی لوگ باوجود فرقہ در فرقہ ہونے کے یہودیوں کی ایذا رسانی پر متفق الرائے تھے۔ جب مسلمانوں نے شام پر چڑھائی کی تو دونوں فریق میں عداوت کمال درجہ کو پہنچ چکی تھی اور یہودی لوگ باوجود طالبِ زر ہونے کے اس امر پر آمادہ تھے کہ اپنے مال و دولت کو رومیوں کے انتقام پر بیدریغ خرچ کریں۔ یہ لوگ اکثر اوقات رومیوں کے برخلاف عربوں کو فی الواقع مدد دیتے تھے۔ شہروں کے مخفی راستے اُن کو بتلاتے تھے۔ بلکہ موقعہ پاکر شہر کے اندر اُنہیں لے جاتے تھے۔ شہر قیساریہ جسکا محاصرہ مسلمانوں نے سات برس تک جاری رکھا مگر رومی فوج کی طاقت اور قلعوں کے استحکام کے باعث اسے فتح نہیں کر سکتے تھے وہ یہودیوں ہی کی رہنمائی سے اُن کے قبضہ میں آیا تھا۔ یہ شہر اسقدر مستحکم تھا کہ ایک لاکھ فوج رات بھر اس کی فصیل کی محافظت کیا کرتی تھی اور بظاہر کوئی صورت اُس کے فتح ہونے کی نظر نہیں آتی تھی کہ باشندگان شہر میں سے یوسف نام ایک یہودی مسلمانوں کے سپہ سالار معاویہ ابن سفیان کے پاس آیا اور اپنے اور اپنے عیال کے امن کے وعدہ پر اُن کو شہر کا ایک راستہ بتلایا جو سرنگ کے طور پر تھا اور پانی اُسمیں موجود تھا

مسلمان اس سُرنگ سے شہر میں داخل ہوئے اور اُسکو فتح کر لیا۔

ابو عبیدہؓ نے شہر سامرہ کے یہودیوں سے اِس شرط پر صلح کر لی تھی کہ وہ لوگ مسلمانوں کے جاسوس رہیں گے۔ اور اُن کی رہنمائی کریں گے۔ اِس خدمت کے عوض میں اُن کا جزیہ معاف کر دیا گیا اور اُن کی اراضیات ان کے گزارہ کے واسطے انہی دیں۔ اِسی طرح متعدد شہر مسلمانوں کے قبضہ میں آئے۔ جن کی فتوحات میں رومیوں کے ذلیل کرنے کی غرض سے یہودیوں نے اِن سے سازش کر کے ان کی مدد کی تھی۔

۱۰۔ مسلمانوں کا انصاف۔ نرمی اور زہد۔ یہ تینوں اوصاف اُن شخصوں کے دلوں میں بڑا اثر رکھتے تھے۔ جو رومیوں اور ایرانیوں کی رعایا میں سے مسلمانوں کے تحت حکومت آتے تھے۔ جب مسلمان ملک گیری کے ارادہ سے نکلتے تو انہی اوصاف پر کاربند رہنے کی نصیحت اُن کا زادِ راہ ہوتی تھی۔ اِس موقعہ پر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی وہ نصائح ذکر کرنے کے قابل ہیں جو اُنھوں نے اسلامی فوج کے سپہ سالار اُسامہ بن زید کے نام اِس وقت صادر فرمائیں جبکہ وہ مسلمانوں کے ہمراہ شام کے عیسائیوں پر حملہ کرنے کو روانہ ہوئے۔ آپ نے فرمایا "خیانت نہ کرو۔ عہد شکنی نہ کرو۔ کسی کی ناک کان نہ کاٹو۔ بچے بوڑھے اور عورت کو قتل نہ کرو۔ کھجور کا درخت نہ کاٹو اور نہ اُس کو جلاؤ۔ میوہ دار درخت کو نہ کاٹو۔ بکری گائے اور اونٹ کو سوائے جائز ضروریات کے ذبح نہ کرو۔ جو لوگ دنیاوی خواہشیں چھوڑ کر اپنی عبادت گاہوں میں بیٹھے ہیں اُن سے اور اُن کے سامان سے متعرض نہ ہو۔"

اِسی ضمن میں ان کے مساواتِ حقوق کا بھی ذکر کیا جا سکتا ہے جو امیر و غریب میں بلا کسی تفاوت کے اسلام نے قائم کی تھی۔ جبلہ بن ایہم ملک غسان کے واقعہ سے اِسکی مساوات کی بخوبی تشریح ہوتی ہے۔ یہ شخص حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ میں مسلمان ہوا اور اپنے سواروں اور پیادوں کے ساتھ مدینہ میں آیا۔ حضرت عمرؓ

کو اُس کے اسلام سے بڑی خوشی ہوئی - مدینہ کے لوگ اُس کی سواری دیکھنے کو نکلے جس میں ایسے اصیل گھوڑے تھے - جن کی دُموں میں گرہیں دی ہوئی ہیں اور گردنوں میں طلائی زنجیریں تھیں اور خود جبلہ جواہرات کا ایک مرصع تاج پہنے ہوئے تھا - مگر اُس کا یہ جاہ وحشم حضرت عمرؓ کی شرعی تعزیر سے اُسے نہ بچا سکا - یہ واقعہ یوں تھا کہ بنی فزارہ کے ایک شخص نے طواف کرتے ہوئے جبلہ کے تہ بند پر پاؤں رکھا اور جبلہ نے اُس کے مُنہ پر تھپڑ مار کر ناک توڑ دی - شکایت گزرنے پر حضرت عمر نے جبلہ کو طلب کر کے پوچھا کہ یہ کیا معاملہ ہے - جبلہ نے کہا - امیر المومنین! اِس نے میرا تہ بند کھولنا چاہا تھا اِسلئے میں نے اسکو تنبیہ کی - اور اگر بیت اللہ کی حرمت ملحوظ نہوتی تو میں تلوار سے اِسکے سر کے دو ٹکڑے کر ڈالتا - حضرت عمرؓ نے کہا کہ تم نے اپنے جرم کا اقرار کر لیا ہے - اب یا تو اس کو رضامند کرو - ورنہ میں اس کو اجازت دوں گا کہ وہ تمہاری ناک پر ایسی ہی چوٹ لگائے - جیسی تم نے لگائی تھی - جبلہ نے کہا یہ کیسے ہو سکتا ہے - وہ احدٌ من النّاس اور میں بادشاہ ہوں -

حضرت عمر نے کہا کہ اسلام نے تم دونوں کو برابر کر دیا ہے اب تم اس سے تقویٰ اور حُسن سلوک کے سوا کسی حالت میں بڑھ نہیں سکتے - جبلہ کو جب حضرت عمر کے حکم سے فرار کے سوا مخلصی کی کوئی سبیل نظر نہ آئی تو قسطنطنیہ کو بھاگ گیا اور پھر کبھی ملک عرب کو واپس نہ آیا - اِس حکم کا جو عمدہ اثر عام مسلمانوں پر ہوا ہو گا وہ محتاج بیان نہیں - اور اس میں کوئی شک نہیں کہ آیندہ کسی ذی حیثیت مسلمان کو صرف اپنے مال و جاہ کے بھروسہ پر کسی غریب مسلمان پر زیادتی کا خیال نگزرا ہو گا -

اسی قسم کی کہانی ایک قبطی کی بھی ہے جسکو عمرو ابن عاص کے بیٹے نے مارا تھا - یہ شخص مدینہ میں حضرت عمر کے پاس گیا اور آپ سے پناہ طلب کی - حضرت عمر نے عمرو اور اُن کے بیٹے کو بلوایا اور اُن کے مدینہ آنے پر قبطی کو کوڑا دیا کہ عمرو کے بیٹے کو مار لے - اُسنے ابن عمرو کو کوڑا مارنے کے بعد چاہا کہ اُسکے باپ عمرو کو بھی مارے - عمرو نے کہا میرے بیٹے

نے اسکو مارا تھا بیٹے نے نہیں مارا - حضرت عمرؓ نے کہا کہ تمہارا یہی وتیرہ چلا آتا ہے کہ تم نے خدا کے آزاد بندوں کو بوجہ غلام بنا رکھا ہے - لیکن یہ یاد رہے کہ اب ایسا نہیں ہوگا - ان خوبیوں کا جو اثر فتوحات کے جلد حاصل ہونے میں تھا وہ کچھ مخفی نہیں - کیونکہ شام - عراق اور مصر کے باشندے اپنے حکام کی سرزوری اور ہٹ دھرمی سے نالاں تھے اور یہ بھی شکایت تھی کہ انہیں حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے - جب ان مسلمان کے عدل اور نرم دلی کا حال معلوم ہوا تو ان کی طرف جھک گئے -

۱۱ - مفتوحہ قوموں کی حیثیت قائم رکھنا - عربوں کا دستور تھا کہ جب کسی شہر کو فتح کرتے تو باشندگانِ شہر کو ان کی پہلی حالت پر قائم رہنے دیتے تھے - ان کے دینی اور دنیاوی معاملات حقوق تمدنی اور فصل مقدمات اور دیگر حالات میں کسی قسم کا تعرض نہ کرتے تھے عمرو ابن عاص نے جب ملک مصر کو فتح کیا تو وہاں کے باشندوں سے یہی سلوک مدنظر رکھا قبطیوں کے معاملات کو انہی کے متعلق رہنے دیا - انہی کے جج انکے مقدمات فیصلہ کیا کرتے تھے دیگر بلاد مفتوحہ کے بڑے حصوں میں بھی اسی قاعدہ کو جاری رکھا -

عرب جب کسی شہر کو فتح کرتے تو ان کی ظاہری ہیئت محض قابضانہ ہوتی تھی - باشندوں سے جزیہ کے طور پر جو کچھ لیتے وہ ان کی حمایت کا معاوضہ تھا - عربوں میں سے سلاطین غسانیہ جو حدود شام میں مقیم تھے رومی لوگ انہیں اس قسم کا معاوضہ ادا کرنے کے عادی ہو رہے تھے اور وہ ایرانیوں پر حملہ کرنے میں ان سے مدد لیتے تھے - جیسا کہ ایرانی لوگ عراق کے عربوں کو روپیہ دیکر رومیوں کے مقابلہ میں ان سے مدد حاصل کیا کرتے تھے - دُول عظام اس قسم کا مال اپنی ہمسایہ قوموں کو ہمیشہ دیتے رہے ہیں - سلطنت عثمانیہ میں بھی ایسا ہی عملدرآمد ہے اور وہ اس قسم کے عطیہ کو ہمارے زمانہ میں "خوۃ" کہتے ہیں - عرب لوگ علاوہ مال لینے کے یہ شرط بھی کر لیتے تھے - کہ وہ اُن کی اطاعت کرتے رہینگے - اور اس طرح پر جزیہ دہندوں کی حمایت کے ذمہ دار ہوتے تھے اور غالباً اس حمایت سے مراد یہ تھی - کہ وہ ممالک کے اصلی باشندوں کو

رومی فرماں رواؤں کی سطوت سے محفوظ رکھیں گے۔ کیونکہ یہ باشندے انکی اطاعت سے خروج کرنا چاہتے تھے اور انکی سطوت سے ڈرتے بھی رہتے تھے۔

اس امر کی وضاحت عبادہ بن صامت کے کلام سے بخوبی ہوتی ہے جو اُنہ نے مصر کے حاکم مقوقس اور دیگر قبطیوں سے دعوت اسلام کرتے وقت کہی تھی۔ عبادہ نے کہا اگر تم جزیہ کے سوا اور کوئی بات قبول نہیں کرتے تو ماتحت رہکر اسے ادا کرتے رہو۔ جبتک ہم اور تم زندہ ہیں فریقین میں جو سالانہ معاہدہ ہو اُس کے مطابق عملدرآمد ہوتا رہے گا۔ جب تک تم ہماری حمایت میں ہو اور تمہارا معاہدہ ہمارے ساتھ قائم ہے۔ جو لوگ تمہاری اراضی اور جان و مال سے متعرض ہوں ہم تمہارے لئے ان کے ساتھ جنگ کرینگے اور تمہاری ہر طرح سے حمایت کرینگے۔ اسی قسم کی وہ تحریر تھی جو خالد ابن ولید نے عراق کے حاکم ابن نسطونا کو بھیجی تھی۔ اس کے سوا متعدد عہدنامے جو ذمیوں کو لکھ دیئے گئے تھے۔

اس امر کا مؤید وہ واقعہ ہے کہ جب عیسائیوں کے مقابلہ کے واسطے مسلمانوں کو یرموک میں فراہم ہونے کے لئے بُلایا گیا تو اُنہوں نے حمص کے ذمیوں کو ان کا وصول شدہ جزیہ دیدیا اور یہ کہا ہم اپنی مصروفیت کی وجہ سے تمہاری مدد نہیں کرسکتے اور نہ تمہاری مخالفین کی مدافعت کرسکتے ہیں اب جو تم سے بن آئے وہ کرو۔ باشندگان حمص نے کہا۔ "سچ تو یہ ہے کہ تمہاری حکومت اور انصاف ہمیں اپنی پہلی حالت سے بہت زیادہ پسندیدہ ہے جسمیں ہم پر ظلم و ستم ہوتے تھے۔ ہم تمہارے گورنر کے ساتھ ہوکر ہرقل کی فوج کو شہر میں آنے سے روکینگے" مسلمان بسا اوقات غیر مسلموں کو اس شرط پر جزیہ معاف کردیتے تھے۔ کہ وہ اُنکے ساتھ ہوکر مخالفین اسلام کی مدافعت کیا کریں۔ اور اس قسم کے معاہدے اکثر نصرانی عربوں کے ساتھ ہوتے تھے۔ ان کے سوا دوسری قوموں سے بھی مثل جراجمہ وغیرہ کے کئی بار ایسے معاہدے عمل میں آئے تھے۔ ان وجوہات سے مسلمانوں کا غلبہ لوگوں پر کچھ ناگوار خاطر نہیں ہوتا تھا بلکہ باشندگان شہر اکثر اوقات اُن کو اصلی حکام پر ترجیح دیتے تھے۔ اور جس قدر جزیہ انہیں مسلمانوں کو

دینا پڑتا تھا - وہ اِن تمام ٹیکسوں کے مجموعہ سے بہت کم ہوتا تھا جو رومیوں اور ایرانیوں کو یہ لوگ ادا کیا کرتے تھے -

حاصل کلام یہ ہے کہ مسلمانوں کو ممالک کی فتوحات پر جو دلیری اور اعانت ہوئی وہ صرف دینداری - کامیابی کا پختہ اعتقاد - شہسواری اور تیر اندازی میں پوری مہارت - اپنی تنومندی - صحرائی بود و باش کی وجہ سے میدان جنگ میں تحمل - مدبروں اور بہادروں کی موجودگی - اِن کا عدل اور نرم مزاجی - اور رومیوں ایرانیوں کی بدانتظامی تھی - یہی وجہ تھی کہ انہوں نے دس پندرہ برس کے عرصہ میں شام - فلسطین - مصر - عراق اور فارس کو عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ میں فتح کیا - پھر حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی عہد خلافت اور زمانہ مابعد میں فتوحات کا سلسلہ پیہم جاری رہا *

حافظ عبد الرحمٰن

یاس و اُمّید

ہنگامِ نزعِ دل کو کشاکش ہے کس قدر
کس طرح کیفیت مری نوعِ دگر نہ ہو

اُمید و یاس خانۂ دل میں ہیں میہماں
ہر ایک کا ہے قول اِدھر ہو اُدھر نہ ہو

کہتی ہے یوں اُمید کہ دُنیا ہے دارِ عیش
یہ بات گر نہ ہو تو کسی کا گذر نہ ہو

کہتی ہے یاس فضلِ خدا سے ہی تو عقیل
باتیں یہ سب فریب کی ہیں کچھ خبر نہ ہو

کہتی ہے تب اُمید کہ یار آئے گا ضرور
آے بیقرار مائلِ موت اِس قدر نہ ہو

کہتی ہے یاس تجربہ کاروں کی بات سُن
گر مر بھی جائے تو - تو لحد پر گذر نہ ہو

مشکل ہے شاد دونوں کی جاتی ہی لاگ ڈانٹ
کہئے کدھر ہو صاحب خانہ کدھر نہ ہو

آتش عظیم آبادی

محبت اور دل شکستگی

(ترجمہ از واشنگٹن ارونگ)

آدمی فایدہ اور حوصلہ کا بندہ ہے۔ اس کی فطرت خواہ مخواہ اسے دُنیا کے دھندھوں اور مشغلوں کی جانب رجُوع کرتی ہے۔ عشق یا محبت اس کی نوعمری کا زیور ہے یا یُوں کہیے کہ ایک ایسے گیت کی مانند ہے۔ جو تماشے کے کسی ایکٹ کے درمیان گایا جائے۔ وُہ دنیا میں دولت اور شہرت منصب و مرتبہ اور اپنے ہمجنسوں پر حکومت کا خواہاں اور جویاں رہتا ہے۔ لیکن عورت کی تمام زندگی عشق کی داستان اور محبت کی کہانی ہوتی ہے اس کا دِل ہی اس کی دنیا ہے۔ وہیں اس کو حوصلۂ ملکیت ہوتا ہے۔ وہیں اس کے حرص اور لالچ کے پوشیدہ خزانے رہتے ہیں۔ وُہ اپنے سارے ارمان اور تمام دِلی جذبات داؤں پر رکھدیتی ہے۔ محبت کے بیوپار میں وُہ اپنے دِل اور جان کی ساری پونجی لگا دیتی ہے۔ اور اگر اس میں اسے گھاٹا ہُوا تو اس کی حالتِ زار اور کیفیت نراس ہو جاتی ہے۔ کیونکہ عورت کے لئے یہ دِل کا دیوالا ہے۔

مرد کو بھی عشق کی ناکامی بعض موقعوں پر سخت رنج پہنچاتی ہے۔ اس کے نرم اور نازک خیالات گھایل ہو جاتے ہیں۔ اس کی راحت و خوشی کے بعض اُمیدیں برباد یہ تباہ ہو جاتی ہیں۔ مگر پھر بھی وُہ ایک چلتا پُرزہ ہے۔ وُہ اپنے خیالات اور دل کو دُنیا کی بیشمار دلچسپیوں میں بہلا سکتا ہے۔ اپنا رنج عیش و طرب میں بُھلا سکتا ہے یا اگر مقام ناکامی اس کے لیے دردناک باتوں کے خیال سے بھرا ہوا ہے تو وُہ اپنی سکونت بھی تبدیل کر سکتا ہے اور بال اور پر والے جانور کی طرح دُنیا کے آخری حصہ تک جا سکتا ہے اور اپنے غم کو بھلا سکتا ہے برعکس اس کے۔ عورت کی زندگی مقررہ۔ پردہ دار اور متفکر ہوتی ہے۔ مرد کی نسبت وُہ

اپنے دھیان کی اکیلی خود ہی ہمراز اور مونس ہو۔ اور اگر وہی دردناک اور غمناک ہوئی تو وُہ بیچاری تسلّی اور تشفّی کے لئے کس سے اُمّید وار ہو۔ وُہ ناز برداری اور خاطرداری کے لئے بنائی گئی ہے۔ اور اگر وُہ اپنی محبت میں ناکام ہوئے تو اس کا دل ایک ایسے قلعہ کے مثل ہے جو فتح کر لیا اور لوٹ لیا۔ اور تباہ و ویران کر دیا گیا ہو۔

کتنی روشن آنکھیں دھندلی۔ کتنے سُرخ سُرخ گال۔ زرد ہو جاتے ہیں اور کتنی پیاری پیاری شکلیں پیوند زمین ہو جاتی ہیں۔ مگر کوئی نہیں بتلا سکتا کہ کس سبب سے یہ سارا حسن و جمال مٹی میں مل گیا۔ محبّت کی ناکامیوں اور مایوسیوں کو دنیا سے چھپانے کی عورت میں قدرتی خاصیّت ہے۔ نازک اور حیادار عورتوں کی محبّت ہمیشہ شرمیلی اور خاموش ہوا کرتی ہے۔ ہنگام کامرانی میں بھی وُہ اُسے خود اپنے ہی دلکو مشکل سے جتاتی ہے۔ مگر جب زمانہ برعکس آتا ہے تو وُہ اس کو اپنے دل کے گوشہ میں دبائے رہتی ہے۔ اور وہاں اپنے عیش و آرام کی بیخ کنی کرنے دیتی ہے۔ اس کے دل کی خواہش ہی پُوری نہ ہوئی۔ کوئی ارمان ہی نہ نکلا۔ زندگی کا لُطف ہی ختم ہو گیا۔

وُہ بیچاری اُن تمام دلخوش کن باتوں کو جو دل کو خوشی۔ رُوح کو تازگی اور جسم کو توانائی بخشتی ہیں بھلا دیتی اور خیرباد کہہ دیتی ہے۔ اس کے آرام میں خلل پڑتا ہے۔ اس کے خواب شیریں میں مغموم خوابوں کا زہر ملجاتا ہے۔ رنج و غم اُس کا خون پیا کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ اُس کا کمزور جسم ظاہری خفیف نقصان کا بھی متحمل نہیں رہتا۔

کچھ دنوں کے بعد دیکھو تو اس کی بے وقت موت پر عزیز و اقارب افسوس کر رہے ہونگے۔ سب کے سب متعجب ہونگے کہ ابھی تھوڑے دنوں پہلے جو تندرستی اور خوبصورتی سے مالامال تھی۔ کیونکر ایسے جلدی مر مٹ کر کیڑوں کے حوالے ہو گئی۔ کہنے کو تو خفیف سردی یا کوئی اور اتفاقیہ سبب موت کا باعث ہوا۔ مگر اس کی اندرونی جانگدازی اور باطنی مرض کی کسی کو خبر نہیں۔ جس نے پہلے تو اس کی قوّت توڑ دی اور بعد کو

اُسے موت کا شکار بنا دیا۔

مَیں نے ایسی بہت سی عورتیں دیکھی ہیں کہ جو خود اپنے ہاتھوں مٹ مٹ کر رفتہ رفتہ صفحۂ ہستی سے اس طرح اُٹھ گئی ہیں جیسے کوئی آسمان پر چڑھ جائے اور مجھے بارہا یہ خیال ہوا ہے کہ مَیں اُنکی موت کا باعث تپ دق کی مختلف منزلوں سردی کمزوری سُستی اور ضعف دماغ اِن سب کے علاوہ وہاں تک دریافت کر سکتا ہوں کہ جہاں محبت کی ناکامی کا پہلا نشان ملتا ہے۔

دیا نرائن نگم

غزل از حسرت شروانی

سر فدائے پائے قاتل ہو گیا — مدعائے زیست حاصل ہو گیا
اُس بُتِ کافر پہ مائل ہو گیا — اپنا دِل سجدہ کے قابل ہو گیا
وُہ بہت بیباک تھا باتوں میں رات — کچھ کہا مَیں نے تو قائل ہو گیا
وُہ عیاں ہے ذرّہ ذرّہ میں مگر — بے خودی کا پردہ حائل ہو گیا
جلوہ گاہِ آفتابِ حُسن ہے — میرا دِل خورشید منزل ہو گیا
مُدعا کیسا کہاں کی گفتگو — یاں سنبھلنا اپنا مشکل ہو گیا
اُف ترے ابرو کا دم خم کیسا وار — جس نے دیکھا اسکو بسمل ہو گیا
اسکا جلوہ دیکھ بیخود اِک طرف — خود خودی کا نشہ زائل ہو گیا
سر پہ احساں سارباں کا کیوں میں لوُں — خود مرا دل اس کا محمل ہو گیا
ڈوبتے دیکھے فرشتہ خو بہت — تیرا غبغب چاہِ بابل ہو گیا
بے اثر ہیں جلوہائے باغ و راغ — حلقۂ پا شوقِ منزل ہو گیا
پی لی مے حسرت نے اسکے ہاتھ سے — دعوئے زُہد آج باطل ہو گیا

ایک رات

دس بجے ہونگے۔ چاندنی رات تھی۔ برآمدوں سے قریب ہی صحن میں کرسیوں اور چارپائیوں پر چار چار پانچ پانچ آدمی خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ وُہ وقت کچھ ایسا دلکش تھا اور نوجوانی کی بے تکلف گفتگو۔ چٹکلوں اور لطیفوں سے رنگ صحبت اس قدر گرم ہو رہا تھا کہ سونیکا خیال بھی دل میں پیدا نہ ہوتا تھا۔ دفعتہً آسمان کا چہرہ مکدر ہونا شروع ہوا۔ ہوا میں سرسراہٹ پیدا ہوگئی اور وُہ زیادہ نمایاں طور پر محسوس ہونے لگی۔ چاند کا پیارا پیارا شوخ رنگ پھیکا پڑ گیا اور تارے جھلملا جھلملا کر رہ گئے۔ کسی نے کہا "وُہ دیکھو آندھی آن پہنچی"۔ سب گھبرا گھبرا کر دیکھنے لگے۔ حقیقت میں مغربی آسمان زرد ہو رہا تھا اور یہ زردی ہر ہر گھڑی آگے کو بڑھتی آتی تھی۔ دو ہی منٹ گذرے ہونگے کہ گرد و غبار کے سیلاب نے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ دُھول اور مٹی اُڑ اُڑ کر آنکھ کان ناک اور منہہ کی خبر لینے لگی اور طوفان کے شدید تھپیڑے پڑنے لگے۔ کواڑوں کے زور زور سے ٹکرانے اور کھٹا کھٹ کی آواز سے یاد آگیا کہ کمرے کھلے ہیں۔ اُٹھے اور رومال سے چہرہ ڈھک کر اٹکل سے کمرے پر پہنچے۔ دروازہ بند کیا۔ صحن سے برآمدے میں کھینچکر ننگی چارپائی پر چادر میں سر لپیٹ پڑ رہے۔ کچھ دیر ضرور اضطراب اور پریشانی میں کٹی۔ گرد و غبار سے جو گرداب کی مانند ہو رہا تھا کچھ سوجھ نہیں پڑتا تھا۔ کہ کس پہلو پر سوئیں اور کس پر نہ سوئیں۔ چندے کروٹیں بدلیں۔ بے چینی اور گھبراہٹ کا اظہار کیا مگر مجھکو یقین ہے کہ تھوڑی ہی دیر بعد خراٹے مار رہا ہونگا۔

معلوم نہیں کیا وقت تھا کہ اچانک آنکھ کُھل گئی۔ ٹھیک ٹھیک نہیں بتا سکتا کہ کیونکر مگر مجھے تو مجھ ظالم پر کچھ بدگمانی سی ہو رہی ہے۔ ورنہ جاگتے کے ساتھ ہی کیوں

مَیں نے ہاتھ کی پُشت کو چار پائی کے پائے سے رگڑ رگڑ دیا تھا۔ مگر جس طرح بھی آنکھ کھُلی ہو اور جس کی وجہ سے بھی کھُلی ہو وُہ میرے دلی شکریہ کا مستحق ہے۔ مَیں نے آنکھیں کھول کر کیا دیکھا۔ آہا کیا کیفیت تھی۔ نور کا وقت تھا۔ ہُوا تھم گئی تھی اور زمین و آسمان پر سناٹا چھایا ہُوا تھا۔ اس وحشت خیز آندھی کی بجائے جس میں مَیں نے آنکھیں بند کی تھیں۔ ہلکی ہلکی فرحت افزا نسیم چل رہی تھی۔ یہ کسی ننھے سے باجے کی سُریلی آواز کس طرف سے آرہی ہے؟ شاید یہ رفیقِ شب جھینگر ہے کہ اس بیخودی کے ساتھ ایسی میٹھی مسلسل تان اڑا رہا ہے۔ نسیم کے جھونکے کہ پیہم اور لگاتار نہیں ہیں۔ اگر روحانی سرود فرض کئے جائیں تو معلوم ہوتا تھا کہ جھینگر اس رُوح پرور سرود کے لئے تنبورہ کا کام دے رہا ہے۔

چاند۔ واہ کیا پیارا نام ہے مگر مجھ کو شبہہ ہے کہ اس کی اس وقت کی صُورت کے لئے یہ نام بھی موزون ہے یا نہیں۔ جی چاہتا تھا کہ اس کو ملکۂ فلک بلکہ ملکۂ فلک کا تاج کہوں مگر کوئی نام بھی اس پیاری اور دل لُبھانیوالی صُورت کا صحیح خیال دلانیکے لئے کافی نہیں ہوسکتا جو نصف آسمان سے کچھ ڈھلک ٹکٹکی باندھے ہُوئے دُنیا اور اہلِ دنیا کو تک رہی تھی۔ کیا وہ اس خیال میں محو ہے کہ میرے نور نے ان چیزوں کو کتنا خوبصورت بنا دیا ہے۔ نہیں اس کو تو یہ معلوم ہی نہیں کہ خدا نے اس کو ایسی پیاری۔ دلفریب صُورت عطا کی ہے۔ معلوم ہوتا تو ممکن تھا وُہ یُوں اہلِ دنیا کو اپنے حُسن کے مزے لوٹنے دیتی؟ اس بھولی بھولی حسین صُورت کو دیکھ دیکھ کر کبھی یہ خیال ہوتا تھا کہ سرور ونشاط کا عالم اس پر چھایا ہوا ہے۔ ابھی ایک دل کش اور ہمدردی پیدا کرنے والی اُداسی برسنے لگتی تھی۔ کبھی متانت سنجیدگی اور محسوس وقعت کا اظہار ہوتا تھا۔ کبھی یہ معلوم ہوتا تھا کہ اہلِ دُنیا کو اپنے پاس کھینچے اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو خود ہی اُن کے پاس چلے آنے کے لئے بیتاب ہو رہی تھی۔ پرانے یونانی شعرا کو شاید ایسی ہی اداؤں نے دھوکا دیا

ہوگا۔ کہ اُنہوں نے اس کو سچ مچ انڈیمین کے آغوش میں لا سُلایا۔ مگر پیارے چاند تجھ پر کسی خاص کیفیت کا محمول کر سکنا ناممکن ہے۔ جس طرح تیری صُورت کو غور سے دیکھنے والے تیری تعجب خیز خوبصورتی سے مسرور۔ کبھی تجھ سے دُور ہونے کی وجہ سے مغموم معلوم ہوتے ہیں۔ کبھی تیرے نُور سے فیضیاب ہو کر سرچشمۂ ہستی کے مشکور اور کبھی تیری سرتاپا راز زندگی سے متحیّر ہو جاتے ہیں۔ ممکن ہے کہ خود تجھ پر اہلِ دُنیا کو دیکھ دیکھ کر یہ کیفیتیں پیدا ہوتی ہوں۔ کیونکہ باوجود اس پستی کے ہم بھی قدرت کی ایک عجیب و غریب صنعت ہیں۔ بلکہ خالقِ کائنات کے قول کے مطابق ہم انسان تو اشرف المخلوقات یعنی تجھ سے بھی کچھ بڑھ کر ہیں۔ اِس لئے کچھ تعجب نہیں کہ اپنی طرح ہم تجھ کو بھی مختلف کیفیتوں کا محکوم سمجھ لیں۔

مجھ کو اِس خیال سے بڑی خوشی ہُوئی کہ اس خوبصُورت منظر کو زیادہ خوبصورت بنا لینا میرے بس میں تھا۔ چارپائی پر لیٹے لیٹے آنکھ پر انگلی رکھ کر چاند کے ساتھ کھیلنا شروع کیا۔ ابھی ایک چاند تھا۔ میری تھوڑی سی کوشش سے دو ہو گئے۔ پھر ایک چاند تو فوق السما پر تھا۔ اور دُوسرا انتہائے افق پر سطحِ زمین کے بوسے لے رہا تھا۔

تاروں پر چاند کی روشنی اس قدر غالب آگئی تھی کہ وُہ بالکل اس عالمگیر نور کا ایک حصّہ ہو گئے تھے۔ مَیں نے بہتیرا آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا مگر کسی چھوٹے ننھے تارے کی صُورت دکھائی نہ دی۔

نیم کے درختوں کی ایک قطار مجھ سے کچھ فاصلے پر ہو کر گذرتی تھی۔ چاہئے تھا کہ وُہ اس نُور کی کیفیت کو کم کر دیتے۔ مگر نہیں اُن کا بےخودی کے عالم میں جھُومنا اور ایسے وقت میں کہ ساری نیچر سو رہی تھی۔ سائیں سائیں کرنا کس قدر بھلا معلوم ہوتا تھا۔ ٹہنیوں پر کوہ قاف کی ان دوشیزہ اور پاکباز لڑکیوں کا گمان ہوتا تھا جو کسی سرسبز چوٹی پر گلّے چراتے وقت ایک بےفکری کے عالم میں کھیل کُود میں مصروف

ہو جائیں اور تکلّف کی زنجیریں اُتار کر ناچنے لگیں۔ اُف وُہ کیسا وقت تھا کہ فطرتِ انسانی سارے پست خیالات سے پاک ہو کر قدرت کی نیرنگیوں میں محو ہو ہو جاتی تھی دیکھو وُہ شاخیں ایک دوسرے کے ساتھ سرگوشیاں اور اس تنہائی اور فرصت کے وقت کو غنیمت سمجھ کر چہلیں کر رہی ہیں۔ ہَوا کا وُہ دُوسرا جھونکا آیا اور جیسے کوئی چلبلی طبیعت کی طرّار کسی شوخی لیئے ہُوئے فقرے کی تاب نہ لا کر کھٹ سے الگ ہو جاتی ہے۔ بعینہٖ وُہ شاخ پھُرتی سے دُوسری کو جھٹکا دے ایک طرف کو جھُک گئی ہے۔ اُوپر سے پاک دل چاند یہ تماشا دیکھ رہا ہے۔

خاموشی کا یہ عالم تھا کہ آسمان سے زمین تک کوئی آواز سُنائی نہیں دیتی تھی۔ جھینگر کی آواز بلکہ پیہم راگ تو البتہ تھا۔ مگر وُہ اس فرحت بخش کیفیت میں اِس قدر ڈوبا ہوا تھا کہ مَیں اس کو بھی چاندنی۔ ہوا یا خاموشی کا ایک جزو تصور کرنے پر زیادہ مائل تھا۔ اِس سنّاٹے میں مجھ کو یہ خیال ہوتا تھا کہ دُنیا میں صرف چار ہی چیزیں زندہ ہیں۔ چاند۔ درخت۔ ہَوا اور مَیں۔ کاش یہ غلط فہمی کچھ دیر قایم رہ سکتی! اس سہانے سمے کے دِل کھول کر لُطف اُٹھا رہا تھا۔ تکلّف کا خیال بھی دِل کی وارفتگی کو چھو نہ گیا تھا۔ نیکی کے فرشتے روح کے کانوں میں کچھ عجب ہوش رُبا راگنی گا رہے تھے کہ العلمُ حجاب الاکبر کی سچائی بڑے زور سے مجھ پر ظاہر کی گئی۔ عین اس موقعہ پر کہ دل محویت سے بھرا ہُوا تھا۔ شاعروں کی طرف خیال رجُوع کر گیا کہ ایسے ہی مناظر ہونگے جن سے متاثّر ہو کر وہ نیچر پرست ہو گئے۔ مَیں کیوں اس موقع اور وقت سے شاعرانہ سبق اخذ نہ کروں؟ اس خیال کا آنا تھا کہ تکلّف اور تکلّف کے ساتھ تصنّع نے میری از خود رفتگی پر قبضہ کرنا شروع کیا۔ ایک پژمردہ۔ خشک پتّے کی کھڑک کانوں میں پڑی۔ یہ اس عالم خاموشی میں پہلی بے ربط آواز تھی۔ جس نے توجہ کو کسی اور طرف مائل کیا ہو۔ اِس آواز کا اثر ابھی تازہ ہی تھا کہ صفدر کی چارپائی پر

سے "اللہ میاں کیا کر رہے ہو؟" کی آواز سنائی دی۔ یہ آواز شکایت کا پہلو لئے ہوئے تھی اور بلاشبہ مجھ کو ناگوار معلوم ہوئی۔ مگر فوراً خیال آیا کہ شاید یہ کسی منحوس خواب کا نتیجہ ہو۔ پورے طور پر ابھی یہ خیال پیدا نہیں ہونے پایا تھا کہ سردار۔ کریم نے یکے بعد دیگرے صفدر کو مخاطب کر کے پوچھا "کیوں بھئی کیا ہے؟ ان بزرگوں نے متعدی مرض کا کام کیا۔ ایک ایک کر کے چارپائیوں پر سے آوازیں آنی شروع ہوئیں۔ ان کرخت آوازوں نے مجھ پر بڑا ظلم کیا۔ یہی معلوم ہوتا تھا کہ جیسے ایک نہایت ہی خوشگوار خواب میری آنکھوں کے سامنے سے ہٹا جاتا ہے۔

سنبھلنے دے مجھے اے ناامیدی کیا قیامت ہے

کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے

افسوس یہ ظالم اور بے درد آوازیں اس دلچسپ طلسم کے توڑنے میں ایک حد تک کامیاب ہوگئیں۔ کچھ یونہی سا نقشہ آنکھوں کے سامنے جما ہوا تھا کہ سڑک پر سے ریل کی سیٹی اور پھر کھڑکھڑاہٹ کی آواز کانوں میں پڑی۔ اس پر غضب یہ ہوا کہ موذن نے اپنی کرخت آواز بلند کر دی۔ جس کے ختم ہوتے ہی کالج کے مختلف شعبوں کی گھنٹیاں بجنے لگیں اور انہوں نے سارا طلسم توڑ دیا۔

اب نہ ہوا میں وہ خنکی تھی نہ چاندنی ہی کا کچھ پتا تھا۔ جھینگر اپنی راگنی ختم کر کے نہیں معلوم کسی کونے میں چھپا پڑا تھا۔ درختوں میں وہ کیفیت باقی تھی۔ نہ شاخوں ہی پر کوہ قاف کی پریوں کا دھوکا ہوتا تھا اور خاموشی کی بجائے ٹن ٹن ٹنا ٹن کی آواز کانوں کو دق کر رہی تھی +

حاجی محمد خان (مدرسۃ العلوم علیگڈھ)

جاپان سے ایک آواز

یہ وُہ مضمون ہے جس کی طرف پچھلے مہینے کے پرچے میں "خطاب بہ مخزن" کی تمہیدی سطور میں اشارہ کیا گیا ہے۔ اس لئے بغیر زیادہ تمہید کے اپنے جاپانی دوست کی تحریر کا یہ نمونہ ہم پیش کرتے ہیں:۔

ایڈیٹر مخزن! شاید آپ کو خبر نہیں کہ پُورن آپ کے مخزن کی طرف اتنی دُور سے بھی کھنچکر اپنی کُٹیا میں اسے اُونچے اُونچے سُر سے پڑھ رہا ہے۔ آپ کے دسمبر نمبر نے پُورن کو کھینچا۔ یہ قدرتی امر ہے۔ ہمیں کھینچا جانے میں کچھ عذر نہیں۔ مگر مسافر ہیں۔ بے سروسامان ہیں۔ اجنبی ہیں۔ زبان آپ کی نہیں جانتے۔ نظم تو درکنار۔ نثر نے بھی کبھی ہم کو اپنے ناز و ادا نہ دکھائے۔ خیر ہم کسی کی خوبصورتی کو نہیں دیکھ رہے۔ ہم تو اپنی بدصورتی پر مست الست ہیں۔ لیکن شُبہ صرف اتنا ہے کہ شاید ہمارا دلدار ہم کو۔ تنکا سمجھکر پھُونک سے اُڑا ہی نہ دے۔ خیر اُڑا دیا تو بھی ہم اُڑکر ایک بار تو اُس تک پہنچ کے رہینگے۔ اِس ننھی سی آرزو سے پُورن جاپان سے کُود کر مخزن میں گرا جسم ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ جان مخزن میں جل گئی۔ اب مخزن نے پُورن کو پھینکنے کی کوشش کی۔ لو مخزن کی کوشش سے پُورن تو باہر نہ اُٹھا۔ صرف مخزن کی ایک لہر اُچھل کر ناظرین کو یہ پیغام دگئی۔ کہ پُورن اب مخزن میں ڈوب گیا۔

جب مخزن کے ہم فدا ہُوئے تو مخزن کی کیا مجال جو ہم پر فدا نہ ہو۔ اب مخزن میں جا کر دیکھینگے۔

یہ کیا ہے؟

آزاد فکر سے ہُوں عزلت میں دن گذارتے | دُنیا کے غم کا کانٹا دل سے نکل گیا ہو

لذت سرود کی ہو چڑیوں کے چہچہوں میں چشمے کی شورشوں میں باجا سا بج رہا ہو
پتّوں کا ہو نظارہ میری کتاب خوانی دفتر ہو معرفت کا جو گُل کھلا ہوا ہو"

اَے مخزن! یہ نغمہ سرائی کہاں ہو رہی ہے؟ یہ کوئل کونسی شاخ پر بول رہی ہے؟ اَے پتّے یا شاخ کے پردے! او جسمانیت کے پردے۔ ہٹ اور دکھا دے کہ یہ میری ہی جان جنبش سے دُنیا کو ہلا رہی ہے۔ اَے خُدا! تو مُبارک ہے جس کی خدائی میں ایسی نغمہ سرائی ہے۔ کیا سُریلی دُھن ہے۔

اَے مخزن! مُبارک ہو تم۔ اقبال کے دِل کی بجلی کو اپنے صفحوں کی سیڑی میں جمع کر کے ساری خدائی کو ایک گمنام مقناطیسی طاقت سے لرزا رہے ہو۔

لو مخزن کی دُھن میں ہم بھی مخزن ہو گئے۔ لو جوگیوں کا بچہ یعنے ہندوستان کا ابھی نو آموز طفل مخزن سے زبان سیکھنے کو آرہا ہے۔ مخزن کی جٹا سے نئی زبان اور نئی زندگی کی گنگا بہ رہی ہے۔ بچے کچے عورت مرد سب مخزن میں شنان کر رہے ہیں۔ لو امید کے بوٹے مخزن کے جل سے ہرے ہو رہے ہیں۔

لو مخزن کی گنگا نے اپنی سُریلی سُروں میں یہ راگ الاپا:۔

جی شہر میں خوب بہلتا ہے وہاں حُسن پہ عشق مچلتا ہے
وہاں پریم کا ساغر چلتا ہے چل۔ دِل کی پیاس بُجھا جوگی
وہاں دل کا غنچہ کھلتا ہے ہر رنگ میں موہن مِلتا ہے
چل شہر میں سنکھ بجا جوگی۔ بازار میں دُھونی رما جوگی

یہ راگ کیا الاپا۔ گویا سارے جوگیوں کو شنان کا حکم دیا۔ لو برف کے تودوں کی طرح سفید ریش۔ سفید جٹا دھاری جوگی مخزن میں آ آ کر گلنے لگے۔ مخزن کی گنگا نے دُنیا کو سرسبز کرنا شروع کیا۔

مخزن کو چار طرف سے دیوی اور دیوتا مبارکبادی دینے لگے۔ آسمان اُن کے نعرہ

سے گونج اُٹھے ۔

ہر رگ میں اور ہر ریشے میں امرت بھر بھر۔ بھر پُور ہوا
سب کلفت دُوری دُور ہوئی ۔ میں شادی مرگ سے چُور ہوا
ہر برگ بدھائیاں دیتا ہے ۔ ہر ذرہ ذرہ طُور ہوا
جو ہے سو ہے اپنا مظہر ۔ خواہ آبی ناری بادی ہے

یااللہ ! کیا یہ وحدت ہے ۔ کیا یہ تیرے وصال کا مزا ہے ؟ کیا معرفت اس کا نام ہے ؟

اَے مخزن ! تیرے کنارے سارا ہندوستان فقیروں کا کاسہ لئے محبّت کی مَے کو پینے آرہا ہے ۔ اَے مخزن کی گنگا ۔ اُچھل کر دیکھ ۔ کروڑوں بندگانِ خدا جانیں لبوں پر لیے ہُوئے تیرے در پر ایک چُلّو شراب کی انتظار میں ہیں ۔ واہ واہ ہندوستان! گھر بیچا ۔ مال بیچا ۔ جان بھی بیچدی ۔ لو اب ایک چلّو کی خاطر دم دینے کو تیار بیٹھے ہیں ۔

او مخزن ! دِل کھول کر پلا ۔ سب کو مستانہ بنا ۔ پھُول کی طرح خوشبُو دن رات بغیر اُف کرنےکے دیتا جا ۔ مُسافروں کے دلوں کو اپنی محبّت کے چراغ سے روشن کرتا جا ۔ اقبال ! پہاڑوں میں خدا کے واسطے مت بھاگ ! کنجوس مت بن ۔ اپنی شاعری کو سوُرج کی روشنی میں چھپانے کی آرزو مت کر ۔ سُورج تو پرکاش ہی کرے گا ۔ دُنیا بھی سورج ہے ۔ یہ چھپی ہوئی چیز تو ذرا ہم کو دکھاتا جا ۔ کبھی اقبال بھی کوئی چھپا سکتا ہے ۔ مخزن تیرا اقبال بلند ہوا ۔ خدا نے مخزن کو اپنا گھر بنایا ۔ تو مخزن کو ساری دُنیا گھر بنانا لازم آیا ۔

پوُرن

وُہ - مرحوم

وُہ (مرحوم) تو ایک گانو کے سیدھے سادے قبرستان میں چین سے سویا ہوا ہے اور مَیں (مہجور) اُسے یاد کرنے کو جیتا جاگتا ہوں۔ اب اگر مَیں کہوں کہ وُہ تاریکی میں روشن شعلہ تھا۔ مایوسی میں اُمید کی جھلک تھا اور طوفانِ بارش میں قوس قزح تھا۔ تو کوئی اُسے مبالغہ سمجھیگا۔ کوئی دوستی کا تقاضا جانے گا۔ اور کوئی اسے اُس قدر سے تعبیر کرے گا جو کسی کے مرنے کے بعد لوگوں کے دلوں میں پیدا ہو جاتی ہے مگر واقعات کہیں چھپائے سے چھپ سکتے ہیں۔ ایک میں حرمان نصیب ہی تو اُس کے رونے والوں میں نہیں ہوں۔ وُہ تو کئی آنکھوں کا تارا تھا۔ کئی گھروں کا چراغ تھا۔ اور کئی دلوں کی ٹھنڈک۔ ماں تو خیر عمر بھر کے لئے داغ سینے پر لئے بیٹھی ہے۔ اُٹھتے بیٹھتے اُس کی تصویر آنکھوں کے سامنے ہے۔ اُس کمرہ میں گئی۔ جس میں وُہ گوہر یکتا چمکتا تھا۔ آہ سرد بھرتی نکلی۔ صندوق کو ہاتھ لگایا جس میں اُسکی چیزیں رکھی رہتی تھیں۔ آنکھوں میں بے اختیار آنسو بھر آئے۔ ذرا تنہائی ہوئی اور رومال اشکوں سے تر ہو گیا۔ باپ کو ہی پوچھ دیکھو۔ اَور بھی بیٹے ہیں۔ انہیں بھی دُنیا اچھا کہتی ہے۔ وُہ بھی ہونہار ہیں۔ مگر ہائے وُہ پہلا اور اچھوں سے اچھا! اس کا دِل نہ ٹٹولیئے۔ کیوں پکے پھوڑے کو چھیڑتے ہو۔ بھائی ویسے تو محبت کے پُتلے ہوتے ہیں۔ مگر ہوتے ہیں شریک۔ چھوٹوں کو بڑوں کی قدر ایک آنکھ نہیں بھاتی اور بڑے چھوٹوں کو زیر رکھنا چاہتے ہیں۔ مگر وُہ بھائی اپنے بھائیوں کا کیسا بھائی تھا۔ ذرا دریافت تو کیجئے کہ کسی بھائی کو ایک بات بھی تلاش سے ایسی مل سکتی ہے۔ جس میں اُس نے اُس کا دل دُکھایا ہو۔ یا اسے ذرا شکایت کا موقعہ دیا ہو۔ کیا وُہ دن بھول سکتے ہیں۔ جب وُہ

اس خیال سے کہ چھوٹے بھائی اس کی صحبت میں شرمائیں نہیں۔ اُن کا ہم عمر بن جاتا تھا۔ اور بے تکلفانہ ہنستے بولتے تھے۔ چھوٹے چھوٹے راز جو نو عمری میں مال و زر سے عزیز ہوتے ہیں۔ خوشی خوشی اُسے آکر سُناتے تھے اور وہ راز کچھ مال نہ تھا جو اُس کے گنجینۂ سینہ میں مدفون نہ ہو جائے۔ بیچاری بہنوں کی تو کچھ نہ پُوچھئے۔ بہنا! ماجائی بہن! کیسا پیارا رشتہ ہے۔ نہ تو بھائی کی طرح مدعی بنیں۔ نہ لڑیں نہ جھگڑیں۔ دُعا کا لشکر۔ ذرا بھائی کو درد سر ہُوا اور ان کی جان نکلی۔ دُعائیں مانگ رہی ہیں۔ بلائیں لے رہی ہیں۔ قربان ہُوئی جاتی ہیں۔ ہاں ان بیغرض پیار کرنے والی پاکبازوں سے پوچھو کہ وُہ ان کے حق میں کیسا تھا۔ آیا بھائیوں کا سا بھائی تھا۔ یا کچھ بڑھ کر۔ آیا ان کے سانس کا دیوانہ نہ تھا؟ دم بھر کی جُدائی بھی گوارا کرتا تھا؟ یہ تو یہ ان کے بچّوں تک کا شیدائی۔ صاف کہتی ہیں اور کہتی رہینگی۔ کہ ایسا بھائی نہ پیدا ہوگا۔ مگر کہا جاسکتا ہے کہ یہ تو عزیز ہیں۔ ان کو غم نہ ہو۔ تو اور کسے ہو۔ اس طرح تو ہر شخص روشن شمع ہے اور اپنے اپنے گھر کا اجالا ہے اور جب دُنیا سے اُٹھ جاتا ہے تو گھر بھر ماتم کدہ ہو جاتا ہے۔ مگر نہیں صاحب اُن کو دیکھئے جن سے خُون کا رشتہ نہ تھا۔ ع

غریباں را دل از بہر تو خُون است

اُن کی کیفیت سُنئے۔ ایک شخص کو مَیں جانتا ہُوں۔ جو بیان کرتا تھا۔ کہ وُہ اُسے آٹھویں دسویں ملتا تھا۔ جب دُور ہی سے اُس پر نظر پڑجاتی تھی۔ تو دل میں مسرّت کی حالت پیدا ہوتی تھی۔ اس کا پاس آنا گویا بہار کا آنا تھا۔ اور اُس کا چلا جانا فصل گل کا چمن سے رخصت ہونا۔ ہنسی اُس کی بال باندھی گولی تھی۔ اور ہنسانا اس کے بائیں ہاتھ کا کرتب۔ مغموم سے مغموم آدمی ایک دفعہ ہنسنے پر مجبور ہو جائے۔ معلوم ہوتا تھا۔ قدرت نے لوگوں کے غم غلط کرنے کے لئے اپنے ہاتھ سے بنایا ہے۔ اور حکم دیا

ہے کہ جاؤ اور دُنیا میں دلوں کو لبھاؤ۔ ایک اور بیچارہ روتا تھا اور کہتا تھا۔ کہ مجھے وُہ بارہا سینکڑوں میل کی مسافت طے کر کے ملنے گیا ہے۔ ایک اور گواہی دیتا تھا۔ کہ مَیں نے اُس کے بشاش چہرہ کو ایک دفعہ مغموم دیکھا۔ حیرت ہوئی کہ کیا ماجرا ہے۔ دریافت کرنے سے معلوم ہؤا کہ وُہ میری اک مصیبت کا حال سُنکر غمگین تھا۔ اور پُوچھنے آیا تھا۔ کہ وُہ اُس اُفتاد میں کسی کام آسکتا ہے یا نہیں۔ غرض کس کس کی سُنیں اور کس کس کی سنائیں۔ دوست تو اس کا نام کیا۔ اشارہ پاتے ہی۔ دل تھام کے رہ جاتے ہیں۔ ایک بجلی سی ہوتی ہے کہ جسم میں پھر جاتی ہے۔ بعضوں کو مَیں نے خود دیکھا ہے کہ اُن کا بدن کانپ جاتا ہے۔ اور کئی منٹ کے لئے بے خود ہو جاتے ہیں۔ اچھا۔ اِن کا کہنا بھی سند نہیں۔ یہ دوست تھے۔ یہ مرحوم کی خُوبیوں کو محبت کی عینک لگا کر دیکھتے ہیں۔ اور یہ وُہ عینک ہے جس سے بیرنگ چیز میں رنگینی۔ خزاں میں بہار اور بے نمکی میں نمکینی جلوہ دکھاتی ہے۔ اغیار سے بہتر سند کوئی نہیں۔ یُونہی چلتے چلتے گاؤں والوں کے آگے نام لے دیجئے۔ "ہائے وُہ!" ایک بڑھیا کہتی ہے کہ کبھی اُس کے گھر کے پاس نہیں گذرا بغیر اس کے کہ اسے جتّت سے بُلا کے گذرے۔ اس کس مپرسی میں اُس کا بے غرضانہ خلوص جو ڈھارس بڑھیا کے دِل کو دیتا ہو گا۔ وُہ اس کے ڈبڈباتے ہُوئے آنسو بیان کر رہے ہیں۔ بڑھیا خود اس وقت بہت باتوں کی تاب نہیں رکھتی۔ ایک کسان ہل جوت رہا ہے۔ سوال کے جواب میں بیان کرتا ہے۔ کہ اس کو اپنی محنت دُوبھر نہیں معلوم ہوتی تھی۔ اگر صبح کو وہ ہنستی ہُوئی صُورت دیکھ لیتا تھا۔ کیونکہ کبھی ایسا نہیں ہوا۔ کہ ایک آدھ ظریفانہ فقرے کے بغیر وُہ علیک سلیک کرے۔ انسانی ہمدردی اور مہربانی کا دُودھ بکثرت اُس کے حصّہ میں آیا تھا۔ اور اُسے وُہ ایسی عجلت سے لُٹا گیا جو دُنیا سے جلدی گذرنے والوں کا خاصہ ہے۔ خُدا جانے کیوں۔ مگر یہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ وُہ عمر بھر کی کسر دنوں میں نکال جاتے ہیں۔ خود تو جاودانی منزل مقصود

کو پہنچ جاتے ہیں۔ مگر دُوسروں کے دلوں پر داغ غیر معمولی گہرائی کا دے جاتے ہیں۔ جسے زمانہ کا ہاتھ مٹا نہیں سکتا۔ زندگی میں جو اتنے مہربان اور رحمدل نظر آتے ہیں۔ کیا انہیں اس بات کا احساس نہیں ہوتا کہ ہم مر کر کیوں ظلم کریں۔ مگر کر جاتے ہیں۔ اور شائد مجبور ہوتے ہیں۔ کیونکہ اُن کی گذشتہ زندگی شہادت دے رہی ہے۔ کہ وُہ دانستہ کسی کا دِل دُکھانا نہیں چاہتے تھے۔ ایسے ہی لوگوں میں وُہ تھا۔ جس کی قبر کے قریب میں اس وقت بیٹھا ہُوں۔ نہ اُس پر کوئی کتبہ ہے۔ نہ سجاوٹ۔ سادگی اور حسرت گرد و پیش برس رہی ہے۔ پاس اُس کے کسی بزرگ کی قبر ہے۔ مَیں ذرا متامّل ہُوں کہ مَیں جس کا متلاشی ہُوں وہ مزار کونسا ہے۔ کہ اتنے میں ایک دیہاتی راستہ چلتا کھڑا ہو جاتا ہے اور اُس کی قبر کی طرف اشارہ کر کے کہتا ہے :-

"خدا انہیں بخشے اُس کی قبر یہی ہے"۔

مَیں مہجُور

ہمرہوں سے کے نقشِ پا کا ہم اثر پاتے نہیں
آہ اپنے قافلہ کی کچھ خبر پاتے نہیں

بادیہ ہے ہولناک اور منزلِ مقصود دُور
کس سے جی بہلائیں کوئی ہمسفر پاتے نہیں

صدمۂ اندوہ سے شائد کلیجہ پھٹ گیا
آج ہم وہ لذّتِ دردِ جگر پاتے ہیں

بیکسی اپنے شہید ناز کی ہم سے نہ پُوچھ
جسکے ماتم میں کسی کو نوحہ گر پاتے نہیں

کیا کوئی پھل پائے گا فرہاد نخلِ عشق سے
جُز گلِ داغِ جگر جس کا ثمر پاتے نہیں

(فرہاد عظیم آبادی)

ہمیں تحریکِ آہِ سرد نے اکثر رلایا ہے
چلی ہے جب ہوا ٹھنڈی تو مینہ بھی خوب آیا ہے

دلِ تنگ اپنا وسعت کتنی رکھتا ہے یہ کیا جانوں
پر اتنا جانتا ہوں میں کہ تو اس میں سمایا ہے

مُبارک ہو تمہیں چاہت بہت ارمان تھا جس کا
سُنا ہے ہم نے راسخ جی کہیں تم نے لگایا ہے

(راسخ عظیم آبادی)

مشرقی ادب کا پژمردہ باغ

مولانا سید امجد علی صاحب اشہری جو صاف اور سلیس اردو لکھنے میں مہارتِ خاص رکھتے ہیں - اور ٹھیٹھ ہندی الفاظ کو نہایت خوبی سے روزمرّہ میں کھپاتے ہیں - درد بھرے دل سے یہ اپیل اہلِ ملک کی خدمت میں کرتے ہیں - کہ ہندو مسلمان دونوں کو اپنے مشترکہ علم ادب کی خوبیوں کا اعتراف کرنا اور اُس کے بڑھانے کی متفقہ کوشش کرنی چاہیے - ہم نے آج تک بالالتزام اُردو زبان کے متعلق کسی مباحثہ انگیز مضمون کو ان صفحات میں راہ نہیں دی - مگر چونکہ اس اپیل کو ایک فاضل ادیب کے دلِ پُرجوش کی پُرتاثیر آواز سمجھتے ہیں اور یہ بھی دیکھتے ہیں کہ اُنہوں نے دونو جماعتوں کو ملکر کوشش کرنے کی تحریک کی ہے - اس لئے ہم اسے خوشی سے درج رسالہ کرتے ہیں:-

تباہ حال ہے ہندوستاں میں لٹریچر
بہار کا نہیں پاتے ہیں اس چمن میں گذر

پڑے اُجاڑ ہیں جو تھے ہرے ہرے گلشن
ہولئے جڑ سے اُکھاڑے جو تھے قدیم شجر

ہیں بلبلوں کی جگہ چند تتلیاں اُڑتیں
نسیم صبح کے گھر میں ہے چل رہی صرصر

ہیں نونہالِ چمن علم سے پھلے پھولے
مگر مٹھاس کا پاتے نہیں پھلوں میں اثر

ہر ایک باغ میں ہے اک نئی ہوا چلتی
چمن میں پھول ہیں لیکن بہار ہے باہر

نہ ہندوؤں میں نظر آئے بالمیک کوئی
نہ ہم میں ہیں متنبّی و فیضی و جعفر

نہیں ہے ایک بھی تُلسی کا مثل بھاشا میں
نہ پارسی میں ہے خسرو کا دوسرا ہمسر

انیس و غالبِ مرحوم کی جگہ کوئی
نکل سکے نہ صد افسوس! دو زباں آور

ہے سنسکرت زمانے میں ماں زبانوں کی
مگر ہے اب تو وہ بیکنٹھ باش سرتاسر

اُسی کی بیٹی نے مارا ہے اسکو گر دیکھو
ہوئی ہے مار کے بھاشا اُسے زباں آور

نہ ہم کو نحو و عروضِ سخن میں جانکاہی
نہ ہندوؤں کو توجہ بنائے و پنگل پر

نہ بولتے ہیں پپیہے صدائے دلکش سے
نہ قمریوں کے ترانوں میں وجد کا ہے اثر

کنول کے پھول کھلے ہیں مگر ہیں پژمردہ
کھڑا ہے حوض میں لیکن فسردہ نیلوفر

ہزار طرح کے پھل ہیں مگر مٹھاس نہیں
ہزار طرح کے گل ہیں مگر نہیں گلِ تر

ہے بالمیک کی تصنیف قالبِ بیجاں
نہ پہنچے بام پہ اُس کے کمندِ اہلِ نظر

مُصنّفین میں بھاشا کے ہیں جو تُلسی داس
ورق طلا کے ہیں اُن کے لکھے ہُوئے پتّر

مگر ہیں اس میں بھی جو استعارہ ہائے ادب
وُہ میل کھائیں نہ انگلش مذاق سے یکسر

ادب سے پہلے تھا وابستہ دھرم کرم یہاں
نہ پاس آنے دے اس کو جدید لٹریچر

گریجوایٹ جو نکلے ہیں نیو فیشن کے
دلوں میں اُن کے نہیں اُس مذاق کا ہی اثر

جو نغمہ سنجِ طرب تھیں وہ اُڑ گئیں چڑیاں
جو نکتہ دانِ ادب تھے وُہ اُڑ گئے طائر

زباں میں حسن ہی نہیں ہے تو ذائقہ کیسا
نہیں مشام تو پھر کیا شمامۂ عنبر

چمن وُہی ہے مگر بلبلیں نہیں ویسی
نچے پڑے ہیں کہیں کیاریوں میں اُنکے پر

اثر نہ پوت میں موتی کا ہو سکے پیدا
نہ پائیں لوہے میں فولاد کے کبھی جوہر

ہر ایک چوب نہ تاثیر میں ہے صندل
ہر ایک پھول میں آئے گلاب کا نہ اثر

دِل و دماغ نہ باقی رہے ہوں جب اگلے
تو اُن سے کام بتاؤ وُہ ہو سکے کیونکر

جو پہلے فضل و ادب کے تھے مقصدِ عظمےٰ
وہ اب ہیں خانہ براندازِ صاحبانِ ہنر

نہ سلطنت کو ہمارے ادب کی کچھ پروا
نہ سلطنت کی صداؤں کے ہم سخن گستر

نہ کچھ خُدا سے علاقہ نہ دیوی ۔ دیوتا سے
نہ آج کام کے اوتار ہیں ۔ نہ پیغمبر

نہ راج نیتی میں اپنی زباں کا کچھ حصّہ
نہ ہم فرایضِ اعلےٰ میں صاحبِ دفتر

نہ شمعِ حُسنِ ازل سے لگی ہماری لو
نہ ہیں مناظرِ حُسنِ کمال پیشِ نظر

اُردو

میں اب دکھاتا ہُوں اُردو کی حالتیں تم کو
جو عام طور سے دیکھے ہر ایک اہلِ نظر

ہے ہندوؤں کے لئے کتنیاں یہ کلجگ کی
ہماری قوم کو دوشیزہ حاملِ محشر

اصُولِ اَلسنہ اسپر ہیں حجتِ ناطق
کہ اس زباں کے نہو دُوسری زباں ہمسر

حروف سب سے زیادہ ملے ہیں اُردو کو
بنیں کثیر سے الفاظ نسبتہً اکثر

زیادہ لفظوں سے جُملے زیادہ ہوں پیدا
اُسیقدر ہوں تکلّم میں وسعتیں ظاہر

ہر ایک بیج ہے اس کی زمیں میں کھپ جاتا
ہر ایک تخم ہو نشو و نما سے بار آور

جو دیکھئے عربی سنسکرت بھاشا کو
تو اُنکو غیر کی صُحبت سے پائیگا حذر

مگر نہیں اسے کچھ دوش ان کے ملنے سے
نہ یہ تعصّبِ مذہب کی عادتاً خوگر

جو کام سہل ہے اس کو وُہ غیر کو مشکل
جو کام غیر کو آساں وُہ اسکو آساں تر

نہ ایک نثر ہی مجموعۂ تکلّم ہے
ہے جامعِ سخنِ عام نظم کا دفتر

بڑے بڑے ادبا اس کے ناقلِ معنے
بڑے بڑے حکما اُس کے قائل جوہر

ذرا بتاؤ تو ہندی میں لکھ کے دیکھیں تو
ہوں کلّیات میں جس کے یہ وسعتیں مضمر

نہ ایک جُملہ سے پیدا ہوں اس قدر معنی
نہ یُوں تلفّظِ الفاظ ہو سخن گستر

عرب کے لفظ عجم کے زباں کی یہ حالت
زبانِ انگلش و بھاشا کی ناقلِ دفتر

نہ لکھ سکیں اُسے اہلِ مقدّمہ ایسا
نہ پڑھ سکیں اُسے اہلِ معاملہ فر فر

یہی زباں ہے زمانے کے ساتھ چل سکتی
نہیں ہے جس میں تعصّب کا نام کو عنصر

نہیں ہے واسطہ خاص اس کو مذہب سے
نہ ایک مذہب نہ ملّت کی یہ ہوئی خُوگر

کوئی زباں نہیں اس کے سوا یہاں ایسی
جو سب زبانوں میں ملجائے جیسے شیر و شکر

ہیں اِس کے پیٹ میں سرگُن نئے ساری گُن پیدا
اگرچہ ہو نہ یہ نرگُن کی آشنا یکسر

یہی زبان ہے انگلش کے ساتھ چل سکتی
اسی زبان میں ہو ہر زباں سخن پرور

سوائے اس کے علوم و فنونِ انگلش کا
کوئی زباں نہ کرے اس سے ترجمہ بہتر

غضب ہے ملک اگر اتنی ! نہ قدر کرے
کرے گا ظلم جو اس پر وُہ ہے ستم خود پر

کوئل

مرحبا اَے قاصدِ فصلِ بہار — حبذا اَے شاہدِ شاخِ چنار
خیر مقدم اَے حیاتِ بزمِ گُل — خوش بیا اَے جانِ جسمِ شاخسار
واہ وا اَے طُوطیِ رنگیں سخن — شاد باش اَے مطربِ شیریں دیار
اَے زبانِ خوش نشینانِ چمن — اَے روانِ خوش صفیرانِ بہار

سُنتے ہی تیری صدائے دلنشیں
دِل ہوَا جاتا ہے کچھ بے اختیار

یہ نوا ہے یا نویدِ بُوئے گل — یا صلائے حلقۂ یارانِ غار
زندگی بخشِ نسیمِ صبحدم — تازگی بخشِ ہوَائے کوہسار
یہ نوا ہے یا نفیرِ ارغنوں — یہ صدا ہے یا صفیرِ صد ہزار
راحتِ رُوحِ جوانانِ چمن — فرحتِ دوشیزگانِ لالہ زار

کھولتی ہے تو جو منقارِ طلا
نغمۂ سیمیں کا بندھ جاتا ہے تار

اَے سرودِ نغمۂ کرّوبیاں — اَے سرورِ مژدۂ صبحِ بہار
اَے مسیحائے دلِ زخم آزما — اَے مداوائے مزاجِ بے قرار
اَے فروغِ چہرۂ صحنِ چمن — اَے حنا بندِ کفِ دستِ چنار
چھیڑتی ہے جب تو اپنی راگنی — چھیڑ دیتی ہے رگِ ابرِ بہار

اِس طرح ہے تیری لَے کا زیر و بم
جس طرح نبضِ صبائے خوشگوار

تیری موسیقی میں ہیں مضمر تمام سوز و ساز و ہجر و وصل و انتظار
ذوق و شوق و جذبہ و جوشش و خروش بے دلی تسکیں - تمنا - اضطرار
انبساط و یاس و رنج و بیخودی حسرت و ارماں لگاوٹ اور پیار
پہپہوں سے تیرے ہے دل باغ باغ تیری فریادوں سے ہے سینہ فگار
جلوۂ آئینۂ اصوات میں
ہیں تصاویر معانی آشکار
تیری اے کوئل نوائے دلکشا ہے صریر خامۂ جادو نگار
گونج اُٹھتے ہیں ترانوں سے ترے کوہسار و مرغزار و جوبار
ہے نوا میں تیری وُہ سحر حلال بے زباں ہیں بربط و چنگ و ستار
دیکھ کر اِنساں تجھے بن جائے ہے چشم پُر حیرت سراپا اِنتظار
زندہ باش اے رونقِ بازارِ گل
تیرا شیدا تجھ پہ صادق ہو نثار

محمد صادق علیخاں (از جموں)

ماہِ کامل

اے مہِ کامل جنوں انگیز ہے تیری ضیا نُور سے تیرے ہی چلتا نُورِ خالق کا پتا
ہے غضب صحنِ فلک پر ناز سے چلنا ترا دِل سے بھاتی ہے ترے شیدا کو یہ تیری ادا
گرد گرد اکثر جو رہتا ہے ترے ہالا ترا

یہ بھی کیا میری طرح ہے چاہنے والا ترا!

آفتِ صد خرمنِ دل ہے رخِ روشن ترا
نام ہو جس کا تبسم نور وہ دامن ترا
ہے قیامت خیز یہ نکھرا ہوا جوبن ترا
سو بناوٹ سے ہے بڑھ کر ایک سادہ پن ترا

کبک بھی تیری اداؤں کا ہے گرمایا ہوا
جانور کا دل ہے تیرے حسن پر آیا ہوا

رشک کے قابل ہے اے شمعِ فلک تیرا کمال
نور تیرا بے مثل ہے آپ ہے تو بے مثال
آہ! یہ تیری صباحت۔ ہائے! یہ تیرا جمال
صاف ہے تجھ سے نمایاں شانِ ربِ ذوالجلال

چشمِ عالم سے ہوا منظور جب چھپنا تجھے
لکہ ہائے ابر تیرے رخ پہ برقع بن گئے

گیسوئے لیلائے شب کے واسطے شانہ ہے تو
زینتِ عالم ہے رونق بخش کاشانہ ہے تو
ہائے کس شمعِ شبستانی کا پروانہ ہے تو؟
کونسا ہے وہ پری رو جس کا دیوانہ ہے تو

داغ ہے سینے میں تیرے دردمندوں کی طرح
تو بھی عاشق پیشہ ہے اللہ کے بندوں کی طرح

فیضِ سحر تیرے یہ کیا اے ماہِ تاباں ہو گیا
روکشِ صحنِ گلستاں ہر بیاباں ہو گیا
جس طرف اٹھا قدم تیرا چراغاں ہو گیا
ظلمتِ شب چھپ گئی اندھیرا نہاں ہو گیا

تو ہے آتا قدرتِ قادر دکھانے کے لئے
چاندنی کا فرش عالم پر بچھانے کے لئے

کام میں سرگرم ہے اے جانِ صبح و شام تو
ہاں نہیں ہرگز اسیرِ پنجۂ آرام تو
آ کے آسائش کا دیتا ہے ہمیں پیغام تو
دافعِ افکار ہے تو۔ رافعِ آلام تو

تو شرابِ [illegible] اب کا ساغر پلاتا ہے ہمیں
[illegible] بانہہ [illegible] سلاتا ہے ہمیں

غزلِ حالی

مولانا حالی مدظلہ ایک عرصہ سے غزل کو چھوڑ بیٹھے ہیں - اس لئے اگر اتفاق سے اُن کا تازہ کلام اس صنف میں دستیاب ہو جائے تو مغتنمات سے ہے - اندنوں میں داغ کی طرح پر ایک غزل ان کی ہوئی ہے جو ہمیں مولوی وحید الدین صاحب سلیم پانی پتی کی عنایت سے ملی ہے - وجہ یہ ہوئی کہ داغ کا ایک مصرع اچھی طرح تضمین ہو گیا - اور اُس نے غزل پوری کرا لی - ہم داغ کی غزل بھی اُن کے دیوان سے نقل کرتے ہیں اور اس کے ساتھ مولانا حالی کی غزل بھی درج کرتے ہیں - تاکہ ناظرین کو دونو اُستادوں کا رنگ جُدا جُدا نظر آ جائے :-

کیا خوب رازدار ملا ہے نصیب سے
کُھل کھیلے پردے پردے میں تم تو رقیب سے

بہرِ دُعائے مرگ اُٹھیں کس طرح سے ہاتھ
چھٹتی نہیں ہے نبض ہماری طبیب سے

شوخی میں تمکنت ہے تو ہے ناز میں نیاز
تعلیم تم نے پائی ہے اچھے ادیب سے

اپنا ہی عکس کیوں نہ ہو اللہ رے حجاب
دیکھا نہ آئینہ کبھی اُس نے قریب سے

اخفائے رازِ عشق کی عادت بھی ہو رہی
ہم نے ہمیشہ حال چھپایا طبیب سے

ایسی غمِ فراق میں صورت بگڑ گئی
جُھک جُھک کے دیکھتے ہیں وُہ مجھ کو قریب سے

دیوانگی میں بھی نہ گئیں اپنی شوخیاں
گلشن میں پھول مانگتے ہیں عندلیب سے

دشمن بنائے ہیں مری قسمت نے سینکڑوں
چاہا ہے تجھ کو خلق نے میرے نصیب سے

اَے ناصحِ شفیق رہے کچھ تو چھیڑ چھاڑ
ذکرِ حبیب کم نہیں وصلِ حبیب سے

جو دیکھتا ہو اُس کو مجھے دیکھتا نہیں
دُنیا میں کون آنکھ ملائے غریب سے

مانندِ برق شکل ہوا صورتِ نگاہ
اکثر نکل گئے ہیں وہ میرے قریب سے

کہتا ہے مرتے دم بھی مجھے اب شفا ہوئی
پالا پڑا مریض کو جھوٹے طبیب سے

پُوچھو جنابِ داغ کی ہم سے شرارتیں
کیا سر جھکائے بیٹھے ہیں حضرت غریب سے

وصفِ چمن قفس میں سنو عندلیب سے
پُوچھو وطن کی قدر مُسافر غریب سے

نالوں سے ایک دم نہیں مسکین کو قرار
کیا کہہ گئی چمن میں صبا عندلیب سے

لاگ اور لگاؤ ساتھ گئے سب شباب کے
نفرت رقیب سے۔ نہ اب اُلفت حبیب سے

اَب دِل سے دُور رکھو خیالِ نشاطِ عُمر
آواز دے رہا ہے یہ کوئی قریب سے

شادی ہے زید کی وُہی۔ جو عمرو کا ہے غم
دُنیا کے بھی ہیں شادی و غم کچھ عجیب سے

دُونا بڑھنے دردِ دل کو۔ مروں اس میں یا جیوں
پانڈے سے لوں صلاح۔ نہ پُوچھوں طبیب سے

بڑھے وُہ خطبہ جس میں کہ صدق و صفا ہو
کہہ دو یہ جا کے بر سرِ منبر خطیب سے

طالب میں صِدق ہے۔ نہ عقیدت مرید میں
ہیں آجکل کے پیر بھی کچھ بدنصیب سے

فاقہ میں تم کو دیکھ کے جاتی ہے بھوک بھاگ
پہنچا ہے نسخہ آپ کو یہ کس طبیب سے

کہتا ہُوں دیکھتا ہُوں جسے خوار و بے وقار
ہے کوئی خاندانِ شریف و نجیب سے

اب جس کے جی میں آئے۔ بھرے شاعری کا دم
میدان آجکل ہے یہ خالی نصیب سے

نعم البدل ہے داغ کا حالی کلامِ داغ
ذکرِ حبیب کم نہیں وصلِ حبیب سے

تازہ غزلیں

نشاط و نور سے لبریز اک عالم کی جھولی ہے
گرہ چینِ جبیں کی کس بُتِ مہوش نے کھولی ہے

نہ سہی مہندی - کسی غیر سے وعدہ ہوگا صادق القول ہیں وعدے کو بدلتے کیونکر
نہ سہی وعدہ لٹیں شانوں پہ چھوٹی ہونگی بوجھ لیکر جو وُہ چلتے تو سنبھلتے کیونکر
نہ سہی بوجھ وُہ زلفوں کو بناتے ہونگے کنگھی چوٹی کے وہ پیچوں سے نکلتے کیونکر
لو فرضا جو نکلتے بھی وُہ دانائی سے مونگ چھاتی پہ رقیبوں کی وہ دلتے کیونکر

(علمدار حسین واسطی)

ہر گھڑی کان میں وُہ کہتا ہے کوئی اس بات سے نہ ہو آگاہ

(نامعلوم)

دِل بھی تیرے ہی ڈھنگ سیکھا ہے آن میں کچھ ہے آن میں کچھ ہے

(خواجہ درد)

گذرا ہے صبا کون بتا آج ادھر سے گلشن میں - تیرے پھُولوں کی - یہ باس نہیں ہے

(؍؍)

بھلا گل تو تو ہنستا ہے ہماری بے ثباتی پر بتا روتی ہے کس کی ہستئ موہوم پر شبنم

(؍؍)

اب کے جنوں میں فاصلہ شاید نہ کچھ رہے دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں

(سودا)

کوچہ یار میں اِک روز پکارا میں کہ آج ایک دل بیچتا ہُوں ہے کوئی لینے والا
دلفروشی کی صدا سُنکے یکایک گھر سے مستِ ناز آگیا دروازے پہ وُہ متوالا
پھر مجھے دیکھ کے گھبرا کے وُہ یُوں کہنے لگا کیوں میاں! کون پکارا تھا یہاں دل والا؟
عرض کی میں نے کہ موجُود ہے حاضر یہ دل دِل سے دل بیچنا موجُود ہے دینے والا
پھر جو کچھ آگئی دِل میں تو یکا یک دِل کو لیلیا ہاتھ میں اور خوب سا دیکھا بھالا
واے تقدیر کہ ظالم نے خفا ہو کے کہا دِل سے ناقص ہے میں اِسکا نہیں لینے والا

(میر)

(؍؍)

راحت ہے مجھ کو جنگ سے ایذا ہی صلح سے
ہر کام میں خیال ہے مجھ کو مآل کا

(ناسخ)

جی میں آتا ہے کہ اُس شوخ تغافل کیش سے
اب نہ ملئے پھر کبھی اور بیوفا ہو جایئے

دل سے یادِ روزگارِ عاشقی دیجئے نکال
آرزوئے شوق سے ناآشنا ہو جایئے

کاوشِ دردِ جگر کی لذتوں کو بھول کر
مائلِ آرام و مشتاقِ شفا ہو جایئے

ایک بھی ارماں نہ رہ جائے دلِ مایوس میں
یعنی آخر بے نیازِ مدعا ہو جایئے

بھول کر بھی اُس ستم پرور کی پھر آئے نہ یاد
اس قدر بیگانۂ عہدِ وفا ہو جایئے

ہائے رے بے اختیاری یہ تو سب کچھ ہو مگر
اس سراپا ناز سے کیونکر خفا ہو جایئے

کشمکشہائے الم سے اب یہ حسرت جی میں ہے
چھُٹکے اِن جھگڑوں سے مہمانِ قضا ہو جایئے

(حسرت موہانی)

بیٹھے ہیں مطمئن کہ متاعِ جہاں نہیں
ہر وقت فکرِ سود ہے خوفِ زیاں نہیں

کیا بس کسی پہ بس میں جب اپنی زباں نہیں
افسانہ ہے وُہ نور جو دل میں نہاں نہیں

شاہوں سے کم نہیں ہیں گدا اُس جناب کے
جس در پہ دورباش نہیں پاسباں نہیں

سہرا اُسی کے سر ہے جسے چاہتے ہیں وُہ
دس پانچ اُنکے چاہنے والے کہاں نہیں

پتھر سے اُس کو دیتے ہیں تشبیہہ اہلِ درد
جس دل کو لذتِ خلشِ جاودان نہیں

(حبیب کنتوری)

آئی بہار جلوۂ گُل سے چمن ہے سُرخ
ہیں کونپلیں درختوں کی یا پیرہن ہی سُرخ

تختہ کھلا ہے لالۂ خودرو کا دشت میں
یا ہر شہیدِ ناز کا تیرے کفن ہے سُرخ

کیا خانہ جنگیوں سے ابھی دل بھرا نہیں
کیوں آج پھر لباس ترا تیغ زن ہی سُرخ

لائیگی رنگ کچھ یہ طبیعت کی برہمی
غصّہ سے رُوئے شاہدِ پیماں شکن ہی سُرخ

(حبیب کنتوری)

پانچ ہزار روپیہ انعام

ممیرے کا سرمہ

مصدقہ جناب اسسٹنٹ سرجن صاحب میڈیکل اگزامینر صاحب بہادر گورنمنٹ پنجاب

معزز انگریزوں میڈیکل کالج کے پروفیسروں نامور ڈاکٹروں - والیان ریاست اور ولایت کی یونیورسٹی کے سند یافتہ یوروپین ڈاکٹروں نے بعد تجربہ اس سرمہ کی تصدیق فرمائی ہے - کہ یہ سرمہ امراض ذیل کے لئے اکسیر ہے :-

ضعف بصارت - تاریکی چشم - دھند - جالا - پڑوال - غبار - پھولا سبل - سرخی - ابتدائی موتیابند - پانی جانا - خارش وغیرہ معزز ڈاکٹر اور حکیم بجائے اور ادویہ کے آنکھوں کے مریضوں پر اب اس سرمہ کا استعمال کرتے ہیں - چند روز کے استعمال سے بینائی بہت بڑھ جاتی ہے - اور عینک کی حاجت نہیں رہتی - بچہ سے لیکر بوڑھے تک کو یہ سرمہ یکساں مفید ہے - قیمت اس لئے کم رکھی گئی ہے کہ خاص و عام اس سرمہ سے فائدہ اٹھائیں - قیمت فی تولہ جو سال بھر کے لئے کافی ہے - مبلغ عہ دو روپیہ ممیرے کا سفید سرمہ اعلےٰ قسم فی تولہ مبلغ تین روپے (سے) خالص ممیرہ فی ماشہ مبلغ عہ بیس روپے - مصری سرمہ فی تولہ ۸ آنہ خرچ ڈاک بذمہ خریدار - درخواست کے وقت اخبار کا حوالہ ضرور دیں - نقلی جعلی ممیرے کے سرمہ کے اشتہاروں سے بچنا چاہئے -

المشتہر

پروفیسر میاں سنگھ اہلووالیہ مقام بٹالہ ضلع گورداسپور

اس سے بڑھکر اور کیا معتبر شہادت ہو سکتی ہے

۱ - میں نے ممیرے کا سرمہ جو سردار میاں سنگھ نے تیار کیا ہے ان مریضوں پر جنکی آنکھیں بہت کمزور اور بیمار تھیں استعمال کر کے دیکھا مفید پایا میری رائے میں خاصکر ان مریضوں کے واسطے جنکے پانی جاری رہتا ہے اور دھند - غبار - کمزوری نظر ہو یہ سرمہ نہایت مفید ہے -

راقم

ڈاکٹر برج لال گھوش رائے بہادر ایل - ایم - ایس اسسٹنٹ سرجن پروفیسر میڈیکل کالج لاہور - و حال انگریزی سرجن گورنر جنرل ہند -

۲ - میں نے آپ کا سرمہ آنکھوں کی بہت سی بیماریوں میں تو بہت ہی مفید ثابت ہوا - میں آنکھوں کی ہر ایک قسم کی بیماری میں اس کے استعمال کرنے کی سفارش کرتا ہوں -

راقم

ڈاکٹر کاشی رام صاحب میڈیکل آفیسر شفاخانہ سرکار نیپال

۳ - جناب سردار صاحب جو پیکٹ سرمہ ممیرہ کا بغرض تجربہ آپنے میرے پاس بھیجا تھا - اسکو میں نے اپنے چند مریضوں پر استعمال کیا بہت مفید پایا - میری رائے میں آپ کا ایجاد شدہ سرمہ سوزش چشم اور کمزوری نظر اور تو ندی کے لئے نہایت مفید ہے -

راقم

ڈاکٹر لچھمن داس صاحب پروفیسر میڈیکل کالج آگرہ

۴ - جناب پروفیسر صاحب ! تسلیم - آپ کا سرمہ ایک مریض پر استعمال کیا - جس کو عرصہ سے دھند - ناخونہ تھا - کاسٹک لوشن وغیرہ سے بھی فائدہ نہ ہوا - مگر آپکے سرمہ نے ایک ہفتہ کے استعمال سے کلی صحت ہو گئی -

راقم

ڈاکٹر نوازش علی پنشنر مقام دیوبند

پانچ ہزار روپیہ انعام اگر کوئی شخص ممیرے کے سرمے کی سندات میں سے جو قریب بیس ہزار کے ہیں ایک کو بھی فرضی ثابت کر دے تو اس کو مبلغ پانچ ہزار روپیہ کا انعام دیا جائیگا - جو لاہور کے نیشنل بنک میں اسی مطلب کے لئے ۱۹۰۸ء سے جمع کیا گیا ہے -

افسانہ

۱۔ [illegible] حیدرآباد دکن سے ہر انگریزی مہینہ کی پہلی تاریخ کو شائع ہوا کریگا اور اس کا حجم [illegible] صفحہ کا ہوگا۔

۲۔ اس میں صرف [illegible] انگریزی [illegible] ناولوں کا ترجمہ [illegible] ہوا کریگا جو دلچسپ اور پر لطف ہونے کے ساتھ مہذب اور نتیجہ خیز ہونگے۔ [illegible] کا التزام [illegible] کیا گیا ہے کہ اصل کے مطابق [illegible] ہی فصیح اور [illegible]

۳۔ [illegible] خیال سے کہ خاص و عام کے مطالعہ سے مستفید ہوسکیں [illegible] قیمت نہایت [illegible] یعنی مبلغ [illegible] سکہ انگریزی [illegible] یا [illegible] سکہ حالی مع محصول [illegible] مقرر کی گئی ہے۔ [illegible] چھپائی کی عمدگی [illegible] خوبیوں کے [illegible]

۴۔ [illegible] قیمت [illegible] پیشگی [illegible] بھیجے جانیکی درخواست آنے بغیر رسالہ جاری نہیں کیا جائیگا۔

۵۔ نمونہ کا پرچہ [illegible] انگریزی [illegible] سکہ حالی ہونے پر بھیجا جائیگا۔

۶۔ خریداران [illegible] التماس ہے کہ [illegible] خوشخط اور واضح ومفصل تحریر فرمائیں۔

۷۔ [illegible] اشتہارات کے متعلق جو امور رسالہ میں چھپوائے جاتے ہیں [illegible] خط وکتابت کرنے سے مفصل حال معلوم ہوسکیگا۔

المشتہر

ظفر علیخان بی۔ اے مالک وایڈیٹر افسانہ

خیابان فارس

[illegible]

[illegible] پالو میرے [illegible] ہیں۔ [illegible] غیرہ [illegible] نے نہایت [illegible] قیمت [illegible] اسکی نسبت لکھی ہے جو دو نقشے [illegible] لندن کے کارخانے کی تیار شدہ [illegible] تصویر ہز ایکسلینسی ممدوح کی کتاب میں موجود ہے [illegible] خاص اہتمام سے تیار کرائی گئی ہے ضخامت ۴۴۰ صفحے قیمت جلد اول قسم اول [illegible] قسم دوم [illegible] سکہ انگریزی علاوہ محصول

المشتہر

منیجر افسر دکن [illegible] حیدرآباد دکن

سپاہی کی سپاہیانہ خوبصورت وضع نے اِس پر جادو کر دیا تھا اور اس کے دِل کو چھین لیا تھا۔ یہ گویا اُس کی پرستش کرتی تھی اور اُسے ہمیشہ اپنے سے اعلیٰ و برتر سمجھتی تھی۔ یہ بات نہیں کہ اس پر دَولت اور رُتبہ کا اثر پڑتا تھا۔ ہرگز نہیں۔ وُہ تو عقل و تمیز سلیقہ و شعور تھا۔ جس کے باعث نوجوان سپاہی نے اِس کے دِل پر قبضہ کیا تھا۔ یہ ہمہ تن گوش ہو کر اُس کی باتیں سُنا کرتی تھی اور بے انتہا مسرّت کے ساتھ اس کی طرف دیکھا کرتی تھی۔ اور جب کبھی اس اثنا میں اپنا خیال آجاتا تھا تو آپ کو بہت کم درجہ پاکر ایک ادائے دِلرُبایانہ کے ساتھ جھینپ جاتی تھی۔ اِس کے عاشق کو اِس سے محبّت تو بڑی تھی لیکن اس قدر نہ تھی جس قدر اِسکو تھی۔ اُس نے اگرچہ کھیل ہی کھیل میں اِس سے تعلق پیدا کیا تھا تاہم وُہ ایسا آزارہ و اوباش نہ تھا کہ کچھ بھی پروا نہ کرتا۔ اُس نے محبّت کو تماشا سمجھا تھا مگر خود محبّت کا تماشا ہو گیا۔ وُہ اِس معصُوم بھولی بھالی محبّت کرنے والی کے اطوار۔ طرزِ معاشرت اور حیا و عصمت کو دیکھتا تھا تو بے اختیار شادی کی تمنّا اُس کے دِل میں مَوجزن ہوتی تھی۔ مگر پھر اُس کا اعزاز ظاہری خاندانی مرتبہ اور باپ کی مغرور اور پُرتمکین طبیعت یہ سب ایسی رُکاوٹیں تھیں کہ اُسکا دِل ٹُوٹ جاتا تھا۔

یکایک رسالے کے کُوچ کا حکم ہُوا اور اِس نے ہمارے نوجوان کی آرزُوں کا یکلخت خُون کر دیا۔ نوجوان نے نہ چاہا کہ اپنی محبُوبہ کے نازک دِل کو اس وحشتناک خبر سے صدمہ پہنچائے۔ اِسی لئے جب چلنے میں ایک دن رہا تو مجبُوراً شام کو سیر کرتے کرتے اُس سے ذکر کیا۔ اِس معصُومہ کو جُدائی کا کبھی خیال بھی نہ آیا تھا۔ خبر کیا تھی ایک برقِ بلا تھی کہ خرمنِ مسرّت و راحت کو دم بھر میں خاک سیاہ کر گئی۔ نازنین زار زار مثلِ ابرِ نَوبہار رونے لگی۔ عاشقِ صادق نے فرطِ محبّت میں سینے سے لپٹا لیا۔ نازک گلابی رُخساروں کو چُوما اور یہانتک کہا کہ آؤ گھر چھوڑ دو اور جہاں خُدا لیجائے ساتھ چلی چلو۔ یہ اِس قدر سادہ لَوح تھی کہ سراسیمہ ہو کر اُس کی طرف دیکھنے لگی اور جب

ذرا دیر کے بعد مطلب سمجھی تو عجب کیفیت ہُوئی۔ زبان سے تو کچھ نہ کہا مگر اس طرح پیچھے ہٹی جس طرح کوئی افعی سے بچتا ہے اور ایسی درد بھری نظر سے اُس کی طرف دیکھا کہ نگاہ سینے کو چیر کر دِل کے پار ہو گئی۔ پھر کلیجا مسوس کر باپ کی جھونپڑی کی طرف بھاگی۔ غریب سپاہی ہکّا بکّا خفیف ہو کر رہ گیا۔

اگلے ہی دن رسالے کے ساتھ وُہ اُس گاؤں سے چلا گیا۔ نئے آب و دانے نئے نئے منظروں نئی نئی تفریحوں اور نئے نئے رفیقوں نے اُس کی محبت کو بھلا سا دیا۔ تاہم خیمہ گاہ کی چہل پہل۔ زمانِ محاصرہ کی تفریح۔ فوجوں کی صف آرائی اور لڑائیوں کے شور و غُل میں کبھی کبھی اُسے دیہاتی پُر امن اور سادہ زندگی کے نظارے یاد آ جاتے تھے۔ ہائے وُہ سفید جھونپڑی! وُہ بٹیا جو رُوپہلے نالے کے کنارے کنارے ہو کر اُوپر جھاڑی تک پہنچی تھی! وُہ ننھی مُنّی دیہاتی لڑکی جو اُس کے بازو کے سہارے اُس بٹیا پر اِدھر اُدھر ٹہلا کرتی تھی اور بیحد تمنّا کے ساتھ اُس کی باتیں سُنا کرتی تھی!

محبُوب کی جُدائی سے بیچاری دہقان زادی کو بڑا بھاری صدمہ ہُوا۔ اُس کی ساری اُمّیدیں خاک میں مل گئیں۔ پہلے کچھ دنوں تک تو غش آتے رہے اور دیوانہ پن کے آثار پائے گئے۔ جب یہ شکائتیں دُور ہُوئیں تو ایک گہری تاریک غم کی گھٹا دِل پر چھا گئی جس سے تھوڑے ہی عرصے میں جسمِ نازنین سُوکھ کر کانٹا ہو گیا۔ آہ! اِس نے جھروکے سے سپاہیوں کو کُوچ کرتے دیکھا تھا! اِس نے اپنے بیوفا عاشق کو دُور تک اسقدر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا تھا کہ ڈھیلوں میں درد ہونے لگا تھا۔ دُور سے اب فقط ایک چمکتا تارا سا نظر آتا تھا! ہائے ایک خواب روشن تھا کہ آنکھوں سے نہاں ہو گیا اور اِسے تاریکی میں چھوڑ گیا! لوگوں سے اِسے نفرت ہو گئی۔ اکیلی اُن روشوں پر ٹہلا کرتی تھی۔ جن پر یہ اور اُس کا محبوب دونو اکثر رہا کرتے تھے۔ بس جس طرح کوئی

آہوئے زخم خوردہ سب کی نظروں سے پنہاں ہو کر کسی گوشے میں رو رو کر جان کھویا کرتا ہے۔ ہو بہو یہی اس کی حالت تھی۔ شام کے وقت گوالنیں اپنے اپنے کھیتوں سے آتی تھیں تو اکثر اسے کوئی غمناک گیت گنگناتے سنتی تھیں۔ عبادت کی طرف اب اس کا میلان بہت زیادہ ہو گیا۔ جب پاس سے گذرتی تھی تو بڑے بوڑھے بھی اس کی ناتوانی ولاغری پر ترس کھا کر اور اس کی زاہدانہ صورت سے مرعوب ہو کر راستے سے ہٹ جاتے تھے۔ اسے یقین ہو چلا تھا کہ میں قبر کی طرف قدم بڑھائے جا رہی ہوں۔ مگر قبر کا خیال اسے تشویش میں نہ ڈالتا تھا۔ یہ تو اسے آرامگاہ سمجھتی تھی جس رشتۂ سیمیں نے اسے دنیا سے باندھ رکھا تھا وہ ٹوٹ گیا تھا دنیا کی کوئی خوشی اسے نظر نہ آتی تھی۔ سخت مجبور ہو کر اس نے اپنے محبوب کو ایک آخری خط لکھا اس میں یہ بیان کیا کہ میں جاں بلب ہوں اور یہ سب تمہاری کرتوت ہیں۔ اس خط میں اپنے تمام رنج والم بھی تحریر کئے اور اخیر میں یہ لکھا کہ میرے جی نے گوارا نہ کیا کہ تمہیں معاف کئے بغیر مر جاؤں۔

بالآخر نقاہت اتنی بڑھی کہ جھونپڑی سے باہر نکلنا محال ہو گیا۔ گر پڑ کر جھروکے تک پہنچ جاتی تھی اور وہیں بیٹھی بیٹھی دن گزار دیتی تھی۔ اس نے کبھی کسی کا گلہ نہ کیا اور نہ اپنا دکھ کسی سے کہا۔ محبوب کا نام تک کبھی اس کی زبان سے نہ نکلا۔ ماں کے سینے پر گردن ڈال دیتی تھی اور چپکی چپکی روتی تھی۔ غریب والدین بیٹی کا یہ حال دیکھ دیکھ کر کڑھتے تھے مگر مایوس نہ ہوتے تھے۔ ابھی انکو امید تھی کہ ہمارے خزاں زدہ نونہال پر پھر ایک دن بہار آئیگی۔

ایک دن اسی صورت سے وہ اپنے والدین کے پاس بیٹھی تھی۔ دونوں ہاتھ انکے ہاتھوں میں تھے کھڑکی کھلی تھی اور نرم نرم ہوا کے ساتھ اس کے ہاتھوں کی پلی ہوئی حنا کی خوشبو مشامِ جان کو معطر کر رہی تھی۔ باپ ابھی ابھی کتابِ مقدس کے ایک مقام

کو پڑھ کر سُنا رہا تھا جہاں دُنیا کی بے ثبات راحتوں اور بہشت کی ابدی لذتوں کا بیان تھا۔ آہ! معلوم ہوتا تھا کہ اس بیان سے اُسے تسلی ہوتی ہے! والدین بڑی حسرت سے اُس کی صُورت کو تک رہے تھے جو کثرتِ رنج و غم کے باعث نُورانی ہو چلی تھی۔ وُہ ٹکٹکی باندھے ایک طرف کو دیکھ رہی تھی۔ اور نازک نیلی نیلی انکھڑیوں میں آنسو بھرے تھے۔ ایں! کیا وُہ اپنے بیوفا محبُوب کی یاد کر رہی تھی یا اُس کے دِل میں کچھ اَور ہی خیال تھا۔

یکایک گھوڑے کی ٹاپ کی آواز کان میں آئی۔ ایک سوار گھوڑا دوڑاتا جھونپڑی کے دروازے کو آیا اور جھروکے کے نیچے آ کر اُتر پڑا۔ بیچاری لڑکی نے آہستہ سی ایک چیخ ماری اور پھر اپنی جگہ لیٹ رہی۔ ہاں یہ اُسکا پشیمان عاشق تھا! وُہ دوڑ کر اندر آیا اور آتے ہی اِسے سینے سے لپٹا لیا۔ نحیف و زار جسم اور مُردنی چھائے ہُوئے زرد زرد پیارے چہرے کو دیکھ کر اس کے دِل پر سخت چوٹ لگی۔ اِس میں اتنی طاقت کہاں تھی کہ اُٹھتی۔ بیٹھے ہی بیٹھے کانپتا ہُوا ہاتھ اُس کی طرف بڑھایا۔ لبوں کو جُنبش ہُوئی مگر کوئی لفظ منہ سے نہ نکلا۔ ایک عجیب محبّت بھرے تبسم کے ساتھ نگاہ کی اور پھر سدا کو آنکھیں بند کر لیں۔

یہ ہے وُہ کہانی جو مجھے لوگوں کی زبانی معلوم ہُوئی۔ واقعات کس قدر سادہ تھے مگر مجھ پر انکا اثر ایسا ہوا کہ بیان نہیں کر سکتا۔ اسکے بعد میں بارہا اس گاؤں میں آیا اور جب آیا ارادتاً قبرستان میں گیا۔ جاڑے کی ٹھنڈی شام تھی۔ درختوں نے پتوں کا پُرانا لباس اُتار دیا تھا۔ ہوا خُشک گھاس میں سے سَن سَن کرتی آتی تھی۔ اور ہر طرف ویرانی اور بے رونقی چھائی تھی۔ معصوم گاؤں والی کی قبر پر سبز بیلیں چڑھی تھیں اور ہری ہری دوب قبر کے تعویذ پر لہلہا رہی تھی۔ وُہی پھُولوں کا ہار جسے میں نے میّت کے روز دیکھا تھا قبر پر لٹکتا تھا پھُول تو مُرجھا کر خشک بھی ہو گئے تھے لیکن احتیاط کرنے والوں نے یہ احتیاط ضرور کی تھی کہ اُنکی سفیدی میں فرق نہ آئے۔ مَیں نے بہت سی عجیب و غریب یادگاریں دیکھیں اور ایسی دیکھیں کہ سنگدل سے سنگدل ناظر کا دل بھی اُن کو دیکھ کر بھر آئے۔ مگر یہ ایسی یادگار تھی کہ میرے دِل پر جتنا اُسکا اثر ہوا اُتنا کبھی کسی کا نہ ہُوا تھا۔

سیّد نذیر حسین

(ترجمہ از ارونگ)

لاہور کی اک شام

(مُردہ دل اس کو نہ پڑھیں)

کچھ تو ایڈیٹر مخزن کی فرمائش اور کچھ شہرت کی خواہش کے فکر میں تھا کہ لکھوں تو کیا لکھوں اور کیونکر لکھوں کہ یکایک کسی نے ....

ہاں یہ بتانا تو میں بھول ہی گیا کہ دو گھنٹے سے کسی وفا شعار کے انتظار میں بیٹھا تھا۔ بیٹھا تو کیا تھا یُوں کہنا چاہئے کہ اُٹھتا تھا اور بیٹھتا تھا کھڑکی میں سے جھانکتا تھا اور کمرہ میں ٹہلتا تھا۔ گھڑی ہاتھ میں دل سینہ میں دونوں یکساں متحرک دونوں پر غصہ۔ بحرِ خیال کی شورش اور خواہشوں کی لہروں کا ٹکرانا۔ زیست کی ننھی سی کشتی اور بے صبری کی چٹانیں۔ اُمید تھی تو نااُمیدی یاس تھی تو جینے سے۔ آخرش جسم میں کچھ سنسناہٹ سی ہوئی سنسناہٹ کہوں یا اُمید کی جانکنی۔ اس کو کس طرح بیان کروں۔ جس پر بیتی ہو وُہ سمجھے۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ اشک غماز دامن پر تھا اور میں تصویر یاس کرسی پر۔ اِس بے بسی کے عالم میں بھی آدھ گھنٹہ کامل گذر گیا۔ انجامِ کار میں نے یہ سوچا کہ کچھ مضمون ہی لکھوں کہ یکایک .....

کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ دیکھا تو اک قرضخواہ تھے۔ انکو جُوں توں ٹالا تو سہی لیکن مضمون ان سے بھی پہلے رخصت ہُوا۔ بہت کچھ دِل کو سمجھایا مگر بے سُود۔ یہ کب ممکن ہو سکتا تھا کہ سلسلۂ خیالات جو منقطع ہو چکا ہو (اور منقطع بھی اک قرضخواہ کی صورت دیکھ کر) وُہ خود بخود موجود ہو جائے۔ اس بیچارگی کی حالت میں میں نے یہ ارادہ کیا کہ سیر کو ہی نکلوں۔ غم اگر غلط نہ ہو گا تو کونسا ایسا بڑھ جائیگا۔ یہ ٹھان لکڑی ہاتھ میں لے ہر قدم پر دل کو سو سو تسلیاں دیتا باہر کو چلا۔ مگر صُورت کیسے بدلتا اور بشاشت کہاں سے خریدتا۔ گلی سے نکلا ہی تھا کہ ایک فقرہ باز بھانپ گئے اور بیٹھک میں بیٹھے ہی بیٹھے

یُوں فرمانے لگے" اجی حضرت مضطر کس کی یاد میں ایسے گن گن کے قدم دھر رہے ہو۔ واللہ انشا بھی کیا شاعر تھا سو سال پہلے آپ کی چال کی تعریف کر گیا ہے۔ ع

ہر قدم پر ہے گماں یاں رہ گیا واں رہ گیا

ہم ملادینگے بات ہی کیا ہے"؟ اب چونکہ میں پہلے ہی قید لگا چکا ہوں کہ اس مضمون کو مُردہ دل نہ پڑھیں۔ اسواسطے میں کھلم کھلا دل کی بات کا اظہار کرتا ہوں اور اُمید ہے کہ میرے تجربہ سے میرے ہمخیالوں کو ایک نتیجہ خیز سبق حاصل ہو گا۔

یہ تو ناظرین فوراً سمجھ سکتے ہیں کہ میں ان لوگوں میں سے ہوں جو دن رات حسن کے گیت گاتے ہیں جن کا اصولِ زندگی عشق ہے مگر یہ ان کو صرف بتانے سے معلوم ہو گا کہ میں اُن خاص عشقبازوں میں سے ہوں جن کو بار بار اپنی حالت پر افسوس آتا ہے اور جن کی طبیعت اگر انکو طنزاً کچھ کہا جائے تو آگ کی طرح بھڑکتی ہے اور خودداری و عزت کو ہاتھ سے جاتا ہوا دیکھ کر عشق کے موہوم بندورسن کو جلاکر راکھ کر دیتی ہے۔

چنانچہ جس وقت مجھ کو اس شخص نے مذکورہ بالا الفاظ کہے تو میری آنکھوں میں خون اُتر آیا اور قریب تھا کہ جوانی اپنا رنگ لاتی اور دیکھنے والوں کو دو چار دن کے لئے ایک دلچسپ مضمونِ گفتگو ہاتھ آتا۔ مگر میں نے ضبط کیا اور ٹل گیا۔

ٹل تو گیا لیکن غصہ کا وُہ زہر جو ہاتھ اور بازو کے ذریعہ نہ نکلا دِل میں اپنا کام کرتا گیا اور بار بار مجھ کو یہ خیال آتا رہا کہ کیوں میں نے اپنا اور اس فقرہ باز کا خون ایک نہ کیا اور جب یہ سودا بھی ختم ہوا تو پھر یہ سوچنے لگا کہ آخر عشق میں بُرائی ہی کیا ہے؟

اِس سوال کا جواب تو بدیہی تھا کہ بُرائی ہے بھی اور نہیں بھی صرف واقعات پر انحصار ہے لیکن میری عقل پر کچھ ایسا پردہ چھایا تھا کہ ان ایّام میں مجھ کو عشق ہی مذہب اور عشق ہی بہشت معلوم ہوتا تھا۔ اور وُہ تمام لوگ جو اسے مطعون کرتے تھے مجھ کو ابوجہل کے بھائی معلوم ہوتے تھے۔ انہی خیالات میں غرق۔ ٹھنڈی سڑک پر جا پہنچا۔ سڑک کی

پُرفضا بہار - حوروش یورپین لیڈیوں کی ہوا سے باتیں کرتی ہوئی رَبڑ کے پہیوں والی گاڑیاں - بائیسکلوں کی برق رفتاری - ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا سے آنکھیں کُھل گئیں - دل سے تمام غبار یکقلم دُور ہو گیا - اتنا تغیّر ہُوا کہ یا تو سر جُھکائے زمین پر نگاہ جمائے آرہا تھا یا فوراً آنکھ اُٹھا کر اس بہارِ زندگی کا مزا لُوٹنے لگا - دُور سے دیکھا کہ دو نوجوان ترکی ٹوپیاں زیبِ سر کئے میری طرف آرہے ہیں - یُوں تو مَیں ویسی ہی ترکی ٹوپی پر مرتا ہُوں لیکن اُنکی ترکی ٹوپیوں میں کچھ غضب کی ادا تھی - جُوں جُوں وہ قریب آتے گئے دِل بیتاب ہوتا گیا - پاس آئے تو معلوم ہوا کہ میرے ہی ہمجماعت سعادت و کرامت ہیں - دونوں طرحدار بانکے دونوں سرخ و سفید ایک قد ایک لباس دونوں فدائے شعرِ زندہ دلی کی مُجسم تصویریں - جی تڑپ اُٹھا کہ ہو سکے تو انکے ساتھ سیر کیجئے - سعادت نے بھی اس قدر پرے ہی سے پہچان لیا اور کہا مسٹر مضطر آپ غالب کے اس شعر کے خُوب معنے سمجھتے ہیں - ؎

ہے آدمی بجائے خود اِک محشرِ خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

جب دیکھو اکیلے لیکن آج تو ہم آپ کی اس انجمن میں مخل ہونگے - آیئے کرامت نے اک مضمون پیش کیا ہے اس کی بحث میں آپ بھی شریک ہوں - مضمون دوستی ہے اور دوستی بھی نوجوان ہم عمروں کی -

مَیں - واقعی بہت پیارا مضمون ہے لیکن بحث کی گنجائش نظر نہیں آتی -

کرامت - واہ بحث کے توسمندر کے سمندر کھپ سکتے ہیں - مثلاً سعادت اور کرامت دو بیوقوف سمجھے بیٹھے ہیں کہ زندگی میں اگر کچھ حاصل کرنے کے قابل چیز ہے تو وُہ دوستی ہے - اِس کے بغیر شاہنشاہی گدائی سے بدتر ہے اور اگر یہ حاصل ہو تو گنجِ قارون کی وقعت گردِ راہ سے زیادہ نہیں - دو دِل ایک ہوں تو چار بازو اِک فوج ہیں اور

اگر یہ میسر نہ ہو تو لاکھوں کروڑوں سیاہ بیکار ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی جب یہ خیال آتا ہے کہ یقیناً ہماری یہ آرزوئیں ہماری ناآزمودہ کاری کا نتیجہ ہیں اور زیادہ سے زیادہ پانچ سات سال تک مفقود ہو جائینگی تو اوّل عقلِ انسانی پر افسوس آتا ہے کہ جو چیز ہم کو اب جزوِ زندگی معلوم ہوتی ہے وہ درحقیقت اک جنسِ ارزاں ہے اور دوئم یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب دوستی اور اُس کی خواہش صرف سن کا تقاضا ہے تو کیا وجہ ہے کہ اس عارضی نمو کی غور و پرداخت میں عمر یا اسکا ایک منٹ بھی صرف کیا جائے؟ کیوں نہ انسان کتابیں پڑھے یا ابھی سے کمانے کی فکر میں لگ جائے؟

سعادت - بھائی میں نے تو پہلے ہی کہدیا ہے کہ انسان دوستی بھی کرے کتابیں بھی پڑھے کمائی کے فکر سے بھی چھٹکارا نہیں ہاں سب چیزیں اعتدال سے کرے۔

کرامت - اعتدال سے تو مجھ کو نفرت ہے۔ میری رائے میں تو یہ چھوٹے دلوں کی نشانی ہے۔ اِس لفظ کو اگر کوئی سکندر اعظم یا نپولین کے سامنے بطورِ قانون زندگی پیش کرتا تو وُہ کہنے والے کو کمرے سے باہر نکلوا دیتے۔

میں - واقعی اعتدال تو کچھ بوڑھے آدمیوں کی سی نصیحت ہے۔ اِنسان کا دل اِک سمندر ہے جسکو ماہِ حسن کی کشش کبھی چین لینے نہیں دیتی۔ نیچر میں بھی اعتدال کہیں کہیں ہی نظر آتا ہے۔ ورنہ بجلی کی کڑک سے ایک ادنیٰ مچھر کی بھنبھناہٹ تک سب اپنی پوری طاقت صرف کرتے ہیں۔

سعادت - بے اعتدالیوں سے سبک سب ہیں ہم ہوئے
جتنے زیادہ ہو گئے اتنے ہی کم ہوئے

کرامت۔ سعادت یہ تمہیں کیا عادت ہے کہ جھٹ اپنی بات کی سند میں شعر پیش کر دیتے ہو۔ بھلا شعر کو منطق سے کیا تعلق؟

میں - جی ہاں اور اگر انہی سے پُوچھا جائے کہ مرزا کی بے اعتدالیوں کو انکی

لیاقت اور عظمت سے کچھ تعلق نہ تھا تو یہ فرمائینگے ضرور تھا -

سعادت - بیشک - اعلیٰ درجہ کی فضیلت و لیاقت کے ساتھ نوّے فی صدی مثالوں میں بے اعتدالیاں نظر آتی ہیں لیکن وُہ بے اعتدالیاں زید و عمرو کے معیار سے بے اعتدالیاں ہیں نہ کہ ان بڑے آدمیوں کے معیار سے - جنکی خوبیوں کا ذکر کیا جائے مثلاً آپ کے اور میرے لئے تو یقیناً آٹھ گھنٹے سے زیادہ کام کرنا بے اعتدالی ہے - لیکن سر سیّد مرحوم صُبح سے شام تک کام کرتے تھے اور اُنکی صحت میں چنداں فرق نہ آیا - جن دنوں میں اُنہوں نے انجیل کی تفسیر لکھی وُہ دو یا تین گھنٹے آرام کرتے تھے لیکن آپ تو کر کے دیکھیں ؟ خیر اصل مطلب یہ ہے کہ زندگی ایک معمّا ہے جس کے بہت سے مختلف لیکن صحیح حل ہو سکتے ہیں - کسی کو سپاہی ہونے میں مزا ملتا ہے کسی کو قلم گھسانے میں - کسی کو معاملات کے توڑ جوڑ میں اور کسی کو لُون تیل تولنے میں لیکن کامیابی اور دیرپا کامیابی کے لئے اعتدال اک جزوِ اعلیٰ ہے -

کرامت - بجا فرمایا - اوہو باتوں میں رستہ تو ختم ہو گیا اور بحث جُوں کی تُوں - خیر پھر سہی -

میں - آپ تو بورڈنگ ہوس جائینگے مجھے اجازت ہو - تسلیم -

مضطر

پٹنہ

اور

خان بہادر مولینا شاد مدظلہ

اُن مقامات میں جو تاریخی شہرت رکھتے ہیں۔ پٹنہ (عظیم آباد) بھی ہندوستان کے قابلِ ذکر شہروں میں ہے۔ گو اسکی بہار خزاں سے مبدّل ہو چکی ہے۔ مگر اس خزاں میں بھی ایک ایسی ادا اس شہر میں پائی جاتی ہے جو نہایت دلفریب ہے اور یہاں کے لوگ آج تک اس کے قدیم علمی مذاق کی یاد دلاتے ہیں۔ یہاں کے نامور شاعر مولنا شاد قدرتی طور پر اپنے وطن کے دلدادہ ہیں اور ان کے کلام میں جابجا ایسی بیساختہ توصیف پائی جاتی ہے۔ جو دل نشین ہے۔ مخزن کے دربار نمبر میں ایک اُردو نظم جناب موصُوف کی چھپی تھی۔ جس میں شاعر کے دلِ پُر درد سے پٹنہ کی قدیم بزرگی کی داستان اور اس کے زوال کا افسوسناک قصّہ درج تھا۔ جس کو بے چشمِ پُر آب پڑھنا مشکل تھا۔ حال میں ہمیں اُن کے چند فارسی اشعار ملے ہیں۔ اِن میں بعض عظماے دکن کے خطوط کے جواب میں جنہوں نے پٹنہ کی مذمت لکھی تھی۔ اس شہر کی اُن خوبیوں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ جو اب اس گئی گذری حالت میں بھی اُس میں موجود ہیں۔ اور اُسے چھوڑ کر دکن یا کسی اَور حصّہ ملک میں جا بسنے سے گریز کی گئی ہے۔ وُہ ناز کرتے ہیں اور بجا ناز کرتے ہیں کہ گیوتم بُدھ اسی حصّہ ملک نے پیدا کیا۔ وُہ فخر کرتے ہیں اور بجا۔ کہ ہندوؤں کا قدیم دار العلوم بہار ہے۔ اور انکو حق ہے کہ وہ یہ کہیں کہ اب بھی وضعداری میں اہلِ عظیم آباد کسی سے کم نہیں۔ پیشتر اس کے کہ اشعار ہدیۂ ناظرین ہوں۔ تھوڑا سا ذکر مولینا شاد کے مختلف اصنافِ سخن پر حاوی ہونے کا لکھنا چاہتے ہیں۔ گو اس سے پہلے بھی انکے کمالات کا ذکر اس رسالے میں آچکا ہے۔ لیکن چونکہ مخزن کے ذرائع معلومات متعدد ہیں

اِس لئے یہ گوارا نہیں ہوسکتا کہ ناظرین ایسے باکمال کی زندگی کے زمانہ میں آپ کے بعض اوصاف سے ناواقف رہیں :-

۵۴ سال سے آپ دریائے ناپیداکنار تصنیف و تالیف کے شناور ہیں۔ اصنافِ سخن میں کوئی ایسی صنف نہیں ہے جس میں آپ نے مضامین جدید کے دریا نہ بہا دیئے ہوں۔ علاوہ مختلف قسم کی تصانیف کثیرہ کے جس میں رسائل فنِ معنی و بیان و موازنۂ مذاقِ شاعری اُردو زبان بازبان ہائے مختلف۔ امثلۂ اشعارِ اُردو و فنونِ عروض و قوافی و کُتبِ تواریخ و جغرافیہ و ناول وغیرہ کے تعلیم زبانِ عربی و فارسی و اُردو میں جو نصاب آپ نے تالیف کیا جس میں چھ کتابیں ہیں۔ کُتبِ مذکورہ کل ساڑھے تین برس کی پڑھائی ہے۔ اتنی ہی قلیل مدت میں نہایت آسانی سے بچے اُردو و فارسی (سب قسم کی عبارت کے ساتھ حتی بالفعل جو دربارِ ایران میں محاورے رائج ہیں) و عربی ایک فاضل جید کی طرح سے لکھ پڑھ لیتے ہیں۔ اصُول فقہ اور فقہ میں بزبانِ عربی آپ کا رسالہ یومیہ علےٰ مذهب الامامیہ ایک سو صفحوں کا (جسکو آپ نے ایک دن میں تالیف کیا ہے) مشہور ہے۔ صُورۃ الجنان آپ کا مشہور و معروف ناول ہے۔ جسکو آپ نے ۱۸۷۴ء میں جبکہ اردو زبان میں ناول کا نام نہ تھا تین جلدوں پر مشتمل تصنیف کیا۔ جسکی نسبت صاحب ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم نے یہ ریمارک کیا کہ اُردو زبان میں آج تک ایسی عمدہ کتاب تصنیف نہیں ہُوئی اور مصنف نے ایک لٹریچر پیدا کیا ہے وغیرہ وغیرہ۔ نظم میں جیسے آپ قادر الکلام اُستاد ہیں کچھ وُہی سخن سنج جانتے ہیں جنکو اتفاق آپ کے کل کلاموں کے سُننے کا ہُوا ہے۔ آپ کی قادر الکلامی کی ایک ادنیٰ مثال یہ ہے کہ مولوی محمد حسین صاحب آزاد نے آپ کی مثنوی 'نوید ہند' کی نسبت بہت سی تعریفوں کے ساتھ یہ کلمہ بھی تحریر کر کے چھپوا دیا کہ ایسی عمدہ نظم اس پاکیزگی زبان اس استعارہ اور دیگر محامد کثیر کے ساتھ نظر سے نہیں گذری۔ حضرت آزاد لکھتے ہیں کہ میں نے چاہا کہ نثر میں انہیں خوبیوں کے ساتھ ایسے مضامین ادا کروں مگر نہ ہوسکا۔ یہ ریمارک مشتہر تنہیر اتہ ( ) لکھنو

وغیرہ میں چھپا ہے۔ اردو زبان کی شاعری کے اصل مذاق کی حد قائم کرنے میں آپ نے بیس سال تک کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا۔ انگریزی و عربی و فارسی و بھاشا وغیرہ وغیرہ زبانوں کے انداز اور سب قسم کے مضامین کے تتبع میں آپ نے اُردو میں کثرت سے شعر نظم کیے۔ شعروں کے با اثر اور سلیس اور معنیٰ خیز بنانے میں خدا جانے کتنا ریاض کیا۔ محاوروں کی چھان بین میں اسداللہ خاں غالب مرحوم سے لیکر جناب اسیر و بحر و میر انیس و مرزا دبیر و میر مونس وغیرہ مشاہیر کملا سے برابر خط و کتابت رہی۔ چنانچہ آپ کے پاس اس کا بھی ایک ذخیرہ جمع ہے۔ اشعار غزل کی معنی خیزی کی اس سے زیادہ کیا دلیل ہوسکتی ہے کہ جناب مفتی سید عباس صاحب مجتہد سے شخص نے آپ کی غزلوں پر یہ ریمارک تحریر کیا کہ بجائے اوراد و نصائح کے مساجد و منابر پر پڑھنے کے لائق ہیں (حالانکہ بظاہر کل اشعار سلیس اور پیرایہ مجاز میں ہیں) آپ کا کلیات قریب نوّے جزوں میں ہے۔ ان سب تصانیف کے ذخیرے کو چھوڑ کر سب سے زیادہ حیرت انگیز و نتیجہ مشقت و ریاضات شاقہ آپ کے تصنیف کیے ہوئے مولود اور مراثی ہیں یہ تو سب کو معلوم ہے کہ میر انیس نے مرثیہ کے طرز میں جو احاطہ دل پسند کھینچا ہے اُس سے تجاوز دشوار ہے۔ مگر آپ نے حال کے زمانہ کے خیال کے مطابق ساتھ ویسے ہی رزم و بزم وغیرہ کے عجب مفید و دل کش انداز اختیار کیا ہے کہ سُنکر انسان متحیر ہو جاتا ہے۔ ۱۸۹۶ء میں آپ نے علیگڈھ مدرسۃ العلوم میں جو مسدس مولود پڑھا تھا آج تک سننے والے اس سے متاثر ہیں۔ چنانچہ اسی صحبت میں مسٹر آرنلڈ صاحب پروفیسر نے یہ فرمایا کہ ایسے عُمدہ فلسفی مضامینِ اسلام کے بارہ میں نظم میں سُننے نہیں گئے۔ آپ کے مرثیوں میں باوجود کثرتِ مضامینِ رزم و بزم و رخصت و بَین وغیرہ وغیرہ کے خلافِ فطرت و خلافِ واقعاتِ تاریخی و روایاتِ صحیحہ و خلافِ صبر و استقلال و شانِ اہلِ بیت اطہار ایک حرف بھی نظم نہیں ہوتا۔ باینکہ کثرتِ ریاضت و دوام امراض نے آپ کو ضعیف کر دیا ہے۔ لیکن ہزارہا آدمیوں کی مجلس میں جس شد و مد سے آپ تین تین گھنٹہ تک مجلسیں

پڑھتے ہیں۔ سننے اور دیکھنے ہی سے تعلق رکھتا ہے۔ جن سخن فہم سخن شناس بزرگوں نے سال گذشتہ اور اس سال کے محرم میں دسوں دن آپ کو سُنا اتّفاق سے اُن میں چند ایسے بھی بزرگ ہیں جنہوں نے اسی امام باڑہ میں برابر میر انیس مرحوم کو بھی سُنا ہے۔ اُن سب صاحبوں کا یہ بیان ہے کہ کسی طرح سے اور کسی حالت میں یہ مجلسیں میر انیس کی مجلسوں سے کم نہ تھیں۔ پُرانے حضرات تو اس سے کمال خوش ہیں کہ برخلافِ اُمّید پھر ہندوستان میں خدا نے میر انیس کو پیدا کر دیا اور نئے ذی علم بزرگواروں کو اسکا فخر ہے کہ اوّل تو اُنھوں نے ایسے شخص کو سُن لیا جسکے بارہ میں پُرانے حضرات ہُوبہُو میر انیس کی مثال دیتے ہیں۔ دوم مرثیوں میں خاصکر جن چیزوں کی ضرورت تھی وُہ کل محاسن ان مرثیوں میں پائے جاتے ہیں۔ جن بزرگوں نے معارف میں آپ کے مرثیہ کے بند ملاحظہ کئے ہیں اُنہیں سے پُوچھنا چاہئے کہ آپ کے مرثیوں کا کیا طرز ہے اور کیسے مضامین ہیں۔ اگر خدا نے چاہا تو ہم بھی مخزن میں کبھی کبھی آپ کے مرثیوں کے بند چھاپنے کا وقتاً فوقتاً فخر حاصل کرینگے۔ بہت مشکل ہے کہ زمانہ اب ایسے باکمال قادرالکلام فخرِ روزگار کو قوم میں پیدا کر سکے۔ اکثر اہلِ علم اور زبان دانوں کا قول ہے۔ چُنانچہ جناب مولوی سیّد محمد خانصاحب بہادر ڈپٹی کلکٹر و مجسٹریٹ نے جلسہ مسلم انسٹیٹوٹ کلکتہ میں اپنی تقریر میں یہ کلمہ فرمایا کہ جس شخص نے فی زمانا مولانا شاد کو نہیں سُنا اور آپ کے کمالات سے مطلع نہیں ہوُا اُسکو خود اپنے حال پر افسوس کرنا چاہئے۔ جناب میر خورشید علی صاحب مرحوم نفیس سے باکمال بزرگ نے آپ کی نسبت ایک مجلس میں یہ فرمایا کہ جس شخص نے اس باکمال کی زیارت کی اُسکو فخر و مباہات کرنا چاہئے۔ یہ بھی اُنھوں ہی نے ارشاد فرمایا تھا کہ حضرات! جناب والد ماجد (یعنی میر انیس مغفور) سے کسی طرح آپ کی زبان کم نہیں ہے۔ بلکہ جناب والد ماجد کو مرثیوں میں یدطولےٰ تھا اور آپکو ساتھ ایسے بے مثل مراثی کے قریب قریب کل اصنافِ نظم میں یدطولےٰ ہے۔ ایسے ایسے

فخرِ روزگار بزرگوں سے ایسی رائے حاصل کرنا نہایت نادر بات ہے۔ اور ہم مولنا شاد کو مبارکباد دیتے ہیں کہ انکو کاملوں سے دادِ سخن ملی ہے۔ ہماری آرزو ہے کہ کبھی وہ پنجاب میں تشریف لاویں۔ اور اہلِ پنجاب اُنکا کلام اُن کی زبان سے سُنیں:۔

قطعۂ فارسی

چنیں داد پندم یکے از حکیماں — جہاں دیدۂ بخرد و پختہ رائے
سفر کردن از موطنت شاد اَولے — نہ موطن بود بلکہ وحشت سرائے
چو اصطبلِ خر جملہ سُوقش پُر از گِل — بہ ہر کوچہ بنہادہ خروار لائے
حذر از سر اشیب و از گودِ راہش — اماں از غبارے کہ خیزد ز جائے
سفالینہ پوشش است ہر خانۂ اُو — دکاکینِ نَے بستِ اُو جاں گزائے
نہ باروح ویرانہ ہا و مقابر — نہ آبادیش را میسّر فضائے
ز بازار ہائے عفن مرگ خیزد — نشستہ بہر گوشہ ہائش وبائے
جوانے گرش اشتہا زور آرد — کند قُرصِ خورشید را ناشتائے
اگر رو بہ راہے نہد پیر از جا — جُز آہے بہ دستش نہ آید عصائے
نہ زیبا نگارے کہ زاہد فریبد — نہ خلوت نشینے نہ صورت نمائے
ز اموات گنگائے اُو آب شوئے — ز قاذورہ چہہ ہائے اُو شوربائے
نہ باغِ مُطرّا نہ راغِ مُہنّا — نہ عیشِ مہیّا کہ دارد بقائے
نہالانِ باغش گدایانِ مسکیں — نہ بر سر کلاہے نہ در بر قبائے
نہ منّت گزارے نہ احساں شناسے — نہ شُکرانۂ نے بہ لب مرحبائے
زبان آوراں را بہ لب ہجوِ مردم — سخن سازہا را بہ دِل افترائے
نہ سگ ہائے غوغا کنش را علاجے — نہ بہرِ نعیبِ کلاغش دوائے

نه دیبا نشینی کسی ز اهلِ دنیا — نه گسترده دیں طالبی بوریائی
نه نانِ کرم هائی شاں را نصیبی — نه خوانِ نعم هائی شاں را صلائی
ز رُکّانِ او هر یکی رو به راهی — نه شهری جهاز لیست نی ناخدائی
نه کهسار و تالاب بهرِ تفرّج — نه تازه عمارت نه کهنه بنائی
نه دلاّک[1] و قصّار و حمّام دروی — نه قنّاد و طبّاخ و نی نانوائی
نه صدر اعظمی نه مدار المهامی — نه قیصر نه هز آنر و ویسرائی
نهیقی اگر سر زند از حماری — جز احسنتَ اصلاً نه خیزد صدائی
نه راند کسی بر زباں جز ملامت — بر آرد اگر عندلیبی نوائی
بگفتم بدو هرچه گفتی مسلّم — نه رانم به لب حرف چون و چرائی
حکایت ز من پرس تا با تو گویم — ازیں کهنه دیرو ز دیرینه جائی
چو اُو پیر معموره کم بر آید — ز پارینه دفتر به آرم گوائی
همانا سه صد قرن عمرش سر آمد — بُود بانی اُو یکی نام رائی
شکست از جهاندا اُو خورد و برگشت — سکندر که بودست گیتی خدائی
ز اهلِ مذاهب یکی بودھ باشد — کزیں شهر ما کرد نشو و نمائی
مورّخ لک آرا به ها دید اینجا — ز لعلِ گراں آرزو بی غش طلائی
بهار است دار العلومِ هنوداں — که نامی بر آورده در ابتدائی
دهنتر حکیمی است از بومیانش — که بیدک بر آورده از فکر و رائی
ازیناں یکی ایجاد کردست شطرنج — که بشمرد فردوسیش از کیائی
ز پیریست احوالِ ایں شهر برهم — که سالم نه ماندست اُورا قوائی
به ضعفِ قوائش چه سازی ملامت — ز پیرانِ فرتوت آخر حیائی
چه رانم سخن از امیرانِ اینجا — که هر کس کریمی است و حاجت روائی

[1] اہلِ زبان دلاّک حجّام۔ قصّار دھوبی کو قنّاد حلوائی کو طبّاخ باورچی۔ اور نان وا نان بائی کو کہتے ہیں۔

تواضع ز اخلاقِ ہر کس ہویدا
تو گوئی کہ بنشستہ مسکیں گدائے

نہ استادہ میر غضب پیش روئے
نہ بنہادہ بر پشت خود متکائے

جفا پیشگی از لئیمان مسلّم
ولے از کریماں نہ بینی دغائے

ز گنگا چہ رانی سخن پیشِ رویم
گرہ بستہ در موج ہائش شفائے

کند رومی از شستنش زنگیاں را
عجب آب پاکیزۂ باصفائے

غبارِ رہ و گل زمیں ہائے موطن
بہ چشمِ حقیقت[1] بود توتیائے

چہ دُر ہا کزیں خاک بیروں نہ آمد
چو تحقیق و چوں بیدلِ[2] نکتہ رائے

چو راسخ[3] در اُردو زباں شیخ وقتے
چو فریاد[4] روشن دل و رہ نمائے

چو استاد ہنر سنج کامل عیارے
سخن دانِ دانش ور و خوش نوائے

صفاہان و شیراز در خانہ اش ہیں
بہ چشمِ حقیقت بکش توتیائے

عدالت شعارا جہاں سرفرازا
در اُردو رسیدست کارش بجائے

ز خیلِ تلامیذِ خود ہر یکے را
عطا کردہ است از فصاحت لوائے

بیا مدرسۂ* سیف خاں را نظر کن
مُصفّا تر از سینۂ پارسائے

عجب سبزہ زارے لبِ گنگ و دلکش
عجب مسجد و گنبدِ عرش سائے

ز منگلس تالاب از من چہ پرسی
بُود گلبنِ باغ اُو غم زدائے

اگر خانۂ** گرد بینی بگوئی
نہادست قدرت برارضے سمائے

ازیں خوبیِ موطنم نیز بگزر
بپا ہست زنجیرِ شرم و حیائے

غذا زندگی آورد آدمی را
ولے ناگوار است بے اشتہائے

[1] ملا علی تحقیق تخلص علی وردیخان مہابت جنگ مشہور صوبہ دار کے زمانہ میں ایک باکمال شاعر عظیم آباد میں تھے۔ [2] عبد القادر بیدل مشہور باکمال شاعر پٹنہ ہی کے تھے۔ [3] شیخ غلام علی راسخ خاص عظیم آباد کے رہنے والے۔ [4] جناب سید شاہ الفت حسین فریاد تخلص مصنف کے اُستاد پٹنہ ہی کے بےمثل و نظیر شاعر تھے۔ * مدرسہ سیف خاں پٹنہ میں مشہور جگہ ہے اور منگلس تالاب بھی مشہور سیر گاہ ہے۔ ** خانہ گرد گول گھر والا مکان ہے ۱۲

طلب تا نہ سازد از جامہ خیزم — کہ ہر جاست با من ہمیں یک خدائے
نہ نامم بتولیت سر تاج عالم — نہ بابم امیریت کشور کشائے
نہ من گلبن باغ شاہ شہیدم — نہ من رستم از شاخ زین العبائے
نہ خواہم کہ مردم بگویند آمد
بہ دیوزگی شاعرِ بے نوائے

دو تصویریں

جو آج زینتِ ورقِ اوّل ہیں ہمارے اُن کرمفرمائے مضمون نگاروں کی ہیں جن کے کلام اور مضامین سے اوراقِ مخزن بارہا فخر حاصل کر چکے ہیں۔ ایک تصویر حافظ سید فضل حق صاحب آزاد رئیسِ عظیم آباد کی ہے۔ ناظرینِ مخزن آپ کے کلام سے اکثر مستفیض ہو چکے ہیں اور آپ کے نام سے اسقدر آشنا ہیں کہ زیادہ تعارف کی ضرورت نہیں سمجھتے۔
دوسری تصویر جناب میرزا سلطان احمد صاحب اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر منٹگمری کی ہے۔ آپ کے اعلےٰ خاندان کا "پنجاب چیفس" میں خصوصیّت سے ذکر ہے۔ فلسفیانہ مضامین کے لکھنے میں جو شہرت آپ نے حاصل کی ہے۔ محتاجِ بیان نہیں۔ آپ کی عالمانہ قابلیت اور قوتِ استدلال مسلّم ہے۔ فنِ زراعت میں آپ کو خاص دستگاہ ہے۔ باوجود اپنے فرائض منصبی کی ادائیگی کے مضامین نگاری آپ کا خاص مشغلہ ہے۔ کئی ایک اخلاقی کتابیں آپ نے تصنیف بھی فرمائی ہیں +

طہران[۱]

ہمارے لطف فرمائے منشی ظفر علیخاں صاحب بی۔ اے نے ہز اکسیلنسی لارڈ کرزن صاحب بہادر بالقابہ کی بے نظیر کتاب "پرشیا" کا ترجمہ "خیابانِ فارس" میں سے ایک مضمون اقتباس کرکے ارسال فرمایا ہے جسکو ہم خوشی سے درج کرتے ہیں۔ اُمید کہ ناظرینِ مخزن کے لئے یہ مضمون باعثِ دلچسپی ہوگا۔

انجامِ کار چڑھ گیا میں اُس پہاڑ پر — پہلو پہ جس کے چھا رہا اک برف زار تھا
نکلا نہ تھا قمر ابھی اُس برج سے جہاں — آغوشِ آسمان میں سر کوہسار تھا
پھیلا ہوا پہاڑ کے دامن میں دُور تک — میدان و شہر و کوکبۂ شہریار تھا

(شیلی)

ایک قدیم اور جدید شہر ایران کے موجودہ پایۂ تخت طہران کا ذکر کرتے وقت سیاحوں نے بسا اوقات کسی قدر حقارت کے ساتھ کہا ہے کہ یہ شہر جدید ہے۔ جن معنوں میں ان مورخین نے لفظِ جدید کا اِستعمال کیا ہے (یعنی تاریخی معنوں میں)، اُن کے لحاظ سے

[۱] ابواب سابق کی طرح میں اس باب میں تصانیف متعلقہ طہران کا حوالہ نہیں دیتا۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ غیر ممالک کے قریب قریب تمام جنہوں نے ایران کا سفر کیا ہے پایۂ تخت میں آکر ٹھہرے اور اپنے زمانۂ قیام کے حالات بالتفصیل بیان کیا لہٰذا جن ناظرین کو مزید اطلاع کی ضرورت ہو وہ اُس ضخیم فہرستِ کتب کو دیکھیں جسے میں عنقریب شائع کرنے والا ہوں۔ لیکن واضح رہے کہ ایران کے دُوسرے پایۂ تختوں کے مقابلہ میں طہران کے حالاتِ مورخین نے بہت کم قلمبند کئے ہیں اور جو اطلاع اِس باب میں مندرج ہے اُس کا بیشتر حصّہ کسی دُوسری کتاب میں نہ ملیگا۔ اس مقام پر یہ کہنا بھی بیجا نہ ہوگا کہ طہران کی عام وجہ تسمیہ جس کے رُو سے اس کو طہارت کے مصدر سے مشتق سمجھا جاتا ہے غلط ہے۔ طہران ایک قدیم فارسی لفظ ہے جو اوّل اوّل ت سے لکھا جاتا تھا اور اُس کی ابتدائی شکل تیروں اور تیران بھی تھی جو رفتہ رفتہ بدل کر طہران ہو گئی +

یہ شہر کسی طرح جدید نہیں ہو سکتا بلکہ قدیم ہے۔ البتہ دُوسرے معنوں یعنی عمارتی مفہوم میں اس کو جدید کہا جا سکتا ہے۔ ایک صدی کا عرصہ ہوتا ہے کہ آغا محمد شاہ نے اس کی تجدید کی اور اس کے بعد اُس کے بھتیجے اور جانشین فتح علی شاہ نے بھی بہت کچھ ترمیم اور تبدیل کی۔ اور گذشتہ بیس سال کے عرصہ میں تو طہران کا عماراتی نقشہ اس قدر بدل گیا ہے کہ اُنیسویں صدی کے ابتدائی نصف حصہ میں جن لوگوں نے اسے دیکھا تھا وہ اگر اب آکر دیکھیں تو پہچان بھی نہ سکیں۔ اس دوگونہ تجدید کے واقعات پر نظر ڈالنے سے پہلے میں زمانہ گذشتہ کے قدیم الوضع اور فراموش شدہ (مگر با ایں ہمہ شانِ دلچسپی لئے ہُوئے) طہران کے کچھ حالات سپردِ قلم کرنا چاہتا ہوں۔

| عہدِ سلف کی شہادت | بعض لوگوں کا یہ قیاس ہے کہ طہران اور طازورا جو نقشۂ مرتبۂ شہنشاہ

تھیوڈوسیئں میں رَے کے قریب دکھلایا گیا ہے۔ دراصل ایک ہیں۔ لیکن نقشۂ مذکور میں جس رَے کا ذکر ہے وُہ خطۂ میڈیا کا مشہور شہر رَے نہیں بلکہ اسی نام کا ایک اور مقام ہے جو یزد کے قریب واقع ہے۔ ایسی حالت میں ظاہر ہے کہ طہران اور طازورا ایک نہیں ہو سکتے۔ بہرحال طہران کی ابتدا خواہ کچھ بھی ہو اس سے تو انکار نہیں ہو سکتا کہ ایک عرصہ دراز تک یہ ایک چھوٹا سا غیر معروف مقام رہا ہو گا کیونکہ الاصطخری اور مسعودی جیسے اُن تھک جُغرافیہ نگاروں نے جن کی سیاحی دسویں صدی پر روشنی ڈالتی ہے طہران کا ذکر نہیں کیا۔ حالانکہ پاس کے مقام رَے کے بہت کچھ حالات بیان کئے ہیں۔ طہران کا قدیم ترین حوالہ جس کی تردید نہیں کی جا سکتی۔ ابو عبداللہ یاقوت کے سفرنامہ مرقومہ سنہ ۹۰-۱۱۷۹ء میں درج ہے۔ طہران کے جو حالات اُس کے سفرنامہ میں مُندرج ہیں اور جن کی تصدیق متعدد ایرانی مورخین[1] نے کی ہے اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم اہلِ ایران وحشی تھے جو زمین دوز مکانوں میں رہتے تھے اور اپنی ہمسایہ قوموں سے لڑنے بھڑنے اور فرمانروائے وقت کے

---

[1] ان مورخین کے ناموں کی فہرست ایک یادداشت میں مندرج ہے جو موسیو لینگلے نے اپنے اہتمام سے مرتب کئے ہُوئے سفرنامہ چارڈن کی آٹھویں جلد کے صفحہ ۱۹۴ پر دی ہے ۱۲

خلاف بغاوتیں کرتے رہنے میں اپنا وقت گذارتے تھے۔ بہرحال طہران اپنی ندیوں اور باغوں کی وجہ سے بہت جلد مشہور ہو گیا اور ایک چھوٹی سی بستی سے ایک متوسط درجہ کے پُر رونق اور آباد شہر کی شکل میں بدل گیا۔ چودھویں صدی میں حمد اللہ اس کا ذکر کرتے ہُوئے کہتا ہے کہ یہ ایک وسیع اور بارونق شہر ہے اور آب و ہوا کی لطافت اور آبرسانی کی افراط کے لحاظ سے رَے پر ترجیح رکھتا ہے۔ ڈان رائی ڈی کلاویجو سفیر ہسپانیہ متعینہ دربار تیمور ۱۔ جولائی ۱۴۰۴ء کو یہاں قیام کر کے حسب ذیل رائے دیتا ہے جس میں مدح و ذم کے دونوں پہلو موجود ہیں[۵۷]:-

"طہران ایک بہت بڑا شہر ہے لیکن اس کے گرد فصیل نہیں اور ایک نہایت دلکشا مقام ہے جس میں سب طرح کی چیزیں موجود ہیں لیکن باشندوں کے قول کے مطابق یہاں کی آب و ہوا اچھی نہیں اور بخار اکثر پھیلا رہتا ہے۔"

معلوم ہوتا ہے کہ خاندان صفویہ کے دُوسرے فرمانروا شاہ طہماسپ نے سب سے اوّل طہران کو اپنا پایۂ تخت قرار دیا۔ لیکن شاہ عبّاس اعظم نے جو کثرتِ میوہ خوری کے باعث یہاں بیمار پڑ گیا تھا قسم کھالی کہ اب سے اس شہر میں کبھی داخل نہ ہو نگا۔ چنانچہ شاہ موصُوف نے صُوبہ و شہر طہران کی حکومت ایک خان کے تفویض کر دی۔

طہران کی حالت شاہ عباس کے زمانہ میں

شاہ عباس اعظم کے زمانہ میں کئی یورپین وارد طہران ہوئے۔ ان میں سے پٹرو ڈیلا ویلی اطالوی (۱۶۱۸ء) اور سر ٹامس ہربرٹ برطانوی (۱۶۲۷ء) کے بیان کردہ حالات ایسے عجیب و غریب ہیں کہ ناظرین کی ضیافتِ طبع کے لئے میں اس مقام پر اُن میں سے کسی قدر اقتباس کرتا ہُوں۔ اوّل الذکر کی حسب ذیل رائے کا مَتن ترجمہ

---

[۵۷] مُلاحظہ ہو "نیریٹو آف امبیسی" (داستان سفارت) مرتبہ مقلوط سوسائٹی صفحہ ۹۔ واٹس اپنی "ہسٹری آف پرشیا" (تاریخ ایران) کے صفحہ ۶۲ پر لکھتا ہے کہ ڈیلا ویلی پہلا یورپین تھا جس نے طہران کا سفر کیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس تاریخ کے لکھتے وقت واٹس کو کلاویجو کا علم نہ تھا ۱۲

سے ماخوذ ہے جو سفر نامۂ پنکرٹن میں مندرج ہے :-

"طہران ایک بڑا شہر ہے اور وسعت میں کاشان سے زیادہ ہے۔ لیکن آباد کم ہے اور مکانات بھی اس میں تھوڑے ہیں۔ باغ بہت بڑے بڑے ہیں جن میں انواع و اقسام کے میوے بہ افراط پیدا ہوتے ہیں۔ یہ میوے ایسے خوش ذائقہ ہوتے ہیں کہ قرب جوار کے علاقہ کے لوگ انکو ذوق و شوق سے منگواتے ہیں۔ خان بالعموم یہیں رہتا ہے۔ تمام کوچوں اور سڑکوں میں متعدد نہریں گذرتی ہیں جو باغوں میں پیچ کھاتی ہوئی بہتی ہیں اور انکی شادابی و زرخیزی کا باعث ہوتی ہیں۔ کوچوں اور سڑکوں پر اونچے اونچے شاندار درخت جنہیں ایران میں چنار کہتے ہیں سایہ افگن ہیں اور ان میں سے بعض درخت اسقدر موٹے ہیں کہ اُن کے تنے کو آغوش میں لینے کے لئے دو بلکہ تین آدمیوں کو اپنے ہاتھ پھیلانے پڑیں گے۔ ان کے علاوہ کوئی ایسی چیز نہیں اور نہ ایک بھی ایسی عمارت ہے جو قابلِ لحاظ ہو۔"

برطانوی سیّاح جس کے جذبات کی حرارت کو ماہرویان طہران کی گرمی حُسن سے تحریک پہنچی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ زیادہ تر خوش طبعی کی راہ سے حسبِ ذیل بیان کرتا ہے:-

"ٹائروں (طہران) ایک وسیع میدان کے وسط میں واقع ہے۔ مکان کچّی اینٹوں کے ہیں۔ شہر میں تین ہزار گھر ہونگے۔ جن میں سے ڈیوک اور بزر کے مکانات خوشنما ترین ہیں لیکن تعریف کا مستحق دونوں میں سے ایک بھی نہیں۔ بازار دو حصّوں میں منقسم ہے

سلہ اس کتاب کی جلد اوّل میں ایک مقام پر بتا دیا گیا ہے کہ یہ سیّاح (سر ٹامس ہربرٹ) فارسی ناموں کو انگریزی قالب میں لاکر انکی شکل ایسی بدل دیتا ہے کہ پہچانے نہیں جاتے۔ مثلاً طہران کو ٹائروں بادشاہ کو باٹ شا اور شاہ طہماسپ کو شاٹامس لکھتا ہے۔ ڈیوک اور بزر بھی اسی طرح کے بگاڑے ہوئے لفظ معلوم ہوتے ہیں۔ ممکن ہے کہ ڈیوک سے اس کی مراد کسی امیر سے ہو کیونکہ انگریزی لفظ ڈیوک امیر الامرا کا ہم معنی ہے لیکن بزر پر یہ گمان نہیں ہو سکتا۔ یہ ضرور کسی فارسی لفظ (شاید بازار) کی خرابی ہے (مترجم) ۱۲

اور کہیں سے چھپایا ہوا اور کہیں سے کھلا ہے۔ ایک نہر دو شاخوں میں منقسم ہو کر شہر کے اندر بہتی ہوئی درختوں اور باغوں کو سینچتی ہے جو اس عطیۂ عظمیٰ کے معترف ہو کر شکر کے ساتھ باغبان کی خدمت میں نذرانہ پیش کرتے ہیں۔ شہر کے مرد شاندار ہیں اور عورتیں صاحب جمال۔ اور دونوں میں کوئی نہ کوئی نرالی خصوصیت پائی جاتی ہے۔ لیکن مردوں کی بدگمانیاں عورتوں کو دائرۂ ضبط سے باہر قدم نہیں رکھنے دیتیں۔ با ایں ہمہ ان خاتونانِ پری جمال کا چلبلاپن جو ایک ذراسی جھلکی دکھاجاتا ہے تو آنکھوں میں بجلی سی کوند جاتی ہے[۵۱]۔

زمانۂ مابعد کے انقلابات

دورِ آخر کے فرمانروایانِ صفوی کے عہد میں طہران کو بعض دفعہ پایۂ تخت بننے کی عزت حاصل ہوئی۔ شاہ سلیمان نے یہاں ایک محل بنایا اور دولتِ عثمانیہ کے سفیر کو شاہ سلطان حسین کے حضور میں یہیں باریابی ہوئی۔ ٹورنیر ضمناً طہران کا ذکر کرتا ہے مگر معلوم ہوتا ہے کہ اپنی آنکھوں اُس نے اسکو نہیں دیکھا۔ چارڈن اسے صرف ایک چھوٹی سی بستی بتاتا ہے۔ افغانوں نے اپنے حملۂ ایران کے وقت اسکو مسخر اور غارت کیا۔ لیکن ہینوے اپنے سفرنامہ میں اس کا نام (طیہیران) اُن منزلوں میں درج کرتا ہے جنہیں وآں میر اپنے ۱۷۴۰ء میں مشہد تک طے کیا۔ طہران ہی میں نادر نے ہندوستان کی مہم سے واپس آکر تمام عُلما اور پیشوایانِ دین کی ایک مذہبی مجلس اس غرض سے منعقد کی تھی کہ ایک نئے قومی مذہب کی اشاعت کیجائے یہ یہیں اُس نے اپنے بیٹے رضا قلی خاں کی آنکھیں نکلوا ڈالیں اور اسی مقام پر وہ بیچارہ آخر کار قتل کر ڈالا گیا[۵۲]۔ کریم خاں زند نے

[۵۱] "تھامس ہربرٹ ٹریول" (چند سال کا سفر) طبع سوم صفحہ ۲۰۶۔

[۵۲] "ہسٹاریکل اکاؤنٹ" (حالات تاریخی) صفحات ۳۵۰ تا ۳۵۹ - "طیہیران ایک شہر ہے جس کے گرد گارے کی فصیل ہے۔ اس فصیل میں جابجا گول بُرج بنے ہوئے ہیں لیکن بہت بوسیدہ ہوگئی ہے۔ یہاں ہم کو سامانِ رسد بافراط ملا اور روٹی تو نہایت ہی مزہ کی تھی۔

[۵۳] جے۔ اے۔ آلیور۔ وایج "(سفر دریا) جلد پنجم۔ صفحہ ۴۱۸ و جلد ششم صفحہ ۴۷۔

موجودہ قلعہ کی عمارت میں اضافہ اور ترمیم کی۔ لیکن قلعہ میں زیادہ نہیں رہا۔ علی مراد خاں جب مازندران پر حملہ آور ہوا تو رستہ میں یہاں اُس نے مقام کیا تھا۔ اٹھارھویں صدی کے خاتمہ پر جب خاندانِ قاچار سریر آرائے ایران ہوا تو طہران کی سیاسی عظمت کا پہلا دور شروع ہوا۔

آغا محمد شاہ طہران کو اپنا پایۂ تخت بناتا ہے

خاندان قاچار کا مولد و منشا اور دار الحکومت استر آباد تھا۔ لیکن تخت و تاج کے نئے دعویدار آغا محمد شاہ کی روز افزوں اُمیدوں اور آرزوؤں کے مقابلہ میں یہ شہر مرکزِ دولت سے بہت ہٹا ہوا تھا، اور بعید ترین مشرقی گوشہ میں واقع تھا۔ کچھ عرصہ کے لئے جب تک کہ اُسے اپنی قوّت کی طرف سے اطمینان نہ تھا اور اُسکی حکومت عملی لحاظ سے صرف مازندران تک محدود تھی۔ اس نے مقام ساری میں بود و باش اختیار کی۔ لیکن جب اُس کی آرزوؤں کی نگاہ جنوب کی طرف پڑی اور ایران کی بادشاہت کا خواب محسوس شکل پکڑتا ہوا دکھائی دیا تو اُس کو ایک ایسے پایۂ تخت کی ضرورت محسوس ہوئی جس تک آسانی سے رسائی ہو سکے۔ چنانچہ اس مطلب کے لئے اس نے طہران کو پسند کیا جس کے پایۂ تخت قرار دیئے جانے کی تاریخ عام طور سے ۱۷۸۸ء شمار کیجاتی ہے۔ تخت کے دوسرے دعویداروں کا استیصال کہیں سات سال کے بعد جا کر ہوا۔ اور اُس وقت آغا محمد شاہ کی حکومت کو استحکام حاصل ہوا۔ مگر جس شہر کو شاید بنظر ضرورت پایۂ تخت بنایا گیا تھا۔ اُسی کے نام اقتضائے احتیاط کی طرف سے بھی قرعۂ انتخاب پڑا۔ جنوب میں بغاوت بالکل فرو کر دی گئی تھی۔ اور کچھ عرصہ کے لئے افغانوں کی قوّت ٹوٹ گئی تھی اور ان کی طرف سے مخالفت کا اظہار موقوف ہو گیا تھا۔ برخلاف اس کے غاصبِ تخت و تاج طہران سے بآسانی اپنی آبائی جاگیر اور اپنے قبیلہ کے لوگوں میں پہنچ سکتا تھا اور وہاں سے اپنے اُس ایک ہی دشمن یعنی روس پر جس کی طرف سے اُسکو حقیقت میں خوف تھا نظر رکھ سکتا تھا۔ انہیں خیالات نے جنکو موجودہ (اُنیسویں) صدی کے واقعات نے اَور زیادہ تحریک پہنچائی

ہے۔ آغا محمد شاہ کے جانشینوں کو اُس کے فیصلہ پر صاد کرنے کے لئے مجبور کیا ہے۔ اور طہران کے موقعہ کے خلاف میں خواہ کیسی ہی دلیلیں کیوں نہ پیش کیجائیں۔ لیکن احتمال قوی ہے کہ جب تک دولتِ ایران کا شیرازہ نہ بکھرے گا اُس وقت تک طہران برابر اُسکا پایۂ تخت رہیگا +

ظفر علی خان

بورڈ آف اگزامینرز

کلکتہ کے فاضل اور معزز سکرٹری جناب کرنیل رینکنگ صاحب نے مخزن کی نہایت عزت افزائی فرمائی ہے۔ انہیں وہ مضامین جو ان اوراق میں شائع ہو چکے ہیں۔ اسقدر پسند آئے۔ کہ اُنہوں نے اُن کا ایک مختصر سا انتخاب اپنے صیغے کے اعلیٰ امتحانِ اُردو پروفیشنسی کے لئے نصاب مقرر فرمانا تجویز کیا ہے۔ بورڈ موصوف کے چیف مولوی صاحب نے ہمیں کرنیل صاحب بہادر کی اس عنایت کی اطلاع دی ہے۔ اور مضامین کے چھاپنے کی اجازت طلب کی ہے۔ ہم نے بخوشی اجازت دی ہے اور ہم مضامینِ مخزن کا ایسے مفید مطلب کے لئے نصاب قرار پانا باعثِ افتخار سمجھتے ہیں۔ گو یہ پہلا موقعہ نہیں۔ کہ افسرانِ محکمۂ تعلیم کیطرف سے ایسی قدر شناسی اس رسالہ کی ہوئی ہو۔ اس سے قبل جناب مولوی شریف حسین صاحب بی۔ اے (مرحوم) نے قریب دو سال ہوئے۔ ہمیں اطلاع دی تھی۔ کہ انہیں بہ حیثیت ہیڈ ماسٹر نارمل سکول لکھنؤ۔ صوبجات متحدہ کے محکمۂ تعلیم کے لئے نیا نصاب اُردو تیار کرنے کی خدمت سپرد کی گئی ہو اور وُہ بعض مضامین مخزن میں سے لینا چاہتے ہیں۔ ہم نے انہیں بھی بخوشی اجازت دی تھی۔ معلوم نہیں وُہ انتقال سے قبل اپنے نصاب کو مکمل کر سکے یا نہیں۔ بہر حال یہ قدر شناسیاں قابلِ ذکر ہیں۔ کیونکہ ان سے معلوم ہوتا ہو کہ اعلیٰ طبقوں میں مخزن کی نسبت کیسی رائے ہے +

حکیم گلیلیو

اگرچہ گلیلیو کی سر برآوردہ ایجادوں کا ورثہ علم طبیعات کے ماہروں کو پہنچا ہو۔ اور اسکی قوائے عقلی کی نشو و نما کے متعلق معلومات منطقیوں اور فلسفیوں کے حصّہ میں آئی ہو۔ لیکن حکیم موصوف کی پُر از واقعات زندگی کی کامیابیوں اور مایوسیوں کے ایک طویل سلسلہ سے تو ایک معمولی شخص کو بھی دلچسپی ہو سکتی ہے۔ جہاں گلیلیو ایک طرف اپنی عالمانہ تحقیقاتوں کی وجہ سے دوستوں کی آنکھوں کا چراغ اور صاحبان دیہیم و تخت کا جلیس و مصاحب تھا۔ وہاں دوسری طرف اپنی روشنی طبع کی وجہ سے مذہبی پیشواؤں۔ اور چند معززین حضرات کے تیر ملامت کا آماجگاہ رہا۔ جنکی مخالفت کی وجہ سے اپنی عمر کا آخری حصّہ اسکو بندی خانہ کی چار دیواری میں بسر کرنا پڑا۔ لیکن یہ مصائب و آرام کے دن گو مقابلتاً عجیب معلوم ہوں کوئی متنفس بھی ایسا نہ پاؤ گے۔ کہ خواہ وُہ مطلق العنان تاجدار ہو یا صلح جو اور امن پسند حکیم جسکی زندگی میں انکا ایک خاص تناسب موجود نہ ہو۔

گلیلیو مقام پیسا ۱۵۔ فروری ۱۵۶۴ء میں پیدا ہوا تھا۔ اور اپنے تین بھائیوں اور تین بہنوں میں سب سے بڑا تھا۔ اس کا باپ ون سنز گلیلیو خود بھی ایک بزرگ پایہ حکیم تھا۔ چنانچہ موسیقی پر چند مشہور رسالے اس کی تصنیفات سے اب تک موجود ہیں۔

گلیلیو کی زندگی کا ابتدائی حصّہ دیگر علمی حکماء کی طرح کلوں کے پُرزوں اور اوزاروں کی ساخت میں صرف ہوا جسنے وُہ اپنا اور اپنی ہم جولیوں کا دل بہلایا کرتا تھا۔ لیکن یہ مشاغل اس کی دماغی ترقی میں حارج نہیں ہوئے۔ اور گو اس کا باپ غریب آدمی تھا۔ پھر بھی گلیلیو کو اس زمانہ کی مروجہ تعلیم پورے طور پر دلائی گئی تھی

فرصت کے وقت وُہ نقاشی اور مصوّری موسیقی سے دل بہلایا کرتا اور اوّل الذکر میں اس قدر ملکہ بہم پہنچا لیا تھا۔ کہ اُس کے ہاتھ کی تصویروں کی اُستادانِ فن تعریف کرتے تھے۔ آلاتِ موسیقی میں وُہ بانسلی خوب بجاتا تھا۔ ابتدا میں گلیلیو کا ارادہ مصوّری کو بطور ایک پیشہ کے اختیار کرنے کا ہوگیا تھا۔ لیکن باپ اور دیگر احباب کی صلاح یہ قرار پائی۔ کہ وہ علم طب پڑھے۔ چنانچہ ۵۔ نومبر ۱۵۸۱ء کو دارالعلوم پیسا میں داخل ہوگیا۔ موسیقی اور نقاشی کے اصُول سمجھنے کے لئے اسکو اقلیدس دیکھنی پڑی۔ اور اسی طرح ریاضی سے ایسی رغبت پیدا ہوگئی۔ کہ طب سے دِل اُچاٹ ہونے لگا۔ ریاضی کے ابتدائی رسالے دیکھنے کے بعد گلیلیو نے آرکی میڈیز کی تصنیفات کی طرف توجہ کی اور جن دنوں وُہ سارا کوزکی فلاسفر کے رسالہ کو جو اُس نے اِسی سائنس پر لکھا تھا مطالعہ کر رہا تھا۔ اُس نے خود بھی اس پر ایک بسیط مضمون جس میں آلہ ہائیڈراس ٹیٹکل بیلنس کی ساخت بتا کر یہ دکھایا ہے۔ کہ ہیرو نام بادشاہ کے تاج میں جو سُنار نے کھوٹ ملایا تھا۔ اسکو آرکی میڈیز نے کس طرح معلوم کیا۔ بہت شہرت حاصل کی۔ چنانچہ کارڈینل ڈی مونٹی کے توسّل سے جب ٹسکنی کی ڈیوک کو اس نوجوان حکیم کی لیاقت معلوم ہوئی۔ تو اس نے دارالعلوم پیسا میں گلیلیو کو ۱۵۸۹ء میں ریاضی معلم مقرر کر دیا۔ محتاج کی طرف سے اطمینان حاصل ہوا تو گلیلیو نے فلسفہ کی طرف توجہ کی۔ طالبعلمی کے زمانہ سے ہی اسکو ارسطو کے فلسفہ میں نقص سُوجھنے لگے تھے۔ اسکی ابتدائی تحقیقاتوں نے اس خیال کو اَور بھی پختہ کر دیا۔ اور ایسا ارسطو کے جرثقیل کے اصُولوں کو اس نے تجربہ کی کسوٹی پر رکھکر پرکھنا شروع کیا۔ بہت سی غلطیاں نکلنے لگیں۔ اور گلیلیو جو ارسطو کی حکمت کو اپنا جائز شکار سمجھے ہوئے تھا۔ اِس غیر معمولی کامیابی سے ایسا آپے سے باہر ہُوا۔ کہ نہایت جوش سے اپنے شاگردوں کے سامنے ارسطو کی فلسفہ کی دھجیاں اُڑایا کرتا۔ اُدھر ارسطو کے شاگردوں نے بھی اپنے اُستاد کی طرفداری میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا۔ اور تھوڑے ہی سے عرصہ میں

گلیلیو کے ایسے زبردست دشمن چاروں طرف سے اُٹھ کھڑے ہوئے کہ عمر بھر ان کے نرغہ سے نہ نکل سکا۔ ارسطُو کے علم جر ثقیل کا ایک مسئلہ ہے۔ کہ اگر دو مختلف اجسام کو ایک ساتھ کچھ فاصلہ پر سے زمین کی جانب چھوڑ دیا جائے۔ تو بھاری جسم زمین پر پہلے گریگا۔

گلیلیو نے اس اصُول کی مخالفت کی اور جب دلائل لانے میں قاصر رہا تو تجربہ کر کے ثابت کرنا چاہا کہ تمام اجسام کو کسی مقرّر بلندی پر سے ایک جیسی تیزی کے ساتھ گرنا چاہئے بشرطیکہ ہوا کی روک اُن پر مختلف طور پر اثر کر کے اُنکی رفتار میں کمی بیشی نہ پیدا کر دے۔ چنانچہ تجربہ کر کے اس نے اپنے دعوے کو ثابت بھی کر دیا۔ لیکن ارسطو کے شاگرد پھر بھی قائل نہ ہوئے۔

ان مباحثوں سے عداوت کی آگ زیادہ بھڑک اُٹھی۔ اور گلیلیو کو پیسا چھوڑنا پڑا۔ حُسن اتفاق سے انہی دنوں میں دار العلوم پیڈوا میں ریاضی کی مدرسی خالی ہوئی۔ جو ۱۵۹۲ء میں ۶ برس کے لئے گلیلیو کو ملگئی۔

ابھی یہ آسامی ملی بھی نہ تھی۔ کہ گلیلیو کے باپ کی وفات ہو گئی۔ اور تمام کُنبہ کا خرچ اس پر آپڑا۔ فرصت کے اوقات میں وُہ اپنا پُرانا شوق بھی نبھاتا اور آمدنی بڑھانے کے لئے نجی طور پر لڑکوں کو پڑھاتا معلوم ہوتا ہے کہ انہیں دنوں میں گلیلیو کاپرنیکس کے نظام کا قائل ہو گیا تھا۔ ۱۵۹۷ء میں اُس نے کیپلر کو ایک خط لکھا جس میں کہتا ہے۔ کہ میں نے کئی سال سے کاپرنیکس کے اصُولوں کو مان لیا ہے۔ لیکن ابھی اُن کے حق میں یا مخالفین کی تکذیب میں کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا ہُوں۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۵۹۳ء اور ۱۵۹۷ء کے درمیان کسی وقت وُہ محمولہ بالا فلسفہ کا طرفدار رہا ہوگا۔ اب گلیلیو کی شہرت تمام یُورپ میں پھیل گئی۔ نواب اور شہزادے لکچر سُننے کے لئے آتے اور اُس کی شاگردی کو اپنا فخر سمجھتے۔ ۶ سال کا معہُودہ عرصہ گذرنے کے بعد گلیلیو کے عہد کی ۶ سال کے لئے اور تجدید کر دی گئی۔ اور تنخواہ میں بھی اضافہ ہوا۔ ۱۶۰۶ء میں میعادِ ملازمت

پھر بڑھادی گئی - اور ۵۲۰ فلارنز مشاہرہ مقرر کیا گیا -

ان دنوں شہرت کا یہ عالم تھا - کہ سامعین کی کثرت کی وجہ سے جب مدرسہ طبیہ میں جہاں ۱۰۰۰ آدمیوں کے لئے جگہ کا انتظام ہو سکتا تھا - گنجائش نہ رہی تو میدان میں لکچر دینے شروع کئے - ہم اُوپر بیان کر آئے ہیں - کہ گلیلیو کا سب سے پہلا مربی گرینڈ ڈیوک او ٹسکن تھا - اور گو پیڈوا میں آنے کی بعد ملازمت کا تعلق اس خاندان سے نہ رہا تھا - پھر بھی وُہ تعطیلوں میں ہمیشہ فلارنز جاتا - اور ڈیوک کے خاندان کے لڑکوں کو ریاضی کی تعلیم دیا کرتا - ڈیوک کی وفات کے بعد جب اس کا بیٹا کاسمو جو گلیلیو کا شاگرد تھا - تخت پر بیٹھا تو اُن سے اپنے اُستاد کو پھر دار العلوم پیسا میں واپس بلالیا اور ۵۲۰ فلارنز کے بجائے - اِسی قدر کرادن مشاہرہ قرار پایا - سال بھر میں صرف ۶۰ دفعہ نصف نصف گھنٹہ کے لئے لکچر دینا پڑتا - گلیلیو کی خاص درخواست پر اب اس کا لقب پروفیسر ریاضی و فلسفہ قرار پایا - اسکی تصنیفات میں سے ۲ رسالے نظام عالم پر ۳ حرکت پر - ۲ جر ثقیل پر اور کئی ایک چھوٹے بڑے مضمون - آواز - گفتگو - روشنی - رنگ - فن جنگ وغیرہ - پر ان ہی دنوں کے لکھے ہوئے ہیں -

۱۶۰۹ء میں گلیلیو ایک دوست سے ملنے وینس گیا - یہاں اسے معلوم ہوا - کہ ایک شخص مسمی جان لیپرشی متوطن ڈنمارک نے ایک ایسا آلہ ایجاد کیا ہی جس سے دُور کی چیزیں پاس نظر آتی ہیں - پیڈوا سے واپسی پر اس نے بھی سوچنا شروع کیا - کہ وُہ آلہ کس اصول پر بنا ہوگا - آخر انوکاس کے اصول کے بنا پر گلیلیو نے بھی ایک آلہ تیار کیا - جس میں ہر شے اصلی شکل سے ۳ گنا بڑی معلوم ہوتی تھی - اس عجیب طلسمی شیشہ کا بڑا چرچا ہوا - لوگ جوق جوق اس تماشہ کو دیکھنے آیا کرتے - اب جو گلیلیو کو اصول معلوم ہو گیا تو اس نے زیادہ دوربین شیشوں سے تجربہ شروع کیا - یہانتک کہ ایک ایسا آلہ تیار کر لیا جس میں ایک چیز کو ۳۰ گنا بڑھا کر دکھانیکی طاقت تھی - اِس دُوربین سے اس نے اجرام سماوی کا مشاہدہ شروع کیا - او بہت سی نئی باتیں معلوم کیں - گو یہ مشاہدہ دلچسپی سے خالی نہ تھا لیکن گلیلیو کی بعد کی تحقیقاتوں کے سامنے کچھ وقعت نہیں رکھتا +

فیض الحسن

کانِ نمک

مدت سے سُنا کرتے تھے۔ "ہر چیز کہ در کانِ نمک رفت نمک شد"۔ مگر ہم نے تو ایک دفعہ جا کے دیکھا۔ نمک ہو جانا تو درکنار۔ ہم تو نمکین بھی ہو کر نہ نکلے۔ اور کچھ نہیں تو ملیحوں میں تو شمار ہو جاتا۔ شاید یہ اُس زمانہ کا ذکر ہو گا۔ جب کانِ نمک کھیوڑے والی کان کی طرح ایک باقاعدہ چیز نہ ہوتی ہو گی۔ جس کے اندر سڑکیں ہوں اور راستے ہوں۔ جس میں آدمی جا بھی سکے اور صحیح سلامت آ بھی سکے۔ جس میں داخل ہوتے وقت مشعل اور رہنما میسر ہو جائے اور جسے خوب دیکھ بھال کر تماشائی ڈیڑھ دو گھنٹے میں باہر بھی نکل آئے۔ کھیوڑا ضلع جہلم علاقہ پنجاب میں ایک مشہور مقام ہے۔ کیونکہ شمالی ہندوستان میں نمک کا بیشتر حصہ اسی مقام سے جاتا ہے۔ پنڈ دادن خاں ریلوے سٹیشن ہے۔ وہاں اُتر پڑے۔ تو آگے صرف اڑھائی میل کا فاصلہ ہے۔ گرد و نواح میں کوئی خصوصیت ایسی جس سے یہ معلوم ہو کہ اس سرزمین میں دستِ قدرت نے ایک ایسا قیمتی دفینہ رکھا ہوا ہے۔ نظر نہیں آتی۔ تھوڑے فاصلہ پر خشک اور بے گیاہ سے چٹان نظر آتے ہیں اور جس میدان سے آپ گذر کے جاتے ہیں۔ وُہ کچھ بہت شاداب نہیں ہے۔ ایک آدھ گھنٹے میں آپ کانِ نمک کے دروازہ پر آ پہنچتے ہیں۔ وہاں البتہ رونق نظر آتی ہے۔ سینکڑوں من نمک چھکڑوں میں لد کے باہر جانے کے لئے روانہ ہو رہا ہے۔ صدہا لوگوں کے لئے گذارہ کی سبیل بنی ہوئی ہے اور کانِ نمک کے گرد اُن مزدوروں اور اُنکے افسروں کی جو کان کنی پر مامور ہیں ایک معقول سی بستی آباد ہے۔ اور اُس سے کچھ دُور محکمہ نمک کے عُہدہ داروں اور اُنکے کلرکوں کے بنگلے اور مکانات نظر آتے ہیں۔ گویا اسی نمک کی بدولت جنگل میں منگل ہو رہا ہے۔ باہر تو جو رونق ہے سو ہے۔ ذرا اندر جا کر تو دیکھئے۔ آتشبازی موجود ہے۔ دام دیجئے

اور تھوڑی آتشبازی ساتھ لے لیجئے۔ اس کان کے اندر جاکر یہ نِری بازی نہیں رہ جاتی مفید اور کارآمد ہو جاتی ہے۔ کئی حصّے ایسے ہیں جن کا نام ظلمات رکھا جانا چاہئیے۔ وہاں مہتابی خضرِ طریقت کا حکم رکھتی ہے۔ داخل ہوتے ہی تاریکی اور نمی کا احساس ہوتا ہے۔ اور باہر کی کھلی ہوا کے مقابلے سے ذرا دم گھٹتا معلوم ہوتا ہے۔ مگر آپ اتنے میں ایک وسیع مربع حصّے میں کھڑے ہوتے ہیں۔ جہاں آپ دیکھتے ہیں کہ صدہا زن و مرد نمک کے بڑے بڑے ڈلے لاکر جمع کر رہے ہیں۔ کوئی ایک طرف آرام سے بیٹھ کر ناشتہ کر رہا ہے۔ گو اس ناشتے کی کل کائنات نانِ جویں اور آبِ خنک ہی ہو۔ کوئی ایک تاریک ذخیرہ میں سے نمک لانے کے لئے چراغ لئے جا رہا ہے۔ کوئی کسی کے دستے پر ٹیک لگائے سستا رہا ہے۔ کوئی اپنے ساتھی سے چھیڑ چھاڑ میں مصروف ہے۔ گویا زیرِ زمین ایک دنیا آباد ہے۔ یہاں سے نکل کر ایک دوسری طرف آئیے تو نمک کا ایک بڑا دالان آپ کے سامنے ہے۔ نمک نکالتے وقت کان کن اپنی کاریگری کے جوہر دکھاتے ہیں۔ چھت کی سطح دیکھو تو ہموار اور صاف ہے۔ اس کے نیچے ستون دیکھو تو سڈول ہیں۔ دیواریں ہیں تو خوبصورتی سے تراشی ہوئی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کسی سنگ سفید کے مکان میں کھڑے ہیں۔ یہ تمام کوشش محض خوشنمائی کے لئے ہی نہیں بلکہ اس سے کان کنوں کی حفاظت بھی مقصود ہے۔ اگر اندھا دھند اڑاتے چلے جائیں اور اوپر کے حصّے کو اتنا کر یدلیں۔ کہ بالائی سطحِ زمین کے نیچے ایک معمولی سا چھلکا نمک کی چادر کا رہ جائے تو ذرا سے صدمے سے چھت انکے سروں پر آپڑے۔ یہ سنگِ سفید کے کمرے جو اس کان کے نیچے جا بجا ہیں۔ کہیں کہیں مشعلوں اور چراغوں کے دھوئیں سے اور مزدوروں کے میلے ہاتھوں کے چھو جانے سے مائل بہ سیاہی ہو رہے ہیں۔ لیکن اگر کھیوڑے کے نمک کو اپنی اصلی شفاف بلورین حالت میں دیکھنا ہو تو کسی ایسے حصّے میں جاؤ جہاں اب نمک بارود کے ذریعے سے اڑایا جا رہا ہو۔ اس کے لئے آپ کو تا دیر انتظار نہیں کرنا پڑیگا۔

ایلو۔ وہ زور کا دھماکا ہُوا۔ کہ پاؤں تلے کی زمین ہل گئی۔ ناواقف تو یہ سمجھے کہ شاید کان پھٹ گئی اور اب باہر جانا دشوار ہو جائے گا۔ کہیں "نمک شد" ہی تو تقدیر میں نہیں لکھا۔ مگر یہ دھماکا یہاں دن میں کئی دفعہ سُنا جاتا ہے۔ جس حصّے سے نمک نکالنا ہوتا ہے۔ اُس میں ایک چھوٹی سی سرنگ لگا کر بارود بھر دیتے ہیں۔ جہاں بارود کو آگ پہنچائی وہیں نمک کا پہاڑ پھٹا اور منوں کی سلیں ٹُوٹ کر گریں۔ اس طرح سے آہستہ آہستہ ہاتھوں سے کوہ کنی کرنے کی ضرورت بھی نہیں رہتی اور کام بھی جلد ہو جاتا ہے۔ پھر مزدور آ کر اس نمک کو جمع کر لیتے ہیں اور اُس کے بعد ہاتھ کا کام شروع ہوتا ہے اور ہمواری ہاتھ کے ذریعہ پیدا کی جاتی ہے۔

اسی کان میں ایک دو حصّے ایسے ہیں۔ جو نہایت تاریک ہیں اور انکی تاریکی میں پانی کے بڑے بڑے قدرتی حوض چھپے ہُوئے ہیں۔ ان حوضوں کے کنارے کھڑے ہو کر مہتابی روشن کرو تو عجب کیفیت نظر آتی ہے۔ ان کو دیکھنے سے آبِ حیواں کی تلاش میں خضر کے زیرِ زمین جانے کے قصّے یاد آتے ہیں۔ افسوس کہ یہ آب آبِ حیواں نہیں۔ ایک معنے میں تو ہے۔ کہ اس پانی سے نمک پیدا ہوتا ہے۔ جس کے ساتھ کروڑوں بندگانِ خدا کی صحت اور لُطفِ زندگی وابستہ ہے۔ یہی تو مواقع ہیں جہاں صانعِ حقیقی کی رنگا رنگ صنعتوں کا گہرا نقش دل پر بیٹھتا ہے۔

اِس کان کی زیارت کے بعد دو خیالات زور سے میرے دل میں جاگزین تھے۔ اوّل تو یہ کہ علم طبقات الارض کتنا ضروری علم ہے اور اسکے ذریعے سے ہم کن کن نعمتوں کا پتہ لگا سکتے ہیں جو اسی زمین میں خُدا نے پنہاں کر رکھی ہیں۔ کہ متلاشی جستجو کرے اور پا لے۔ اور دُوسرے یہ کہ کتنے لوگ صُوبہ پنجاب میں اپنے صُوبے کے قدرتی دلکش منظروں سے واقف ہیں اور اُنکے نظارہ سے مستفید ہوتے ہیں۔ کئی سال ہُوئے مَیں نے یہ تماشا دیکھا تھا اور یہ نامکمل سی تصویر اس دلچسپ نظارے کی ایک دُھندلے سے

نقش سے جو صفحہ دل پر باقی تھا۔ اس لئے پیش کی ہو کہ اور دیکھنے والے جائیں۔ نظر غائر سے دیکھیں۔ اور اس سادہ ڈھانچ کو رنگین بنا دیں +

سرسری نظر

اُجڑا ہؤا گھر

معلوم ہوتا ہے کہ آج ہمارا گھر خالی ہے۔ اس کے دونوں کرایہ دار۔ زندگی اور خیال۔ ایک دم سے مکان کو چھوڑ گئے ہیں۔ اور ایسی سرعت اور لاپروائی سے کام لیا ہے کہ چلتے ہُوئے دروازہ اور کھڑکیاں بھی بند کرنی بھول گئے۔ گھر پر تو فدا نظر ڈالو تمام اندھیرا گھپ ہے اور کھڑکی میں بھی کوئی روشنی نہیں ہے۔ دروازہ پر جو دن بھر میں سو دفعہ بند ہوتا تھا اور سو دفعہ کھُلتا تھا۔ کوئی شور و غل نہیں۔ بس بھئی اب دروازہ تو بند کر دو اور کھڑکیوں کی چلمن ڈالدو۔ ورنہ گھر کی بے سر و سامانی اور اندھیرا ہم کو بے چین کر دیگا۔ چلو۔ میاں۔ اب یہاں کیا دھرا ہے۔ خوشی کا اب یہاں کچھ کام نہیں اور ہنسی مذاق بھی بند ہیں۔ یہ مکان مٹی ہے اور مٹی میں ہی مل جائیگا۔ اس کے مکین اب ایک عظیم الشان شہر میں جو یہاں سے بہت دُور ہے۔ ایک بے زوال محل میں فروکش ہیں۔ بھلا اب انہیں ہم سے کیا واسطہ۔ وہ ہمیں کب خاطر میں لاتے ہیں +

بشیر احمد (از لنڈن)

(ترجمہ)

مُبارکبادِ سفر

ہماری توجہ فرما جناب سرور جہان آبادی نے فرط محبت و وفور عنایت سے چند بند بسبیل مسدس بطور دعا ایک نجی خط میں لکھے ہیں اس مسدس کا تعلق جناب ایڈیٹر رسالہ مخزن کے سفر لندن سے ہے۔ ہم حضرت سرور کی اجازت سے شکریہ کے ساتھ چند اشعار یہاں نقل کرتے ہیں
(اسسٹنٹ ایڈیٹر)

پھریرے کو ہمت کے لہرانے والے　　جہازوں کی چوٹی پہ منڈلانے والے
سمندر کی موجوں کو ٹھکرانے والے　　مبارک ہو لنڈن پہنچ جانے والے
مبارک ولایت کا تجھ کو سفر ہو
سفر کے مقاصد سے تو بہرہ ور ہو

مُبارک ہوں یُورپ کی دلکش فضائیں　　مبارک ہوں لنڈن کی ٹھنڈی ہوائیں
یہ جھونکے کلی تیرے دِل کی کھلائیں　　یہ ٹھنڈی ہوائیں تجھے راس آئیں
مفید ان کا صحت پہ تیری اثر ہو
کہ آبِ بقا تجھ کو بحری سفر ہو

خدا کی حمایت نگہباں ہو تیری　　جو مشکل ہو مغرب میں آساں ہو تیری
جو کوشش ہو یارب نمایاں ہو تیری　　کہ بُو بنکے شُہرت پریشاں ہو تیری
ہر اِک انجمن کا قلاور بنے تو
ہر اک بحرِ فن کا شناور بنے تو

وطن کو تو فخرِ وطن بنکے آئے　　کہ یُورپ کا نقّادِ فن بنکے آئے
گلِ آرزو کا چمن بنکے آئے　　مرادوں کی تو انجمن بنکے آئے
ترا خیر مَقدم مبارک ہو سب کو
کہ شورِ ویلکم مبارک ہو سب کو

سرور جہان آبادی

کلامِ ثاقبؔ

جناب محمد احسن اللہ خاں صاحب ثاقب رئیسِ آگرہ خلفِ اکبر مولوی محمد نصر اللہ خاں صاحب بہادر صدر الصدور مرحوم کے نام نامی سے اہل ادب کے کان اور آنکھیں بخوبی آشنا ہیں۔ آپ اکثر فارسی ہی لکھتے ہیں اور ایسی لکھتے ہیں کہ حضرت امیر مینائی علیہ الرحمۃ والغفران جیسے بے نظیر اُستاد سے آپ نے دادِ سخن پائی۔ اس دفعہ آپ نے ایک غزل فارسی اور کچھ اشعار متفرق اُردو اور ایک غزل اپنی اہلیہ مکرمہ کی عنائت فرمائی ہے۔ ہم نہائت مسرت سے اس قابلِ قدر عطیے کو ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ آیندہ بھی جناب ثاقب کی شعاع توجہ سے نورچینی کا فخر ہم کو نصیب ہوا کرے گا:۔

دمے با عاشقِ شوریدہ طالع ساختی رفتی — ستمگر بیوفا آتش بجاں انداختی رفتی
نیاری اینکہ خوں ریزی دلستانی مرا دِل — چرا اے شیشہ دل شمشیر بر من آختی رفتی
نہ اشک آورد چشمانت نہ گل افشاند داما نت — سمندِ ناز بر خاکِ شہیداں تاختی رفتی
گرفتی ساغر از دشمن شکستی بر سرِ گورم — قیامت آمدی آتش بخاک انداختی رفتی
ندادی آں قدر فرصت کہ بوسم پا کشم داماں — ستادی پائے سروجوئے قدا فراختی رفتی
بیا اے نوبہاراں بیخودی افزائے میخوراں — دمے با لالہ و سرو و سمن پرداختی رفتی

کجائی آے نگارم اے انیسِ ثاقبِ محزوں
دو روزے با دلِ غمدیدۂ من ساختی رفتی

(والضّامنۃُ ماکتبۃُ فی وقتٍ من الاوقاتِ فی الریختہ)

ڈرتا ہے کہ جاگ اُٹھیں نہ دیوانۂ قامت — سر پر تیری کشتوں کی جو محشر نہیں آتا

نالوں میں گذر جاتی ہیں راتیں مری۔ ہمدم! رونے کے سوا کچھ مجھے دن بھر نہیں آتا
ہم جورِ شبِ ہجر سے کل تک نہیں بچتے گر آج بھی وُہ تُرکِ ستمگر نہیں آتا

جتنے فتنے ہیں دمِ رقص کھلے پڑتے ہیں آپ دیکھیں تو ذرا گوشۂ داماں کیطرف

مُنہہ محتسب کے کون خرابات میں لگے ثاقب ہوا یہ خوب کہ تم واں سے ٹل گئے

عالمِ تصویر ہے بزمِ بُتاں دل بھی اِک حیرت کا پُتلا چاہیئے
یہ کرشمہ یہ لگاوٹ یہ ادا ان حسینوں کو بھی دیکھا چاہیئے

خضر سے بھی نہ ہُوئے رہبرِ کوئے بقا آہ دھوکے میں رکھا راہنما نے ہم کو

کرلیا ساری خُدائی کو تو بندہ اپنا اور کیا چاہتے ہیں آپ خُدا ہو جانا
عشق میں بن نہ پڑی تجھ سے جو ثاقب کچھ اور مٹ کے خاکِ رہِ اربابِ وفا ہو جانا

از اہلیہ محمد احسن اللہ خاں صاحب ثاقب عفت تخلص

چاہت کا لُطف دل نے دکھایا نہیں ہنوز کنعاں کا ماہ خواب میں آیا نہیں ہنوز
ایمان کی تو یہ ہے کہ اُس لب کے سامنے عیسیٰ نے کوئی مُردہ جلایا نہیں ہنوز
قاصد جواب کے لئے کیا دُھوم پڑ گئی آنکھوں سے خطِ یار لگایا نہیں ہنوز
ہاں اے نگاہِ ناز اشارت کی دیر ہے جنگل کو عاشقوں نے بسایا نہیں ہنوز
مرنے کی ہے ہوس کسی خالِ سیاہ پر داغوں کو میرے دل نے جلایا نہیں ہنوز
وُہ شوخیاں کہاں ستم آرائیاں کہاں انداز جورِ چرخ نے پایا نہیں ہنوز
لبریز خوابِ ناز ہیں چشمانِ مے پرست فتنہ فلک نے کوئی اُٹھایا نہیں ہنوز
ہم مرگئے ہیں جس کے لئے وُہ ستم شعار دو پھول بھی مزار پہ لایا نہیں ہنوز
دیوانہ کیوں ہوا دلِ بیتاب خیر ہے برقع سے رخ پری نے دکھایا نہیں ہنوز
ساقی سے آنکھ لڑتے ہی یہ بیخودی ہُوئی ساغر بھی مَیں نے منہ سے لگایا نہیں ہنوز
بس بس خدا کے واسطے اے جوشِ اشتیاق تیری قسم میں آپ میں آیا نہیں ہنوز

گردوں[1] نے تجھ سا گوہرِ رخشندہ ہائے ہائے — غربت کی خاک میں تو ملایا نہیں ہنوز

ثاقب نے سیج ہے جان بہن تیرے ہجر میں — زانو ئے غم سے سر کو اُٹھایا نہیں ہنوز

عفّت غزل کہی نہ ملا پر مزا ہمیں
ثاقب کو کوئی شعر سُنایا نہیں ہنوز

برسات کا سماں

اس عنوان کی ذیل میں ہم وہ نظمیں شائع کرتے ہیں جو اس پُرلطف جنون انگیز موسم اور اسکے دلاویز نظاروں اور منظروں کے متعلق ہم کو پہنچی ہیں اُمید کہ آج کل کے موسم میں نظمیں خاص دلچسپی رکھینگی :-

غزل

برکھارت

جھوم جھوم آتی ہیں مستانہ گھٹائیں کیا کیا — رات دن چلتی ہیں جان بخش ہوائیں کیا کیا

دی ہے برسات کے جھونکوں نے نوید رحمت — ورنہ کیں خلق پہ گرمی نے جفائیں کیا کیا

آہ کوئل کی یہ تانیں یہ پپیہے کا الاپ — شورش انگیز جنوں ہیں یہ صدائیں کیا کیا

اُٹھتی ہیں سینکڑوں بے نام امنگیں اس میں — آگ سی دل میں لگاتی ہیں ہوائیں کیا کیا

برق کو دیکھ کے کیا دل پہ گھٹا سی چھائی — بجلیاں دل پہ گراتی ہیں گھٹائیں کیا کیا

آہ اے چاند! بہار دل پہ ہے تیرا جوبن — تو نے برسات سے سیکھی ہیں ادائیں کیا کیا

---

[1] اشارہ است بسانحہ تاب گسل رحلت خاتون محتشم ثاقب خستہ جان کہ درطرفۃ العین در عالم غربت و بیکسی در بہین نزدیکی بمقام جادرہ بعلتین شتافت ۱۲ ثاقب عفی عنہ۔

کج کلاہانِ گل و غنچہ کی سج دھج کیا خوب   جامہ زیبانِ چمن کی ہیں قبائیں کیا کیا

کس قدر گوہر و الماس بکھیرے نیرنگ
خسروِ ابر کی ہیں ہم پہ عطائیں کیا کیا

نیرنگ

برسات

حضرت داغ مدظلہ کا رتبہ عالی جو عشقیہ شاعری میں ہے اس سے ایک زمانہ واقف ہے۔ بلبلِ ہند نے اپنی شاعری کا موضوع زیادہ تر معاملہ ہی کو ٹھہرایا ہے۔ مگر کہیں کہیں متصوفانہ اور دیگر مضامین بھی بیان فرماجاتے ہیں۔ میر نذیر حسین صاحب ذیل کا قطعہ اُنکے ایک قصیدے سے اخذ کرکے ارسال فرماتے ہیں۔ جس سے ناظر اندازہ لگا سکتا ہے کہ حضرت داغ اگر اور طرف بھی توجہ منعطف فرمائیں تو سب کچھ کر سکتے ہیں:۔

چرخ پر چھائی ہیں اس طرح گھٹائیں کالی   جس طرح ہوں رُخِ معشوق پہ زلفیں برہم
ہے سیہ ابر میں اس رُوپ پہ بگلوں کی قطار   انجم کاہکشاں کی ہو لڑی جیسے بہم
کہیں بادل کی گرج ہے کہیں بجلی کی کڑک   کہیں بُوندوں کی پھواریں کہیں برسے چھم چھم
نعرہ مست کا بادل کی گرج میں انداز   نگہِ شوخ کا بجلی کی تڑپ میں عالم
پسلیاں اب نہیں دریا کی دکھائی دیتیں   خوب تن تن کے رواں ہونے لگو موجہ یم
کشتیوں میں کہیں جلسے ہیں چڑھے دریا کے   ہو رہی ہیں کہیں تیراکوں میں شرطیں باہم
شوخیٔ رنگ سی مہندی کے ہے فق رنگِ شفق   لالۂ باغ پہ ہے لال پری کا عالم
کہیں طاؤسِ چمن کی ہے نوائے دلکش   کہیں آتی ہیں پپیہوں کی صدائیں پیہم
ہے کہیں گل کی مہک تو کہیں بلبل کی چہک   کُوک کوئل کی ہے ارگن سے بھی خوشتر ہر دم

بھینی بھینی ہے وُہ خوشبو کہ معطر ہو دماغ ٹھنڈی ٹھنڈی وُہ ہوائیں ہیں کہ دِل ہو خرّم
بوسے لیتا ہے شگوفے کے شگوفہ کھِل کر شاخ سے شاخ گلے ملتی ہے کیا کیا باہم
روز ہر باغ میں ہیں گلبدنوں کے جلسے چندریاں ساڑیاں سُرخ اُس پہ ترشح کم کم
شور ہے قُلقُلِ مینا کا چلو آؤ پیو مغبچوں نے بھی مچا رکھی ہے کیا کیا اُودھم
ارض کو فوق سما پر ہے اِسی موسم میں کہ زمیں لوحِ زمرد ہے فلک ہے نیلم

داغ

بارش

چھم چھم کرتی جل تھل بھرتی نہریں بہاتی آتی ہُوں
ندی نالے سمندر دریا چشمے سب بھر جاتی ہُوں
جنگل بستی - بن اور گلشن میری نظر میں یکساں ہیں
شہروں - گانووں - دشت و جبل میں ہر جا آتی جاتی ہوں
رعدِ بلند آواز نقیب - اور برق مری اِک مشعل ہے
شور سے اُسکے ہوں چونکاتی روشنی اُس سے دکھاتی ہوں
کھیتوں کے حق میں ہوں میں امرت باغوں کے حق میں فضل و رحمت
قحط کی ہوں میں جانی دشمن اس کو فنا کر جاتی ہوں
ابر مرا گہوارہ ہے گویا - اور ہوا ہے اُڑن کھٹولا
اُمنڈ گھمنڈ جب آتی ہوں عالم میں حُسن برساتی ہوں
جھونپڑیوں - چوباروں - گلیوں - کوٹھیوں - بنگلوں قلعوں پر

فیض مرا ہے یکساں جاری سب کو خوش کر جاتی ہُوں
نخلستان و کوہستاں میں میرے ہی دم سے رونق ہے
جنگل میں ہُوں۔ منگل کرتی راغ کو باغ بناتی ہُوں
گرد ہُوں رُوئے آب کی دھوتی۔ بھرتی ہوں مُنہ سیپ کے موتی
معدنی اور نباتی دُنیا کو پروان چڑھاتی ہُوں
یخ اور برف کہر اور پالا سارے میرے کرشمے ہیں
کثرت میں وحدت کا تماشا اہلِ نظر کو دکھاتی ہُوں
بحثِ "تناسخ" حل ہُوں کرتی گویا ہوں جی جی کر مرتی
بھاپ سے ہُوں میں پانی بنتی بھاپ ہی پھر بنجاتی ہُوں
قوسِ قزح اِک مری ادا ہے اور آئینۂ مہر نما ہے
سُورج ہو جب میرے مقابل اُس کا رنگ اُڑاتی ہُوں
صُوفی کو فطرت کا صحیفہ - عاشق کے لئے یار کا جلوہ
چشمِ حقیقت بیں کو دریا اِک قطرے میں دکھاتی ہُوں
محنت کش ہیں والہ و شیدا عیش پرست مرے دلدادہ
بادہ کشوں کی رُوح رواں ہُوں اُنکو خوب چھکاتی ہُوں
شاہ و گدا راجہ اور پرجا میرے دست نگر ہیں ہمیشہ
زیرِ فلک کُل اہلِ زمیں کی آرزوئیں برلاتی ہُوں

سیّد علمدار حسین (ہنوڑی)

برسات کی بہار

بادل اُٹھے وُہ جھوم کے ساقی کِدھر ہے آ
پہلو میں اپنے اس گھڑی مطرب پسر ہے آ

بلبل خوشی میں کھولے ہوئے آج پر ہے آ
دہانی لباس پہنے ہوئے ہر شجر ہے آ

غنچے بھی ہیں کھلے ہوئے ٹھنڈی ہوا بھی ہو
بُوندیں بھی پڑ رہی ہیں چمن میں فضا بھی ہو

بالائے کوہ اُودی گھٹا کی بہار ہے
چشمہ اِدھر رواں ہو اُدھر شاخسار ہے

کیا خوشنما کجھُور کی دیکھو قطار ہے
پانی میں کائی رشک دہِ سبزہ زار ہے

چوپائے چڑھ رہے ہیں چری کو پہاڑ پر
دس پانچ چر رہے ہیں اِدھر پانچ چھ اُدھر

دیکھو نکل کے تم شبِ تاریک کا سماں
ملتا نہیں سُراغِ ثریا و کہکشاں

کالی گھٹا ہے چھائی ہوئی گردِ آسماں
رہ رہ کے زور زور سے آتی ہیں بُوندیاں

جگنو سے نخل یُوں ہیں درخشاں بہار میں
روشن ہوں شمعیں جیسے زمرد کی جھاڑ میں

کالی گھٹا وُہ آتی ہے مستانہ وار۔ دیکھ
بگلوں کی اُونچے اُونچے شجر پر قطار۔ دیکھ

گلہائے باغ و قوس و قزح کی بہار۔ دیکھ
ہیں زرد پھول مثلِ گلِ زر نگار۔ دیکھ

کب ہیں یہ سبزہ زار میں آہو کھڑے ہوئے
نرگس کے پھول ہیں یہ روش پر پڑے ہوئے

دلچسپ کیا ہی سبزہ صحرا کی ہے بہار
کیا پُر فضا ہے جلوہ خوش رنگِ لالہ زار

فرشِ زمردیں کو جو اُس پر کروں نثار
اِسپر فدا ہو دستِ تر یاقوت لاکھ بار

توصیفِ شانِ قدرتِ صانع ہو کیا بیاں

دریائے سُرخ و سبز کو یکجا کیا رواں

بادل کی وہ گرج ۔ وُہ گھٹا اور بادِ سرد　　وُہ سبز سبز نیم کے پتّے ثمر وُہ زرد
لالہ وُہ جس سے لعلِ بدخشاں ہو گرد گرد　　سوسن بھی وُہ کہ جس سے ہو شرمندہ لاجورد
اودی گھٹا میں بجلی کی رہ رہ کے وُہ چمک
مہندی کی پھُولوں اور گلِ تر کی وُہ مہک

غافل کدھر ہے گورِ غریباں کی سیر کر　　دھنس دھنس گئی ہیں قبریں ذرا اِک نظر اِدھر
جھک جھک پڑی ہیں نیم کی شاخیں ٹھُنٹی دھڑ پر　　تھے اہلِ قصر جو یہ انہیں کا ہے دیکھ گھر
اُمّیدِ گریہ صرف ہے ابرِ بہار سے
سبزہ وفورِ غم میں ہے لپٹا مزار سے

لٹکے ہُوئے ہیں جھُولے درختوں میں جا بجا　　ہیں سبز پوش آج حسینانِ مہ لقا
بارش جو ہو گئی ہے تو کچھ سرد ہے ہوا　　ساقی کدھر ہے جامِ زمرّد میں پھُول لا
چھائی ہُوئی ہے کالی گھٹا ایسے شان سے
سارے پہاڑ رِل گئے ہیں آسمان سے

شب کو ہے ابر و باد میں دریا یہ کب دِل　　موجیں ہیں شکلِ گیسوئے لیلائے شب عیاں
گرداب پر اندھیرے میں ہے خال کا گماں　　کالوں کی طرح کالی ہیں پانی میں مچھلیاں
بیڑے کو میرے پاٹ کا ملتا پتا نہیں
اے برق المدد کہ کوئی ناخدا نہیں

کھُل جائے ابر دھُوپ کی تب دیکھئے بہار　　ہے ۔ آب ۔ آبِ زر ۔ تو ہے ہر برگ زرنگار
ہے شاخسارِ نُور کہ اشجارِ کوہسار　　گلہائے باغ صُورتِ اختر ہیں آبدار
کب گھانس پر ہیں قطرۂ نیساں پڑے ہوئے
تختِ زمرّدیں میں ہیں موتی جڑے ہُوئے

میدان میں وہ کوئل کی گونجی ہوئی صدا — وہ بوندیاں وہ برف کی ڈوبی ہوئی ہوا
چشمہ وہ اردگرد وہ کہسار جا بجا — بادل کی وہ گرج وہ بڑے زور کی گھٹا

دل سے سماں یہ عرش کبھی بھولتا نہیں
کب گلشنِ خیال میں اپنے فضا نہیں

عرش

ابرِ بہار و فراقِ یار

اِس نظم کا خاکہ تُلسی داس جی کی رامائن کے اُس مقام سے لیا گیا ہے جہاں اس خدا رسیدہ مصنف نے سیتا جی اور رام چندر جی کا برسات میں ایک دُوسرے سے جُدا ہونا بیان کیا ہے۔ تُلسی داس جی کا رنگ اَور ہے اور حضرت طالب کا ڈھنگ اَور۔ مگر توضیحاً اِس قدر اشارہ کرنا ضروری سمجھا گیا۔

زہے اکرامِ یزدانی۔ زہے افضالِ ربّانی — زمیں پر کی ہے ابرِ قطرہ زن نے گوہر افشانی
بساطِ سبزۂ گلشن ہے یا مخمل ہے کاشانی — لباسِ گل۔ کسی معشوق کی پوشاک ہے دھانی
کھنچا ہے بامِ گردوں پر سحابِ تر کا دل بادل — اوڑھادی مہر و مہ کو ابر کی چادر نے بارانی
جوانانِ چمن شاداب ہو کر لہلہاتے ہیں — ہوائے خودسری میں سرگراں ہے سروِ بستانی
کسانوں کا کلیجہ ہو گیا ٹھنڈا تقاطر سے — کہ ڈالا ابرِ تر دامن نے سوکھے دھان میں پانی
بڑھا دی اور حرصِ میکشی۔ اُٹھ کر گھٹاؤں نے — ہمارے خشک زاہد کے وضو پر پھر گیا پانی
بہت ملتا ہے ہر برگِ شجر سے بابِ احساں کا — گلستاں میں رقم ہے بوستاں باخطِ ریحانی
چراغوں پر پتنگے جھک پڑے جل جل کے اُلفت میں — لگا دی آگ ابرِ تر نے۔ بھڑکا سوزِ پنہانی

لرز اُٹھے ہوائے سرد سے عُریاں بدن مفلس — بجایا۔ رعد نے آواز سے کوسِ زمستانی
فلک پر ابرِ باراں ہی زمیں پر تخم ریزی ہے — عجب یہ آب و دانہ ہی کہاں دانا۔ کہاں پانی!
بتادی ہی ہوا گرمی کو بادِ برشکالی نے — عرق کے ڈوب[۱] پر بھی آجکل کیا پھر گیا پانی!
زہے قدرت عجب ابرِ کرم کی آبیاری ہے — لطافت کی ہی ارزانی طراوت کی فراوانی
وفورِ آب سے ہر تختۂ گلزار کا چشمہ — بنا مُرغابیوں کے واسطے تختِ سلیمانی
بنے ہیں بیل ہلوا ہے خیالِ قلبہ رانی میں — جُٹتے[۲] ہیں جو تنے بونے میں سادہ لوح دہقانی
کبھی ابرِ سیہ کی تیرگی میں ہی سیہ مستی — کبھی ہی چاندنی کے کھیت سی ہر کشتِ نورانی
اب ایسے میں ہلالِ آسماں کی جلوہ افروزی — برائے عاشقِ مہجور ہے تیغِ صفاہانی
عروسک[۳] ہیں عروسِ لالہ پیکر۔ جنکی غیرت سی — عجب کیا خُون تھو کے کان میں لعلِ بدخشانی
خس و خاشاک سی یُوں پاک ہی سطحِ زمیں اکثر — مجازی سی کنارہ کش ہو جیسے مردِ حقّانی
سحابِ تازہ رُو اس طرح ہر جا قطرہ زن آیا — ملے ایک مردِ صالح جیسے سب سے خندہ پیشانی
زمیں کو یُوں طراوت دے رہا ہے ابرِ پُرمایہ — سخی کرتا ہی گویا صاحبِ حاجت کی مہمانی
بضاعت پاکے نو دولت کا تھوڑی میں اُبل پڑنا — دِکھا دیتی ہی ہر چھچھلے ندی نالے کی طغیانی
پیادہ پا مُسافر اس طرح لت پت ہیں کیچڑ میں — مہوّس جس طرح پابند لذّت ہائے نفسانی
تخالف میں ہی مہر و ابر کے اوقات ان روز و ل — تلوّن طبع اکثر جیسے ہوں آرائے سُلطانی
ہری گھاسوں میں یُوں پنہاں ہُوئی ہیں راستی ہر جا — چھپاتی مہرِ دانش جس طرح سے۔ ابرِ نادانی
خرامِ نازِ سیل اَب بھی وُہ چال چلتا ہے — نہیں رہتا ہے جیسے ایک جا معشوقِ سیلانی
ہُوئی ہی کثرتِ روئیدگی بارانِ رحمت سے — زیادہ علم سے ہوتی ہی جیسے عقلِ انسانی
زمینِ شور میں بیفایدہ ہے تجربہ باری یُوں — نصیحت جس طرح اہل کے دل کی دشمنِ جانی
چمک جاتی ہی بجلی کوئی دم اس طرح ظلمت میں — گذر جاتی ہی دورِ خواب میں جوں عمرِ انسانی

[۱] ڈوب بروزن جوب بمعنی پسینے کی دھار ۱۲ [۲] یعنی مصروف ہیں ۱۲ [۳] بیر بہوٹی ۱۲ طالب

بھرے بادل جھکے پڑتے ہیں ایسے خاکساروں کے کہ جیسے منکسر دکھلا رہا ہو کسرِ نفسانی
اُمنڈ کر ندیاں ملتی ہیں یُوں دریائے اعظم سے میسر جس طرح ہو باحسنہ اکو وصلِ ربانی
ندی نالوں میں پانی رفتہ رفتہ جمع ہوتا ہے اکٹھا جس طرح ہو جزرسی سے گنجِ پنہانی
ہوا کے زور سے اشجارِ گلشن یُوں اکھڑتے ہیں کہ جیسے ناخلف سے ہو کسی کُنبے کی نقصانی
پپیہے مور نکلے شور کرتے صحنِ گلشن میں صدائے لحنِ داؤدی ہے کوئل کی خوش الحانی
پرندے اس طرح ہیں چہچہہ زن ذکرِ قدرت میں تلاوت جس طرح زاہد کرے آیاتِ قرآنی
اِس عالم میں بگڑ بیٹھے تم اپنے یار سے طالب! یہ کی اے یار میرے تم نے دانائی کہ نادانی
جب اُٹھا ابر یادِ خال میں آنسو نکل آئے خیالِ زلفِ برہم میں ہوئی دل کو پریشانی
نکل کر مہر - کیونکر آگ کا شعلہ نہ بن جاتے نہیں پہلو میں جب اپنا وہ رشکِ ماہِ کنعانی
شبِ فرقت میں آئے شمع پر جسوقت پروانے تو ہم سمجھے کہ گھر میں آگیا غولِ بیابانی

غرض اپنے کئے پر آپ پچھتا کر - یہ کہتے ہیں
"چرا کارے کند عاقل کہ باز آید پشیمانی"!

طالبِ بنارسی - از بمبئی

آمدِ بہار

للہ الحمد پھر بہار آئی مُرغِ گلشن ہیں محوِ زیبائی
فرش مخمل ہے سبزہ خوابیدہ ٹہنی ٹہنی ہے وقفِ رعنائی
صحنِ گلشن ہے زینتِ فردوس پتے پتے میں تازگی آئی
چل رہی ہے نسیمِ رُوح افزا بھینی بھینی چمن سے بُو آئی

دے دیے چار چھینٹے شبنم نے — ہنس پڑی جو کلی تھی مُرجھائی
پُھول شوخی سے مسکراتے ہیں — دیکھئے بلبلوں کی بن آئی
اِک طرف بید کی لچک پہ لچک — اِک طرف سرو کی صف آرائی
اِک طرف جوہی کی لپٹ پہ لپٹ — اِک طرف بیلی کی خود آرائی
موتیا کا ہے اِک طرف تختہ — جس کی نکہت ہے خود تماشائی
وہ پپیہے کی پی کہاں کی صدا — نغمہ زن عندلیب شیدائی
دیکھئے مست ہو کے کبک دری — چال چلتی ہے کیسی اٹھلائی
دے رہی ہے نسیم بھی تھپکی — شاخِ گل لے رہی ہے انگڑائی
جوبنوں پر عروسِ گلشن ہے — اور غنچوں میں نازِ یکتائی
پُھولوں کی بھینی بھینی خوشبو سے — جانِ مُردہ نے تازگی پائی
بوٹے بوٹے پہ وجد کا عالم — خامشی گویا ان کی گویائی
عرش سے لیکے فرشِ خاک تلک — محوِ حیرت ہیں سب تماشائی
پتے پتے سے معرفت ہی عیاں — ایک دفتر ہے گل کی رعنائی
اِک ڈراما ہے بلبلوں کی چہک — اِک تماشا ہے گل کی زیبائی
کہہ رہی ہے کچھ اَور ہی باتیں — باغ میں جو کلی ہے مُرجھائی
طُرفہ تر ہے نصیحتِ گل چیں — باغبانوں کی زینت افزائی
کُھل گئی تھیں جو راز کی باتیں — مرحبا! مرحبا! بہار آئی
مُژدہ اَے طالبانِ راہِ کمال — نُورِ حق کی جھلک نظر آئی
حسنِ باطن ہے جلوہ آرا آج — آئیں۔ دیکھیں کہاں ہیں شیدائی
وقت اچھا ہے حق شناسی کا — کسکو مطلوب ہے شناسائی
گُمرہانِ منازلِ مقصود — وُہ جرس کی سُنیں صدا آئی

اپنے مطلوب سے ملیں کھُل کر — شاد ہوں اب مُراد برآئی

محمد فخرالدین خان عاجز بھاگلپوری

برکھارت

مُبارک جھُومتی برکھارت آئی — عجب پیاری گھٹا گھنگھور چھائی
برستی اور گرجتی فوج لیکر — فلک پر بادلوں نے کی چڑھائی
لگی ہونے بکثرت گولہ باری — دَنادَن توپ کی آواز آئی
مقابل رُوس کے پورٹ آرتھر پر — ہو جیسے اہل جاپاں کی چڑھائی
دکھائی برقِ تاباں نے جو جہتاب — چھُٹی خورشید کے مُنھہ پر ہوائی
رہا کچھ دیر ششدر شاہِ خاور — حرارت آگئی تیزی دکھائی
چڑھایا آسماں کو سان پر جب — تو دیدی اُسکو نیلم کی صفائی
مگر اتنی کہاں ہمّت کہاں تاب — گھٹا ٹوپ اک دیا لشکر دکھائی
ہوا کوندہا تو آنکھیں تلملائیں — کلیجہ ہلگیا وحشت سمائی
چھپاتے بن پڑا پردہ ہی میں مُنھہ — جو دیکھا فوج ہر سو سے گھر آئی
حکومت شاہِ گردوں کی گئی چھن — عملداری ہوئی دم میں پرائی
ڈھنڈورا پیٹ گیا از غرب تا شرق — ہے اب برسات کی فرمانروائی
لُٹایا ابرِ رحمت نے خزانہ — مُرادِ اہلِ دل دم میں برآئی
دیئے نخلِ چمن کو خلعتِ نو — قبا خوش رنگ پھولوں کو پہنائی
ہوئے شاداب گُل بوٹے چمن کے — عجب قدرت نے بخشی خوشنمائی

کھلا گیندا - ہزارا کھلکھلایا	بگل کیلوں نے پھونکا باصفائی
گرہ چوٹی کی سنبل نے جو کھولی	دھڑی ہونٹوں پہ سوسن نے جمائی
گلِ شبّو نے طرفہ گل کھلایا	کہ پھر چمپا کلی بھی مسکرائی
کھلے گل - چاندنی باغوں میں پھیلی	چھٹی مہتاب کے منہ پر ہوائی
جڑاو آرسی سورج مکھی نے	عروسِ باغ کو دی رونمائی
بنے گل جب کرن پھول اِک ادا سے	اِدھر پھر شاخ پیچاں لونگ لائی
بہار آئی کنول نہروں میں پھولے	خودی سے بیخودی بھنوروں پہ چھائی
چلیں ٹھنڈی ہوائیں اس طرح سے	ہوئی غش قدرتی معجز نمائی
ہوئے جب مرغ خوش الحاں غزلخواں	صدا دی بانسری کی سی سنائی
پپیہوں نے اُدھر پی پی پکارا	صدا کو کو کی کوئل نے لگائی
اِدھر نقّارہ پر دی ابر نے چوب	اُدھر جھنکار جھینگر نے لگائی
جو پر پھیلا کے بن میں مور ناچے	فلک پر کی شفق نے خوشنمائی
ہوئی خلق خدا مسرور از بس	ہر اک دِل پر گھٹا عشرت کی چھائی
گھٹائیں بڑھتے ہی چمکا ستارا	عجب جگنو نے کی جلوہ فزائی
کسانوں نے خوشی سے دھان بوئے	ہری کھیتی ہوئی امّید پائی
بہا کھیتوں پہ کیا آبِ زمرّد	جھڑی جب ابرِ رحمت نے لگائی
ندی تالاب چشمے جھیل دریا	بھرے ایسے ہوئی گھر گھر ترائی
ندی نالوں نے ایسا زور باندھا	ہوئے کافور امراض و بائی
انوکھی چھب نرالی دھج بنائی	عجب انداز سے برکھا رت آئی
اُڑی ہر سو بھنبیری ساون آیا	ہوا مشرق کی جانب سنسنائی
چھپائیں ابر میں تاروں نے آنکھیں	شبِ مہتاب تجلی بن کے آئی

خجل ہے جس کے آگے مینا کاری
وُہ ہے خوشرنگ دیواروں پہ کائی

حسیں باغوں میں جھُولا جھُولتی ہیں
ہرا کرتی ہے دل نغمہ سرائی

ہنڈولوں پر ہنڈولے گا رہے ہیں
بُتانِ خوبرُو با خوشش نوائی

لگاتا ہے ملاروں کی کوئی تان
دکھاتا ہے کوئی دستِ حنائی

گہر اِس قدرتی منظر کا لکھ سال
اُمنڈتی جھُومتی برکھارت آئی

۲۵ ۱۸ شاکی

خاتونِ عالم

تماشائے اہلِ نظر بن گئی تُو
خُدا ہیں نگاہوں کا گھر بن گئی تُو

نہ تھی اس جہاں میں تو تھی حورِ جنّت
زمیں پر اُتر کر بشر بن گئی تو

ترے دم سے قائم ہُوا نظمِ عالم
زہے شان۔ کانِ ہنر بن گئی تو

تری ہر ادا۔ لذّتِ بے نہایت
حلاوت میں قند و شکر بن گئی تو

مسخّر کیا جس کو دیکھا نظر بھر
لُبھانے میں جادو اثر بن گئی تو

مصیبت میں ثابت ہُوئی رحمتِ حق
تکالیف سے بے خبر بن گئی تو

تیرے باعث آساں ہُوئی زندگانی
محبّت کا اُلفت کا گھر بن گئی تو

”رضا“

جلد (۸) اکتوبر ۱۹۰۴ء نمبر (۱)

ایڈیٹر
شیخ عبدالقادر بی۔ اے

مخزن

اُردو علم ادب کی دلچسپیوں کا ایک ماہوار مجموعہ



مضامین نثر

شاعری کی حقیقت۔ شمس العلما مولانا محمد شبلی نعمانی ۱
سیر ایران۔ ریورنڈ جان ملکم (از پیرس) ۷
روما کے تماشے۔ سید نذیر حسین بی۔ اے ۱۸
قومی زندگی۔ شیخ محمد اقبال ایم۔ اے۔ ۲۳
اصلاح حسرت۔ تحقیق۔ ۴۱

مضامین نظم

تحفہ گلاب۔ حافظ بشیر اُردو
نفل حق آزاد ۴۶
ہمارا دیس۔ شیخ محمد اقبال ایم۔ اے ۴۹
کشمیر و حسن کشمیر۔ یلدرم (از بغداد) ۵۰
مراثی شاد۔ خان بہادر سید علی محمد شاد۔ ۵۱
دھرتی ماتا۔ منشی نادر علیخاں نادر کاکوروی۔ ۵۴
چاندنی۔ منشی صادق علی خاں۔ ۵۶
صوفیانہ رنگ کے پردے۔ منشی درگا سہائے سرور جہان آبادی ۵۸
نظم۔ عشمت الٰہیہ جناب ثاقب ۶۱

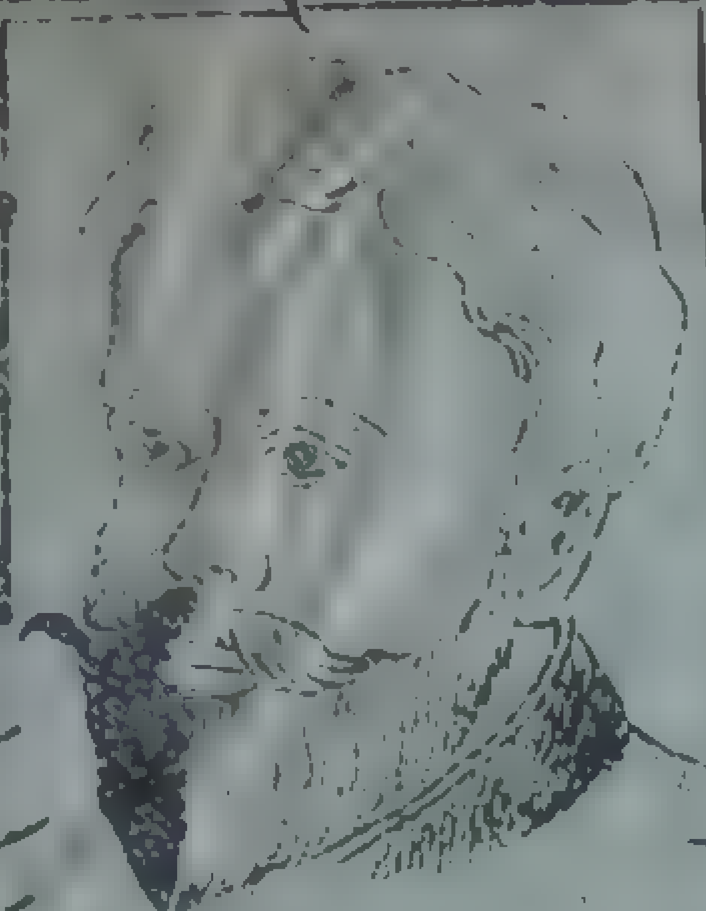
نو کروڑ ہندوستانی اُردو بولتے ہیں۔ اور اسی قدر اور ہندوستانی اُردو سمجھتے ہیں +

○ ان شہروں میں اُردو مادری زبان ہے ☐ ان شہروں میں اُردو مروّج ہے۔ ⊕ ان شہروں میں اُردو سمجھی جاتی ہے۔

لاہور اخبار کی خیام التعلیم سٹیم پریس لاہور میں منشی عبد العزیز مینیجر کے اہتمام سے چھپا اور شیخ محمد اکرام اسسٹنٹ ایڈیٹر نے شائع کیا

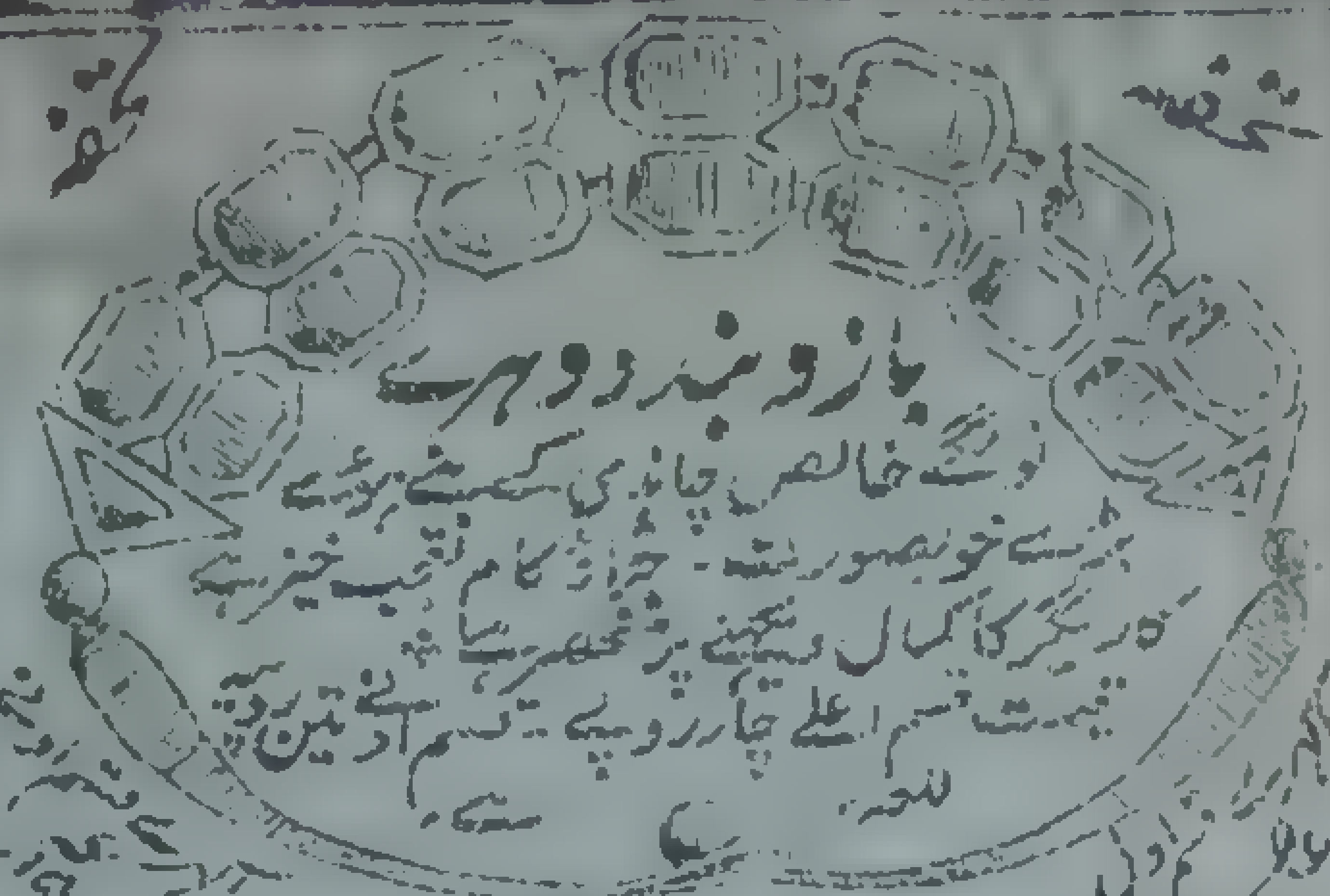
خالص چاندی کے خوشنما زیور — پانچ سو روپیہ انعام

خضاب زینت شباب



مہندی اور وسمہ کی تکلیفوں کو دور کرنے کے لئے ہم نے ایک عجیب خضاب زینت شباب تیار کیا ہے جس کو سفید بالوں میں لگا لیجئے بس ایک ہی منٹ میں بال سیاہ ہو جاتے ہیں اور سیاہ بھی ایسے کہ خضاب شدہ بالوں اور قدرتی سیاہ بالوں میں کوئی تمیز نہیں رہتی ایک شیشی خریدی ہوئی مدتوں چلی جاتی ہے۔ پندرہ روز تک سیاہی قائم رہتی ہے۔ ہمارا دعوے ہے کہ جو شخص اس سے زیادہ زوداثر خضاب کا نسخہ بتلائے ہم اسکو پانچسو روپیہ انعام دینگے۔ قیمت فی شیشی ایکروپیہ بارہ آنہ عـہ/ ۱۲

تحفہ

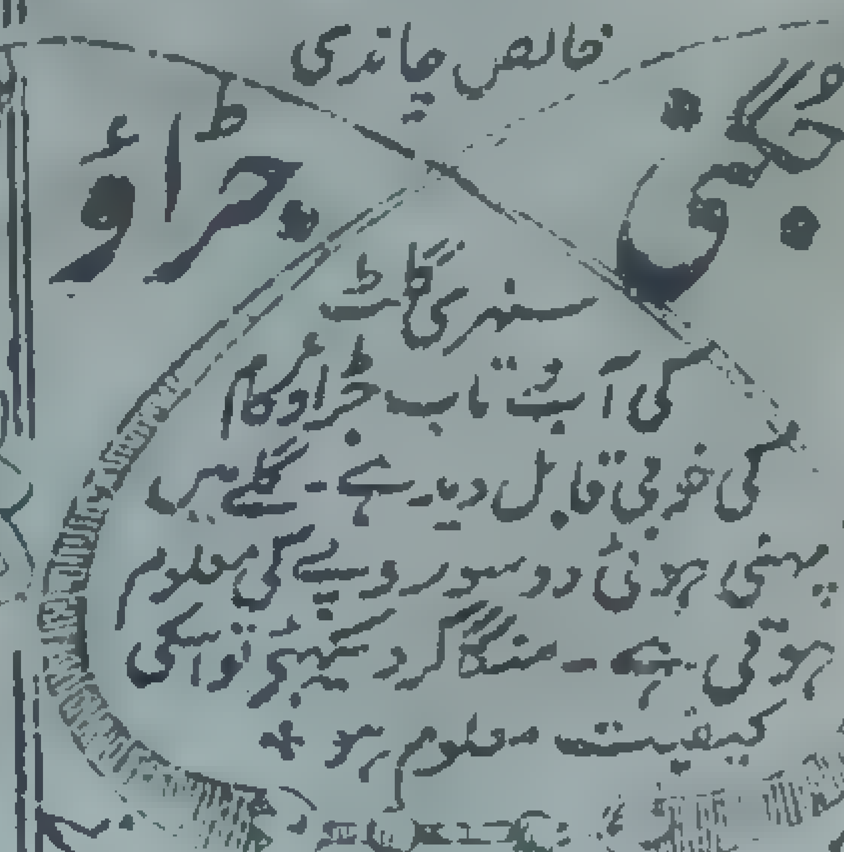


بازو بند دوہرے

نونگے خالص چاندی کے بنے ہوئے بڑے خوبصورت۔ جڑاؤ کام عجیب خیز ہے۔ کاریگر کا کمال دیکھنے پر منحصر ہے۔ قیمت قسم اعلے چار روپیہ۔ قسم ادنے تین روپیہ للعہ

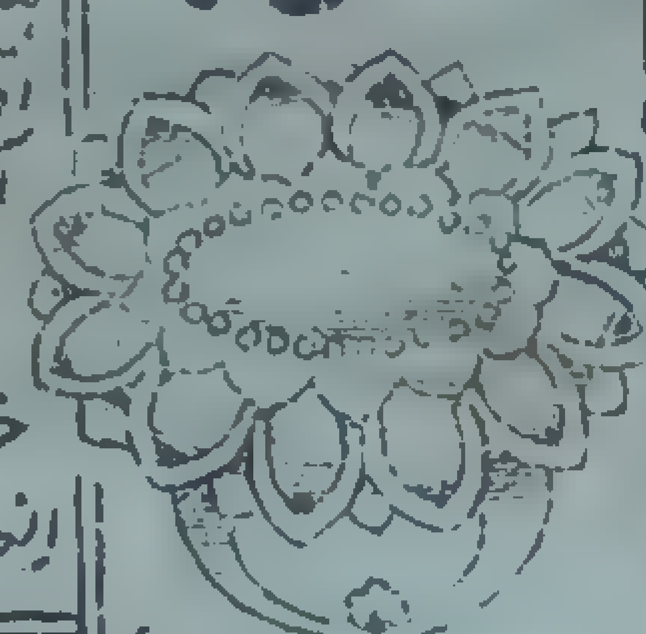
جگنی جڑاؤ

خالص چاندی



سنہری گلٹ کی آب و تاب جڑاؤ کام کی خوبی قابل دید ہے۔ گلے میں پہنی ہوئی دو سو روپے کی معلوم ہوتی ہے۔ منگا کر دیکھئے تو اسکی کیفیت معلوم ہو۔

آرسی جڑاؤ



یہ خالص چاندی کی جڑاؤ آرسی ہے۔ جس کے اوپر سونا چڑھایا گیا ہے کاریگر کا کمال دیکھنے پر منحصر ہے۔ بڑا نفیس زیور ہے۔ قیمت قسم اول دو روپیہ (عـہ) قسم دوم ایکروپیہ آٹھ آنہ عہـ/

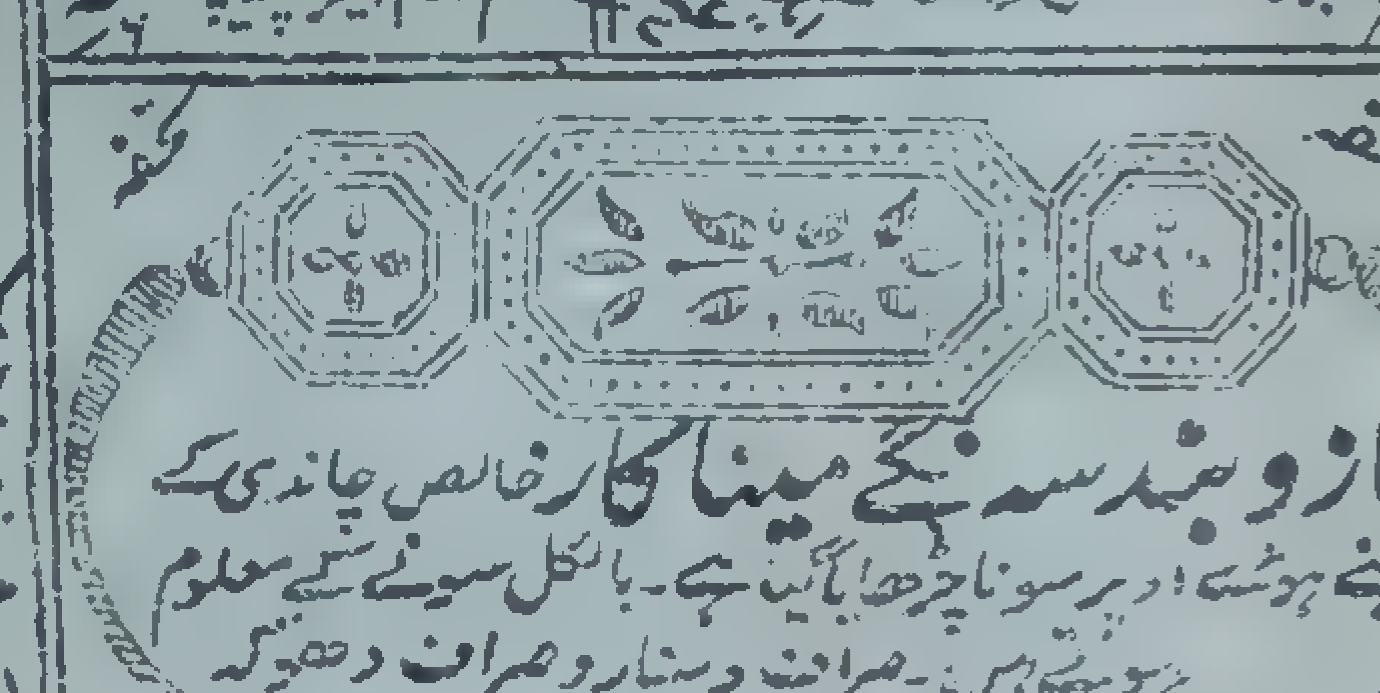


بارہ روپے آٹھ آنہ کی گھڑی صرف چھ روپے میں



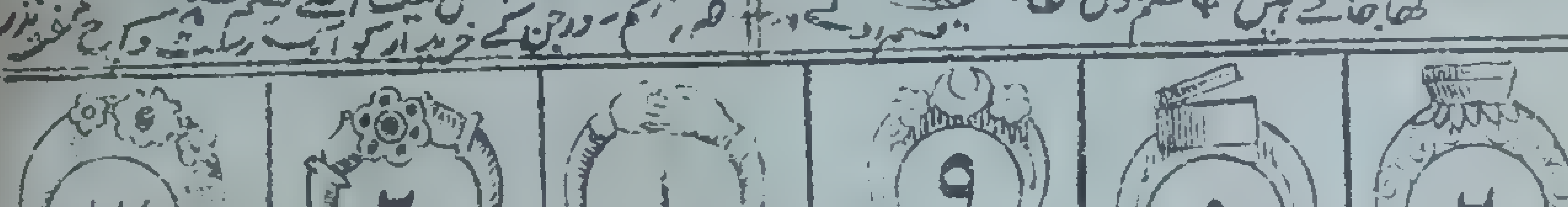
اس رسٹ واچ کے پرزے نہایت مضبوط اور نکل کیس اوپن فیس گھڑی ہے۔ سیکنڈ کی سوئی جیب میں سوئیاں پھیرنے کی پن موجود ہے۔ برسوں بھی لگ سکتی ہے۔ نہیں بگڑتی۔ کلائی کی زینت اور مردانہ زیور ہے۔ اصل قیمت اعلے قسم ۸ـ / ادنے قسم

تحفہ



بازو بند سہ نگے میناکار

خالص چاندی کے بنے ہوئے اور پر سونا چڑھایا گیا ہے۔ بالکل سونے کے معلوم ہوتے ہیں۔ صراف و سنار و صراف دھوکہ کھا جاتے ہیں۔ قسم اول عـہ/ قسم ادنے عـہ/



۳	۲	۱	۹	۸	۶
خالص چاندی کی نہایت خوبصورت ہفت نگی سنہری گلٹ قسم اول عـہ/ قسم ادنے ۸	خالص چاندی کی سنہری گلٹ فیروزوں والی قسم اول ادنے	خالص چاندی کی دست انا جیسر سنہری گلٹ پہنچی قسم اول (عـہ/) قسم ادنے ۱۴	خالص چاندی کی ہلال نما انگوٹھی نہایت خوبصورت قسم اول (۸ر) قسم دوم (۷ر)	خالص چاندی کی عطردان والی قسم اول (۸ر) قسم ادنے (۷ر)	خالص چاندی کی نگینہ والی انگوٹھی قسم اول (۸ر) قسم ادنے (۷ر)

مندرجہ بالا

نواب اشرف اینڈ کمپنی لاہور

نئی جِلد کے تُحفے

آج جلدِ ہشتم شروع ہوتی ہے۔ اور ہم دوستوں سے تُحفوں کے منتظر ہیں۔ جن حضرات نے گذشتہ مہینے کی التماس پر توجہ فرما کر نئی جلد پر اظہارِ مسرّت کیا ہے اور نئے خریداروں کے نام بطورِ تُحفہ بھیجے ہیں۔ اُن کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔ لیکن ابھی بہت سی حضرات ہیں۔ جو شاید تقاضے کے منتظر ہیں۔ ہم اُن سے صرف اتنا کہنا چاہتے ہیں۔ کہ اگر وُہ حقیقت میں **مخزن** کو پسند کرتے ہیں۔ اور چاہتے ہیں کہ یہ زندہ رہے اور اپنی خوبیوں اور خصُوصیتوں میں ترقّی کرے تو اسے شاباش دیں اور اس کا حوصلہ بڑھائیں اور اسکی عملی صُورت خریداروں کی تعداد بڑھانا ہے۔ ہمّت کریں اور کسی دوست کو جو پہلے سے خریدار نہ ہو پرچہ دکھا کر ترغیب تو دیں۔ آگے پرچے کی قوّتِ جذب اور قسمت۔ تقاضے کے منتظر نہ رہیں۔ ہم تو ایک آدھ دفعہ بھی ایسی درخواست مجبورًا کرتے ہیں۔ انہیں چاہئے کہ ہمیں خوگرِ سوال نہ بنا دیں

بے طلب دیں تو مزا اس میں سوا ملتا ہے
وُہ گدا جسکو نہ ہو خُوئے سوال اچھّا ہے

اگر ہمیں پرچے سے نفع حاصل ہونا شروع ہو گیا ہو۔ تو ہم اس قسم کی تحریک کو۔ جو عمومًا جائز اور ہندوستان کے خاص حالات کے اعتبار سے حلال طیّب ہے۔ اپنے خاص عقیدے کے رُو سے معیُوب سمجھیں۔ لیکن چونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ یہاں تحفے بھی بن مانگے نہیں ملتے۔ اِس لئے لب کشا ہوتے ہیں۔

آئیے اور لائیے

مخزن

شاعری کی حقیقت

اِس دفعہ ایک نہایت مفید اور محققانہ مضمون شمس العلماٗ مولانا محمد شبلی نُعمانی مدظلہٗ نے ہم کو عنایت کیا ہے - جو ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے - اُمید کہ آئندہ بھی اس نیسانِ تحقیق کی گہر ریزی سے ہم گوہرِ مقصُود حاصل کرتے رہینگے :-

سب سے پہلے شاعری کی حقیقت اور ماہیّت سے ارسطو نے بحث کی - منطق کے اُس نے جو آٹھ حصّے قرار دیئے اُن میں ایک بوطیقا تھا - یعنی شاعری - عربی زبان میں اس خاص حصّہ کا ترجمہ متّی نے سُریانی زبان کے ترجمہ سے کیا - ابن رشد نے اسکی تلخیص کی - اور بو علی سینا نے منطقیات شفا میں اِس کے مضامین کو نہایت خوُبی سے اپنی طرز میں ادا کیا - ابن رشد کی تلخیص کے جستہ جستہ حصّے پروفیسر شیخو لویس نے اپنی کتاب علم الادب میں جو بیروت میں چھپ گئی ہے شامل کئے ہیں - افسوس ہے کہ چُونکہ مسلمانوں نے ارسطو کی ادبی تصنیفات کی طرف کچھ التفات نہیں کیا - اِس لئے شاعری کے متعلق ارسطو کے جو خیالات تھے وُہ مُسلمانوں میں بالکل پھیل نہ سکے - کُتبِ ادبیہ میں شاعری کی جو تعریف کی گئی ہے اور وُہی عام و خاص کی زبانوں پر جاری ہے - وُہ یہ ہے کہ کلام موزُون ہو اور متکلّم نے بہ ارادہ موزون کیا ہو - لیکن یہ تعریف درحقیقت ماہیّۃ الشعر ہے - آج تو یہ مسئلہ بالکل فیصل ہوچکا ہے - لیکن قدما کے کلام میں بھی اس کے اشارے

بلکہ تصریحات پائی جاتی ہیں۔ کُتبِ اَدَبیّہ میں مذکور ہے کہ ایک دفعہ حسّان بن ثابت کے ایک صغیر السّن بچّہ کو بھڑ نے کاٹ کھایا۔ وُہ حسّان کے سامنے روتا ہوا آیا۔ کہ مجھ کو ایک جانور نے کاٹ کھایا ہے۔ حسّان نے جانور کا نام پُوچھا۔ وُہ نام سے واقف نہ تھا۔ حسّان نے کہا اچّھا اُس کی صُورت کیا تھی؟ بچّہ نے کہا:۔

کَاَنَّہٗ مُلتَفٌّ بِبُرْدَیْ حِبَرَۃٍ یہ معلوم ہوتا تھا کہ وُہ مخطّط چادروں میں لپٹا ہوا ہے۔ بچّہ کو بھڑ نے کاٹا تھا۔ اور چُونکہ بھڑ کے پروں پر دھاریاں ہوتی ہیں۔ اِس لیئے اُس نے مخطّط چادر سے تشبیہ دی۔ حسّان اس کے مُنہ سے یہ الفاظ سُنکر اُچھل پڑے اور خوشی کے جوش میں کہا کہ وَاللہِ صَارَ ابنِی الشَّاعِرُ یعنے خُدا کی قسم میرا بیٹا شاعر ہو گیا۔ وُہ فقرہ موزون نہ تھا۔ لیکن چونکہ تشبیہ اچّھی تھی حسّان نے سمجھا کہ بچّہ میں شاعری کی قابلیّت موجُود ہے۔ اِس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اہلِ عرب کے نزدیک شعر کی اصل حقیقت کیا تھی؟ ابن رشیق قیروانی نے عرب کی شعر و شاعری پر ایک مستقل کتاب لکھی ہے۔ اس میں شُعرا اور علمائے ادب کے جو اقوال نقل کئے ہیں اُن سے بھی اسی خیال کی تائید ہوتی ہے۔ شُعرائے فارس کے نزدیک بھی شاعری دراصل تخیُّل کا نام تھا۔ نظامیِ عروضی سمرقندی جو خود بہت بڑا شاعر اور نظامی گنجوی سے متقدّم تھا۔ اپنی کتاب چہار مقالہ میں لکھتا ہے:۔

"شاعری صناعتے است کہ شاعر بداں صنعت اتّساقِ مقدّماتِ موہُومہ کُند۔ و التیام قیاس نتیجہ برآں وجہ کہ معنیِ خورد را بزرگ کند۔ و بزرگ را خورد۔ و نیکو را در لباسِ زشت۔ و زشت را در حلیۂ نیکو جلوہ دہد۔ و با ایہام قوت ہائے غضبانی و شہوانی برانگیزد۔ تا بداں ایہام طبائع را انبساطے و انقباضے بود و امور عظام را در نظامِ عالم سبب گردد"۔

اس تعریف کا ماحصل یہ ہے کہ "شاعری اس فن کا نام ہے کہ مقدّمات موہومہ کی ترتیب ہے۔ اچّھی چیز بدنما اور بُری چیز خوشنما ثابت کیجائے۔ اور محبّت و غضب کی قوتیں مشتعل کر دی جائیں"۔ یہ تو قدما کے اقوال و خیالات تھے۔ یورپ کے نکتہ سنجوں نے اس

مسئلہ پر نہایت دقیق بحثیں کی ہیں اور عجیب عجیب نکتے پیدا کئے ہیں - مِل نے اس پر ایک نہایت مفصل اور بسیط مضمون لکھا ہے جسکا نہایت مختصر خلاصہ حسب ذیل ہے :-

"انسان کی مدرکات میں سے بعض ایسے ہیں جن سے جذباتِ انسانی کو کچھ تعلق نہیں ہوتا۔ مثلاً اگر ہم اقلیدس کا کوئی مسئلہ حل کریں - تو اس سے ہم کو غصّہ یا جوش یا رنج نہیں پیدا ہوگا - لیکن اگر ہمارے سامنے کسی شخص کی مصیبت کا حال درد انگیز لفظوں میں بیان کیا جائے تو اِس واقعہ کے ادراک کے ساتھ ہم پر ایک اثر طاری ہوگا - اِس قسم کے اثروں کا نام جذبات یا احساسات ہے - اور جو چیز ان جذبات اور احساسات کو برانگیختہ کرسکتی ہے - وُہی **شاعری** ہے - اس تعریف میں تصویر - تقریر - وعظ بھی شعر کی تعریف میں داخل ہوجاتے ہیں - کیونکہ یہ چیزیں بھی جذباتِ انسانی کو برانگیختہ کرسکتی ہیں - اِسی بنا پر بعضوں نے ان چیزوں کو بھی شاعری میں داخل کرلیا ہے - لیکن مِل صاحب کے نزدیک یہ چیزیں شاعری کے دائرہ سے باہر ہیں - وُہ کہتے ہیں کہ "انسان جو کلام کرتا ہے اسکی غرض کبھی تو دُوسروں پر اثر ڈالنا ہوتا ہے - مثلاً اسپیچ - لکچر وغیرہ کہ ان سب کا مقصد دُوسروں کا مُتاثر کرنا ہوتا ہے - اور کبھی دُوسروں سے مطلق غرض نہیں ہوتی - بلکہ انسان محض اپنے آپ سے خطاب کرتا ہے اور اپنا آپ ہی مخاطب ہوتا ہے - مثلاً اگر کسی شخص کا بیٹا مر جائے تو اس حالت میں اس کی زبان سے جو الفاظ نکلینگے اسکی غرض کسی شخص یا گروہ کو مخاطب کرنا نہ ہوگا - بلکہ وُہ اپنا آپ مخاطب ہوگا - فرض کرو کہ وہاں کوئی شخص موجود نہ ہو تب بھی وُہی الفاظ اُس کی زبان سے نکلینگے - شاعری اِسی قسم کے کلام کا نام ہے - اس بنا پر شاعری کی تعریف منطقی طور پر کرنا چاہیں تو یُوں کہیں گے کہ "جو کلام اس قسم کا ہو کہ اس سے جذباتِ انسانی برانگیختہ ہوں اور اس کا مخاطب حاضرین نہ ہوں - بلکہ انسان خود اپنا آپ مخاطب ہو - اسکا نام شاعری ہے"۔

مِل صاحب کی یہ تعریف اگرچہ نہایت باریک بینی پر مبنی ہے - لیکن اس سے شاعری کا

دائرہ نہایت تنگ ہوجاتا ہے۔ اور اگر اسی کو معیار قرار دیا جائے تو فارسی اور اُردو کا دفتر بے پایان بالکل بیکار ہوجائیگا ٭

حقیقت یہ ہے کہ شعر کا دائرہ نہ اِس قدر تنگ ہے جیسا مل صاحب کرنا چاہتے ہیں۔ اور نہ اِس قدر وسیع جتنا ہمارے عُلمائے ادب نے کیا ہے۔ شعر کی تعریف جو ارسطو نے کی وُہ نہایت معتدل ہے اور اُسی کو اس بحث کا فیصلۂ قطعی قرار دینا چاہیئے ٭

ارسطو کے نزدیک شعر ایک قسم کی مُصوّری اور نقّالی ہے۔ فرق یہ ہے کہ مُصوّر صرف مادّی اشیا کی تصویر کھینچ سکتا ہے۔ بخلاف اِس کے شاعر ہر قسم کے خیالات۔ جذبات اور احساسات کی تصویر کھینچ سکتا ہے ٭

ایک شخص کا عزیز دوست جُدا ہو رہا ہے۔ اِس حالت میں اس پر جو صدمے گذرتے ہیں اور دل دوز خیالات کا جو طُوفان اُس کے دِل میں اُٹھتا ہے۔ شاعر اس کی تصویر اس طرح کھینچ سکتا ہے کہ اگر رنج و غم مادی چیزیں ہوتیں اور اُنکی تصویر کھینچی جاتی تو وہی ہوتی جو شاعر نے الفاظ کے ذریعہ سے کھینچی تھی ٭

اِس بنا پر کسی چیز کا بیان جب اس طرح کیا جائے کہ اس شے کی اصلی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جائے تو اُس پر شعر کی تعریف صادق آئیگی۔ دریا کی روانی جنگل کا سناٹا۔ باغ کی شادابی۔ سبزہ کی لہک۔ خوشبو کی لپٹ۔ نسیم کے جھونکے۔ دُھوپ کی شدّت۔ گرمی کی طپش۔ جاڑوں کی ٹھنڈ۔ صبح کی شگفتگی۔ شام کی دلاویزی۔ یا رنج۔ غم۔ غیظ۔ غضب۔ جوش۔ محبّت۔ افسوس۔ حسرت۔ خوشی اِن اشیا کا اس طرح بیان کیا جائے کہ اُنکی صُورت آنکھوں میں پھر جائے یا وُہی اثر دل پر طاری ہوجائے۔ یہی شاعری ہے۔ ایک اَور پیرایہ میں شاعری کی تعریف کیجا سکتی ہے اور وُہ بھی ارسطو کی تعریف کے قریب قریب ہے۔ دُنیا میں جس قدر قدرت کے مظاہر ہیں۔ خواہ مادّی ہوں۔ مثلاً پہاڑ۔ بیابان۔ باغ۔ دریا وغیرہ خواہ غیر مادّی مثلاً وصل۔ ہجر۔ تحسین۔ نفرین اِن سب سے

دِل پر اثر پڑتا ہے اور ہر شخص کے دِل پر پڑتا ہے - لیکن اثر کے مراتب متفاوت ہوتے ہیں - بعض اشخاص پر کم - بعض پر زیادہ - اور بعض پر بہت زیادہ ہوتا ہے - جو شخص اِن مظاہرِ قدرت سے عام لوگوں کی نسبت زیادہ متاثر ہو اور اس اثر کو بعینہ ادا بھی کر سکتا ہو وُہی شاعر ہے +

شاعر کے جذبات اور احساسات فطرتاً نہایت نازک - لطیف اور سریع الاشتعال ہوتے ہیں - دوست کی جُدائی ہر شخص پر اثر کرتی ہے - لیکن شاعر اس موقع پر بالکل بیتاب ہو جاتا ہے - دریا کی روانی سے ہر شخص محظوظ ہوتا ہے - لیکن شاعر پر وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے - سبزہ کے دیکھنے سے ہر شخص کو فرحت ہوتی ہے - لیکن شاعر جھومنے لگتا ہے - ممکن ہے کہ اِس درجہ کی کیفیت دُوسروں پر بھی طاری ہو - لیکن وُہ لوگ اس کیفیت کو - الفاظ کے ذریعہ سے اس طرح ادا نہیں کر سکتے - جس طرح شاعر کر سکتا ہے - حاصل یہ کہ جو شخص واقعات اور مظاہرِ قُدرت سے تمام لوگوں کی بہ نسبت زیادہ متاثر ہو - اور اِس اثر کو الفاظ کے ذریعہ سے پُورا پُورا ادا بھی کر سکتا ہو - وُہی شاعر ہے +

شاعری کی حقیقت میں یُورپ کے محققین کے نزدیک وزن کا ہونا ضرور نہیں - لیکن عرب و عجم کے نزدیک ضروری ہے - اہلِ عرب خُطبہ اور شعر کو دو مختلف چیز خیال کرتے تھے - حالانکہ خُطبہ اور شعر میں تخیُّل اور معنی کے لحاظ سے کچھ فرق نہ تھا - ارسطو نے بھی کتاب الشعر میں وزن کو شعر کا ایک ضروری جزو قرار دیا ہے - محقق طُوسی نے لکھا ہے کہ یُونانیوں کے نزدیک شعر کے لئے وزن کی ضرورت نہیں - لیکن یہ غلطی ہے - ارسطو کی کتاب الشعر آج موجود ہے - اور اس میں صراحتہً اس کے خلاف ہے محقق طُوسی کو اس وجہ سے دھوکا ہُوا کہ ارسطو نے منطق میں قیاساتِ شعری کا جو ذکر کیا ہے - اُس میں وزن کو غیر ضروری قرار دیا ہے - لیکن قیاس شعری اَور چیز ہے اور شعر اَور چیز - دونوں میں عام وخاص کی نسبت ہے +

شعر کا طبیعت پر اثر کرنا ایک فطری بات ہے۔ شعر دراصل دو چیزوں کا نام ہے۔ مُصوّری اور موسیقی اور یہ دونوں چیزیں فطرۃً انسان کے دل پر اثر کرتی ہیں۔ قدرت نے انسان میں یہ مادّہ رکھا ہے کہ اسکو تصویر اور نقل سے اس قدر مزہ آتا ہے کہ خود اصل شَے سے نہیں آتا۔ ایک چھپکلی یا کھنکھجورے کو تم دیکھو۔ تو تم کو نفرت ہو گی۔ لیکن اگر کوئی شخص کھنکھجورے کی ایسی تصویر کھینچدے کہ اصل کا دھوکا ہو۔ تو تم کو خواہ مخواہ لُطف آئیگا۔ اسی طرح موسیقی اور راگ کا اثر ہے جو فطرۃً طبیعت پر ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ جانور بھی اِس اثر سے خالی نہیں۔ چُونکہ شعر انہی دونوں چیزوں یعنی مصوّری اور موسیقی کا مجموعہ ہے۔ اِس لیئے اس کا دِل پر اثر ہونا ایک فطرتی امر ہے۔ اِس سے یہ نکتہ بھی ثابت ہُوا کہ شعر میں یہ دونوں باتیں کمال کے جس درجہ پر ہونگی۔ اِسی نسبت سے دِل پر اس کا اثر ہو گا +

شِبلی نُعمانی

کارڈ آف ٹیبل

امام غزالی علیہ الرحمۃ نے اپنی مشہور کتاب اَحیاءُ العُلوم میں معاشرت کے جو آداب لکھے ہیں۔ لُطف یہ کہ وُہ ایشیائی طریقہ کی نسبت زیادہ تر مہذب ممالک کے طریقہ سے ملتے ہیں۔ مثلاً کھانے کے آداب میں وُہ لکھتے ہیں:۔ "کھانا کسی اُونچی چیز پر (عربی میں اسکو خوان کہتے ہیں) رکھکر کھانا چاہئیے۔ کھانے باری باری سے آنے چاہئیں۔ لطیف کھانا (شوربہ وغیرہ) پہلے آنا چاہئیے۔ اگر اکثر مہمان آچکے ہوں۔ اور صرف ایک دو باقی ہوں۔ تو کھانا شروع کر دینا چاہئیے۔ کھانے کے بعد میوے۔ یا کوئی شیرینی آنی چاہئیے"۔ اِسی مضمون میں لکھتے ہیں۔ کہ "بعض لوگوں میں طریقہ تھا۔ کہ تمام کھانوں کے نام پرچہ پر لکھ کر مہمانوں کے سامنے پیش کیئے جاتے تھے"۔ انکی خاص عبارت یہ ہے۔ "وحکی ان بعض اصحاب المروات انّہ کان یکتب نسخہ بما یستحضر من الالوان ویعرض علی الضیفان" + اِس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ کارڈ آف ٹیبل کا طریقہ یورپ کی اپنی ایجاد نہیں ہے +

(الغزالی)

(عبد السّلام رفیقی)

سیرِ ایران

ریورنڈ مسٹر ملکم جان - حیدرآباد - دکن میں عیسوی چرچ کے ایک معزز رکن ہیں - ہیں ہندی نژاد اِس لئے ہندوستان کی ہمدردی انکے رگ و پے میں سرایت کئے ہُوئے ہے - دُنیا کے جس حصّے کو دیکھیں ہندوستانی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں - عموماً ایشیائی مذاہب اور خصوصاً اسلام کے مطالعہ کا انہیں شوق ہوا ہے - اور اس لئے مُسلمانوں کے معاملات سے انہیں غیر معمولی دلچسپی ہے - کچھ عرصہ ہُوا اُنہوں نے چند مہینے ایران میں بسر کئے تھے - اور ان دنوں وُہ بسبیلِ سیاحت یُورپ میں سفر کر رہے ہیں - سال بھر کے قریب اکسفورڈ میں مقیم رہے - اب کبھی لنڈن میں رہتے ہیں - اور کبھی یُورپ کے کسی اَور مقام کی سیر کو چلے جاتے ہیں - اُنہوں نے زبانی مجھے اپنے حالات سفرِ ایران سُنائے تھے - مَیں نے درخواست کی کہ وُہ اپنے حالات اور خیالات کو قلمبند فرماویں - تو دُوسرے اہلِ وطن کی آگاہی کا باعث ہو - اُنہوں نے مہربانی سے اس درخواست پر توجہ فرمائی - جس کا نتیجہ یہ دلچسپ مضمون ہے :- (عبد القادر)

سیر و سیاحت ہر انسان کے لئے عموماً اور اُس انسان کے لئے جو چشمِ بصیرت رکھتا ہو نہایت مفید مشغلہ ہے - اکثر اوقات سیر و سیاحت اور تبدیلِ آب و ہوا سے نہ صرف عام صحتِ جسمانی کو فائدہ ہوتا ہے - بلکہ اَور ایسے بیشمار فواید اور بیش بہا تجربے حاصل ہوتے ہیں - اور دماغی سبق - تمدنی و اخلاقی نصائح ملتے ہیں - جو جغرافیہ و تاریخ کے کسی مُطالعہ کے کمرے میں سالہا سال کے پڑھنے سے حاصل نہیں ہوتے - قرآن شریف میں اسی لئے مُسلمانوں کو سِیرُوا فی الارضِ کی ہدایت ہُوئی ہے - سیاحت مختلف اغراض کے لئے ہو سکتی ہے مثلاً:-

(۱) سائنٹفک یعنی علمی تحقیقات مثل جغرافیہ - دریافتِ معدنیات - وطبقات الارض - یا آثارِ قدیمہ کے مشاہدہ کے لئے -

(۲) تجارتی سیاحت جیسیں سیاح ہر ملک کے پیداوار ضروریات نرخ ۔ تبادلہ اشیاء وغیرہ کی تحقیقات کرتے ہیں +
(۳) مختلف اقوام کی جسمانی ۔ تمدنی ۔ اخلاقی ۔ ملکی و مذہبی حالت کی تحقیقات کے لئے +
(۴) صحت کے لئے +

کسی زمانہ میں مسلمان باوجود اُس زمانہ کے مشکلات سفر کے بھی جبکہ سفر بصورت سقر تھا ۔ بحر و بر کا سفر مغرب الاقصیٰ سے لیکر مشرق الاقصیٰ تک کرتے تھے اور اپنے سفر کے تجربے اور عجیب و غریب مشاہدے اپنے اہلِ وطن کو سُناتے تھے ۔ جیسے کہ الف لیلہ میں سندباد جہازی کا عجیب و غریب سفر کسی قدر رنگ آمیزی کے ساتھ مرقوم ہے ۔ اور رحلہ ابن جبیر ۔ بطوطہ ۔ ابن حوقل اور صدہا اَور سفر نامے اس کے مصداق ہیں ۔ لیکن اب سِیرُوْا فی الارضِ پر اہل یورپ عمل کرتے ہیں ۔ وُہ علمی ۔ تجارتی و تمدنی تحقیقات کے لئے بحر و بر کا سفر کرتے ہیں ۔ مردم خوار جزائر اور وسط افریقہ کی قوموں میں مشنری بنکر جاتے ہیں ۔ قطب شمالی ایسے ناممکن الدخل مقام پر پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں اور ہر سال سوئٹزرلینڈ کے خوفناک بلند برفانی پہاڑوں کی چوٹیوں پر چڑھنے کی غرض سے صدہا پھسلکر مرجاتے ہیں ۔ مگر سیاحت سے باز نہیں آتے ۔ اِسی شوق سیاحت کی بدولت کرۂ مغربی یعنے امریکہ اہلِ یورپ کو ہاتھ لگا ۔ اور ہندوستان ۔ آسٹریلیا ۔ افریقہ پر انکا تسلّط ہوگیا ۔ اور اَلسَّفَرُ وَسِیْلَۃُ الظَّفَرِ کا مقولہ ان کے لئے راست آگیا +

مجھ کو بھی لڑکپن سے سیاحت کا شوق دامنگیر رہا ہے ۔ اور ۱۲ برس کے سن سے کچھ تو زمانہ کی مجبوریوں یعنے والدین کی وفات اور کچھ شوقِ سیاحت کے باعث مجھے گھر بار سب چھوڑ دینا پڑا ۔ باوجود سخت مصائب و مشکلات کے جنکا جار ناچار مجھے سامنا کرنا پڑا ۔ مَیں نے کوہ ہمالیہ کی بلند برفانی چوٹیوں سے لیکر راس کماری تک کی سیاحت کی اور ہندوستان کے مختلف حصّوں ۔ اختلافِ آب وہوا و مناظرِ قدرتی ۔ اور اقوام مختلف الخصائص کے دیکھنے سے مجھے بہت سے فوائد اور سبق حاصل ہوئے +

تین سال ہوئے اِسی شوقِ سیاحت اور بعض دیگر وجوہات نے مجھے مجبور کیا کہ اب ہندوستان سے باہر کسی ایسے ملک کا سفر کرنا چاہئے - جو بلحاظِ آب وہوا ہند سے بہتر ہو اور جہاں کی قوم و گورنمنٹ ہند سے علیحدہ ہو - چند دوستوں کے مشورہ کے بعد یہ فیصلہ ٹھہرا کہ قریب ترین ملک ایران ہے - آب وہوا بھی عمدہ ہے - اور زبان بھی آسان ہے - چنانچہ وسط مارچ میں حیدرآباد سے براہِ بمبئی بوشہر کو روانہ ہوا تا کہ ایسے وقت میں ایران پہنچوں جبکہ بہار کا مزہ لوٹ سکوں ایران میں موسم بہار ۲۱ مارچ سے شروع ہوتا ہے - اور نوروز جمشیدی اُسی دن ہوتا ہے - اِس لئے کہ آفتاب خطِ سرطان میں اُس روز داخل ہوتا ہے اور تمام کرۂ شمالی اور منطقہ معتدلہ اس کی روشنی و گرمی سے روشن و منوّر و تازہ ہوتے ہیں -

بمبئی سے پانچویں اور کراچی سے دوسرے روز بعد ہم برٹش انڈیا کے حدودِ حکومت سے باہر ہوئے اور بندر گوادر کے مقابل جو سلطان مسقط کے زیرِ حکومت ہے پہنچے - بلوچستان کا کنارہ نہایت ہی خشک و بے شجر نظر آیا لیکن ادھر کے بلوچ و عرب لوگوں کے چہروں سے ایک ایسی بات محسوس ہوتی تھی جو تمام ہندوستان میں معدوم ہے یعنے ان کے دلوں میں ہنوز مطلق حکومت کے اُس خوف و رعب کے آثار نہیں جو بالعموم ہم ہندوستانیوں کے دلوں میں بطور سکّے کے جم گیا ہے - چھٹے روز بمبئی سے روانہ ہونے کے بعد ہم نے مقدّس اور پیاری سرزمینِ عرب کا درشن کیا اور بندرگاہِ مسقط میں داخل ہوئے - کنارے پر مسقط کے سخت چٹانی پہاڑ ہیں اور بالکل خشک و بے شجر اور نہایت گرم - ان میں سے ایک پہاڑ پر جو بندرگاہ کے بالکل سامنے ہے سُلطان مسقط کا قلعہ ہے اور اس پر توپیں چڑھی ہوئی ہیں - یہاں ہر شخص ہنری مارٹینی بندوق سے مسلح ہے اور سب کے چہروں سے بے خوفی و آزادی کے آثار نمایاں تھے جسکو دیکھ کر دل پر ایک خاص اثر ہوتا تھا - ساتویں روز ہم ایران جنت نشان کے کنارے کے مقابل آئے اور بندر عباس کے

بلند سیاہ چٹانی پہاڑ کی جانب شمال سے ٹھنڈی ٹھنڈی لطیف ہوا کے جھونکے ہمارے جہاز تک آنے لگے - جو ہم ہند کے جھلسے ہُوئے - سوختہ جانوں اور افسُردہ دلوں کے لئے بمنزلہ ایک رُوح رواں کے محسُوس ہوتے تھے - بندر عباس کے آبنائے سے گذرنے کے بعد ہم خلیج فارس میں داخل ہُوئے - اور جُوں جُوں ہم آگے بڑھے ایران کی طرف سے شمالی ہوا ہم کو یہ محسُوس کراتی تھی کہ اب ہم منطقۂ حارہ سے نکلکے منطقۂ معتدلہ میں ہیں - نویں روز بندر لنگہ سے گذرتے ہُوئے دسویں روز ہم خلیج فارس کے سب سے بڑے بندر بوشہر میں داخل ہُوئے - بوشہر میں ایک ہفتہ قیام کے بعد ہم شیراز کو روانہ ہُوئے - اور بارہ روز کے سخت پہاڑی سفر اور گھاٹوں اور دروں کے چڑھاؤ واُتار کر بعد خاکِ پاک شیراز کی زیارت نصیب ہُوئی - جس سے سعدی اور حافظ جیسے لاجواب بزرگ پیدا ہُوئے - اور جہاں اب وُہ مدفون ہیں - انکے مزار پر فاتحہ خوانی کی آبِ رُکنی کا مزہ چکھا اور گلگشتِ مُصلّےٰ کا نظارہ کیا - شیراز کے اطراف باغات 'دلکشا' 'دُنو' و 'باغ تخت' وغیرہ کی بھی سَیر کی -

زوال کے آثار جو تمام اسلامی ممالک میں پائے جاتے ہیں - ایران بھی اُس سے مستثنےٰ نہیں - اور شیراز کا بھی اب نسبتاً ویسا ہی حال ہے - جیسا کہ اس کے اور ہمعصر تاریخی اسلامی شہروں مثل بغداد - دمشق و اصفہان و دہلی وغیرہ کا ہے - لیکن پھر بھی شیراز کے دیکھنے سے حافظ کے وُہ اشعار یاد آگئے جو عروج کے وقت لکھے گئے تھے - ؎

خوشا شیراز و وضعِ بیمثالش ۔۔۔ خداوندا نگہدار از زوالش
ز رُکنا باد ما صد لوحش اللہ ۔۔۔ کہ عُمر خضر مے بخشد زلالش
میانِ جعفر آباد و مُصلّےٰ ۔۔۔ عبیر آمیز مے آید شمالش

شیراز میں ایک ماہ قیام کے بعد ہم اصفہان گئے - جو تین سو برس قبل تک شاہانِ صفویہ کا پایۂ تخت تھا - اور اصفہان نصف جہان مشہور تھا - اور شک نہیں کہ مشرق کا پیرس اُس

زمانہ میں ہوگا۔ اُس کے اُجڑے ہوئے بازار۔ سیدھے اور مصفّا فرشی پتھروں کی۔ سڑکیں۔ اُسکے خیابان۔ مساجد و محل عالیشان۔ گلزار۔ باغات۔ نہریں۔ فوارے۔ چمنستان۔ دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ فرانسیسیوں نے پیرس کی آراستگی میں اصفہان کے نمونے سے بہت فائدہ اُٹھایا ہے۔

اصفہان میں چندے قیام کے بعد ہم کاشان۔ قم ہوتے ہوئے طہران پہنچے۔ قدیم پایۂ تخت رَے (جو طہران سے ۴ میل ہے) کے کھنڈروں کا عبرت ناک نظّارہ کیا۔ اسے آیۂ کُلُّ مَنْ عَلَیْهَا فَانٍ کی تفسیرِ خاموش کہنا چاہئے۔

دار الخلافہ طہران اپنی موجودہ حالت میں صرف سو برس کا پُرانا شہر ہے۔ کوہ البرز کے دامن میں واقع ہے۔ موجودہ خاندان قاچار نے اٹھارویں صدی کے آخر میں اسکو بسایا اور ناصر الدین شاہ مرحوم نے اسکی شہر پناہ پیرس کے نمونے پر بنائی ہے۔ شہر میں ٹرامویے چلتی ہے۔ اور چھ میل تک ریلوے بھی ہے۔ آبادی قریب ۵ لاکھ یعنے دکن کے پایۂ تخت حیدرآباد کے برابر ہے۔ پایۂ تخت ایران ہونیکی وجہ سے تمام سلاطین کے سفارت خانے یہاں ہیں۔ اور اس لئے یورپین طرزِ معاشرت کا اثر یہاں زیادہ ہے۔ طہران سے ہم نے مشہد۔ ہمدان۔ کرمان شاہ (کردستان) کا سفر کیا اور وہاں سے بغداد۔ بصرہ ہو کر قریب ۷ ماہ کے سفر کے بعد ہندوستان کو واپس ہوئے۔

اِس سفر میں ایک ہندی سیّاح کو بہت سے نتائج خیز سبق حاصل ہوتے ہیں اور اس کو یہ موقع ملتا ہے کہ وہ ہند کی ملکی و تمدّنی حالت اور بالخصوص مسلمانانِ ہند کی تمدّنی و اخلاقی حالت کا مقابلہ دیگر اسلامی ممالک و اقوام کی حالت سے کر سکے۔

ہند کی وہ شائستگی جسکو اب یورپین تمدّن و شائستگی کا گھن لگ گیا ہے۔ ایران میں ہنوز زندہ ہے اور ایک ہندی سیّاح کو اپنی قدیم شائستگی کے نمونے ایران میں دیکھنے سے نہایت خوشی ہوتی ہے۔ اور اُسکو یہ جانچنے کا موقعہ ملتا ہے کہ قدیم وجدید شائستگی میں کیا

نسبت ہے۔ اور کن باتوں میں قدیم شائستگی کو فضیلت ہے۔ ہم آجکل اندھا دھند یورپین تمدن و شائستگی کی تقلید بلا لحاظ اپنی آب وہوا۔ تاریخ و مقامی حالت کی خصوصیات کے کرتے ہیں۔ حالانکہ قدیم اسلامی شائستگی کا بہت سا حصہ ایسا عمدہ ہے کہ اہل یورپ اسپر آجتک رشک کرتے ہیں۔ میرا عقیدہ مثل جاپان کے بڑے مدبروں کے یہ ہے کہ ہم کو یورپ سے صرف سائنس آلات۔ فن حرب اور موجودہ اصول تجارت سیکھنے چاہئیں۔ باقی اپنی مشرقی شائستگی کو بعد قدرے اصلاح کے زمانہ کی ضروریات و حالات کے لحاظ سے قایم رکھنا چاہئیے۔

ایران کی بہار۔ ہم نے بہت کچھ ایران کی بہار کے متعلق سُنا اور کتابوں میں پڑھا تھا۔ لیکن۔ شنیدہ کے بود مانند دیدہ۔ ایران کی بہار کی پوری تصویر کھینچنا نہایت مشکل ہے اور اس کیفیت کو جو موسم بہار میں وہاں انسان کے دل میں پیدا ہوتی ہے۔ بیان کرنا ناممکن ہے۔ بہار میں تمام نیچر شجر سے لیکر حیوان اور حیوان سے لیکر انسان تک مثل ایک عروس نو کے آراستہ ہوتی ہے۔ ایک شگفتگی ہر قدم پر ہویدا ہے۔ باد بہاری اور نسیم کے ہلکے اور لطیف جھونکے تمام نیچر کو ایک نئی روح بخشتے ہیں۔ اور عورت مرد اور بچوں کے رخسارے مثل گلاب کے کھلنے لگتے ہیں۔ پُر فضا میدانوں کا نظارہ۔ باغہائے خوشگوار کی مہک۔ تر و تازہ سیراب و سر سبز وادیوں کا تماشا۔ سر بفلک پہاڑ۔ جنکی چوٹیاں نورانی برف سے ڈھپی ہوئی ہیں۔ یہ سب منظر دلوں کی افسردگی کا علاج ہیں اور فرحت و انبساط کا مژدہ لاتے ہیں۔ اِدھر بلبلیں نازک شاخوں پر سے جو پھولوں سے لدی ہیں چہچہا رہی ہیں۔ اور اپنی سُریلی و شیریں منقاروں سے ہارمونیم و پیانو کی سریلی آوازوں کو مات کر رہی ہیں۔ اور انسانی طبیعتوں میں جو ولولے اور اُمنگیں پیدا ہوتی ہیں۔ ان کی مثال کسی اور آب وہوا میں کمیاب ہے۔

ایران کی آب وہوا بالخصوص بہار کا سماں اور نسیم دلکشا ایرانیوں کے خوش اور

بشاش چہرے - چاروں طرف آزادی و خود مختاری کے آثار ہندی سیاح پر آناً فاناً عجب اثر پیدا کرتے ہیں -

ایرانی باوجود اپنے ملک کی زوال پذیر حالت کے ذاتی آزادی میں فرنگی کا بھائی معلوم ہوتا ہے اور جیسے ایک فرنگی اپنے حقوق ذاتی کی حفاظت سفر و حضر دونو میں کرسکتا ہے اور کسی دُوسری قوم کے شخص سے دب کر چلنا پسند نہیں کرتا - وُہی رنگ ایک حد تک ایرانی میں موجُود ہے - بوشہر میں مَیں نے دیکھا کہ ایک فرنگی سیاح کشتی سے اُترا - اور ملاح کو اس کے حق سے کچھ کم دیکر چلنے لگا - ملاح پیچھے دوڑا - اُس سیاح نے بہت آنکھیں لال پیلی کیں - ملاح نے بلاخوف و خطر اُسکا ہاتھ پکڑ لیا اور جھٹکا دیکر کہا "یہی کہ نہ میدہی"؟ اس پر صاحب بہادر نے چُپکے سے باقی پیسے دیدیئے -

خوراک یہاں عموماً مقوی اور صحت بخش ہے اور غربا بھی خوشخور ہیں - بادشاہ سے لیکر گدا تک نانِ گندم و گوشت دُنبہ کھاتا ہے - اور ادنیٰ سپاہی سے لے کر شہنشاہ تک کوئی ایران کے کسی غریب سے غریب کو بھی مذہبی یا قومی ذلت کی نظر سے نہیں دیکھ سکتا - ایران میں دیسی اور فرنگی میں کچھ فرق نہیں - نہ وہاں کسی یوروپین کو یہ جُرأت ہے کہ کسی ایرانی سے بُرا برتاؤ کر سکے - کسی زبردست سے زبردست غیر سلطنت کا ایران پر تسلط پا لینا یا براہِ راست حکومت قائم کرلینا مشکل معلوم ہوتا ہے - ایران مثل افغانستان کے نہایت پہاڑی ملک ہی - علاوہ اس کے بلوچستان سے لیکر آذربائیجان تک جو رُوسی کوہ قاف کے قریب ہے - اور خراسان و مشہد سے لیکر بصرہ تک تمام ایرانی ایک قوم - ایک زبان - ایک مذہب اور ایک لباس رکھتے ہیں - یہ یکرنگی اور اتحاد ایران کے استحکام و قومی بقا کا راز ہے - اور برخلاف اس کے دولتِ عثمانیہ کی بڑی کمزوری یہی ہے - کہ اس کی رعایا نہ بہ حیثیت قومی ایک ہے - نہ ایک زبان بولتی ہے نہ ایک لباس اور طرزِ بود و باش کی عادی ہے - یہی اختلافات ہیں جو ہندوستان میں وقتاً فوقتاً

لاینحل عقدے پیش کرتے ہیں - مگر ایران اس بارہ میں بہت خوش قسمت ہے - علاوہ اس قومی - لسانی اور مذہبی یونیفارمٹی (یکرنگی) کے ایرانی بہت سی ایسی مشرکانہ اور دیگر قابلِ اعتراض رسُومات سے بری ہیں - جنہوں نے مسلمانانِ ہند کو من حیث القوم مفلوج کر رکھا ہے - اگرچہ ایرانی مذہب شیعہ رکھتے ہیں - لیکن میں نے محرّم میں نہ وہاں تعزیئے دیکھے نہ باجے نہ ڈھول - نہ شیر چیتے کے سوانگ جو حیدرآباد میں ہوتے ہیں - نہ وہاں پیر پرستی ہے نہ قبر پرستی - ہاں عشرۂ محرم میں تمام قوم سیاہ پوش ہوجاتی ہے - اور ہر قسم کے جشن و جلسہ بند - مرثیہ خوانی و نوحہ خوانی عمومًا سلیقہ سے ہوتی ہے اور بعض سرگرم مذہبی جوش میں سینہ کوبی بھی کرتے ہیں -

شادی بیاہ ایران اور دیگر اسلامی ممالک میں نہایت سادہ رسُومات سے ہوتے ہیں - ہند کے سے باجے گاجے - رنڈیوں کا ناچ اور اَور فضُول تباہ کُن رسومات ان ممالک میں نہیں پائی جاتیں -

ایران کی سوشل حالت ہند کے مُسلمانوں سے بدرجہا بہتر ہے - وہاں سید تو البتہ تعظیم کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں - لیکن شیخ مُغل - پٹھان وغیرہ کی مزید امتیاز نہیں ہے جو اَور تفریقاتِ حسب و نسب و پیدائش و کسب پر مبنی ہیں مطلق پائی نہیں جاتیں - نہ کوئی انکو باعثِ فخر خیال کرتا ہے - ایک کفش دوز - ندّاف - قنّاد - سرّاج - طبّاخ - قصّاب - سبزی فروش کسی لحاظ سے عام سوسائٹی میں ذلیل نہیں سمجھا جاتا - ایک پیشہ ور بڑے سے بڑے آدمی کی لڑکی سے شادی کی تجویز کرسکتا ہے - اور اسی طرح اس کے برعکس بڑے سے بڑا مجتہد و شاہزادہ بلا خیالِ تحقیر ادنےٰ سے ادنے طبّاخ یا قصّاب کی لڑکی سے شادی کرتا ہے - معیارِ شرافت و عزّت شرافتِ ذاتی ہے - ایران میں ہر فرد بشر حتّٰی کہ شاہزادے بھی کوئی نہ کوئی پیشہ سیکھتے ہیں - اور پہلا سوال اجنبی مسافر سے یہی ہوتا ہے کہ چہ پیشہ داری - بے ہُنر و بے پیشہ کو بدمعاش چور اور بے اعتبار سمجھا جاتا ہے اور پیشہ ور کو ہر کوچہ و بازار

میں کُرسی ملتی ہے! ہمارے ہندوستان میں مرزا بھی ایک ذات ہنگئی ہے۔ حالانکہ ایران میں مرزا منشی کو کہتے ہیں۔

جس طرح ہمارے ایرانی بھائی بلحاظ سوشل حالات کے ہندی مسلمانوں سے بہتر ہیں اسی طرح ہماری ایرانی بہنیں ہندی بہنوں سے بدرجہا بہتر حالت میں ہیں۔ ہند کا سا سخت پردہ ایران میں نہیں۔ اُمرا اسے لے کر ادنےٰ عورتوں تک بُرقعہ کے ساتھ بازار میں اپنی پسند کا سودا خریدنے خود جاتی ہیں۔ دوکان پر کپڑے اور دُوسری اشیاء کی دیکھ بھال کرتی ہیں۔ اُسوقت رُوبند جو عموماً سفید ململ کا جالیدار ہوتا ہے اُسکو سر کے اُوپر کی طرف کرلیتی ہیں۔ تاکہ آنکھوں۔ ناک اور منہہ سے چیز کو دیکھ۔ سُونگھ یا چکھ سکیں۔ مسجدوں میں نماز کو جاتی ہیں۔ اور اکثر پچھلی صفیں عورتوں کی ہوتی ہیں۔ علماء کا وعظ سنتی ہیں۔ اور مرثیہ خوانی کی مجلسوں میں شریک ہوتی ہیں۔ شام کو باغات میں تفریح کے لئے نکل جاتی ہیں۔ جو قدرے خوشحال ہیں وُہ اپنے خاوندوں یا عزیزوں کے ساتھ سفید ایرانی گدھوں پر بیٹھ کر دو یا چار میل شہر کے باہر ہوا خوری کو نکل جاتی ہیں۔

اگرچہ ہند میں ایجاب و قبول مرد و عورت میں نکاح کے وقت بطور ایک رسم کے ہوتا ہے۔ لیکن فی الحقیقت لڑکی کو ہند میں ایسا موقع بہت کم ملتا ہے کہ وُہ اپنے شوہر سے قبلِ نکاح بات چیت کر سکے۔ یا اپنا فیصلہ آپ خود کر سکے۔ ایران میں ۹۵ فیصدی نکاح مرد و عورت کے بالکلیہ براہِ راست رضامندی سے ہوتے ہیں۔ اور شرع ہمیشہ مظلوم و کمزور کی محافظ رہتی ہے۔ کیا مجال ہو کہ کوئی کسی عورت پر بیجا ظلم کر سکے۔ یا اُس پر خواہ مخواہ بدگمانیاں کرے۔ ہند میں مردوں کا تشدّد شرعی اعتدال سے تجاوز کر گیا ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہو کہ اُن بیچاریوں کی قوتِ ارادی کو مردوں نے بالکل زائل کر رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری ہندی نسل کمزور و بُزدل پیدا ہوتی ہے۔ ماں کا تخیل بچّوں پر بہت اثر کرتا ہے۔ اور ماں کی گود بچّوں کے لئے پہلا مدرسہ ہے۔ کیا وجہ ہے کہ تُرک تمام

دُنیا میں بہادر سپاہی ہے۔ اصلی سبب تُرکوں کی مائیں ہیں جو اپنے بچوں کو اس شرط پر دُودھ پلاتی ہیں۔ کہ وُہ اس دُودھ کا حق جہاد کے وقت میدانِ جنگ میں ادا کریں۔ مُسلمان عورتوں کی حالت تمام اسلامی ممالک میں باستثنا ہند کے بہتر ہے۔ اور وُہ اپنے شرعی حقوق سے بخُوبی واقف ہیں۔ جوان بیوہ کا ایران یا دُوسرے اسلامی ممالک میں بغیر نکاح ثانی کے رہنا شاذ و نادر ہے۔ وہاں بغیر نکاح رہنا معیوب سمجھا جاتا ہے۔ ایران میں مذہبِ شیعہ کے موافق دو قسم کے عقد ہوتے ہیں۔ ایک عقدِ دائم۔ اور دُوسرا عقدِ منقطع۔ عقدِ دائم میں مُدّت نہیں ہوتی۔ اور مُدّت منقطع میں ایک مُدّتِ معینہ ٹھہر جاتی ہے۔ باقی عدّت کے قانون ایک ہی ہیں۔ اکثر لوگ مختلف وجُوہات سے عقدِ منقطع کرتے ہیں۔ اخلاقاً تو یہ معیوب عقد ہے۔ مگر جو بُرائیاں نئی تہذیب کے سبب مغربی دُنیا کے بعض حصّوں میں ہے۔ وُہ اِس عقد کی بدولت یہاں قریب قریب مسدود ہیں۔

ایران کی آب وہوا۔ گورنمنٹ اور سوشل حالت پر اس سرسری نظر کے بعد چند سطریں ایران کے حُسن و ملاحت پر لکھنا بیجا نہ ہوگا۔ یہ بات تمام دُنیا میں مشہور ہے۔ کہ جارجیا یعنے وُہ حِصّہ جو رُوسی کوہ قاف کے قریب ہے۔ جس کے حدود ایک طرف بحرِ اسود اور بحرِ اخضر ہیں۔ اور دُوسری طرف آرمینیا اور کردستان۔ بلحاظِ حُسن کے تمام دُنیا میں بہتر ہے۔ اِس کی تصدیق مجھے ایران کی سیاحت میں ہُوئی۔ قُدرت نے حُسن تُرک اور ایرانیوں کے حصّے میں دیا ہے۔ ہمارے نوجوان یورپ جاکر وہاں کی گوری رنگت پر مرنے لگتے ہیں۔ اور وہاں کے لوگوں ہی کو دُنیا میں سب سے زیادہ حسین سمجھتے ہیں کاش اُنھوں نے ایسے ایشیائی ممالک کا سفر کیا ہوتا تو دیکھتے کہ قدرت نے خود ان کے براعظم میں انہی کے بھائی بندوں کو کیا کیا خوبیاں اور نعمتیں دی ہیں۔ اور دُنیا کے وُہ بہترین حصّے انکو میراث میں دیئے ہیں۔ جہاں بقولِ اہلِ کتاب خدا نے باغِ بہشت بنایا تھا۔ اور اس باغِ عدن میں ہمارے پہلے ماں باپ آدم و حوّا کو بسایا تھا۔ جاؤ اور اپنی

ان حُوْرُ مَقصُورَاتٌ فِی الخِیَام" کی تصویریں دیکھو۔ اگر یُورپ کے نقش دل سے محو نہ ہو جائیں تو سہی۔

آخر میں چند باتیں اپنے تجربے سے ان لوگوں کی آگاہی کے لئے لکھتا ہُوں جو ایران کے سفر کا شوق رکھتے ہوں۔ وقتِ روانگی ہندوستان سے ایران جانے کے لئے بہترین مارچ کا شروع ہے۔ اور واپسی کے لئے اکتوبر بہتر ہے۔ اِس لئے کہ ایران کا سرما نہایت سخت ہے۔ جیساکہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔ بمبئی سے بوشہر دس دن اور کراچی سے سات دن کا راستہ ہے۔

حاجی زین العابدین یعنے پرشین اسٹیم ناوگیشن کمپنی کے جہاز سے جانے میں بہت آرام ہے۔ خط لکھ کر تاریخِ روانگیِ جہاز پُوچھ سکتے ہیں۔ بمبئی سے بوشہر تک درجہ دوم کا کرایہ معہ خوراک ساٹھ روپیہ ۶۰ ہے۔ اور درجۂ سوم میں بلا خوراک صرف دس روپیہ ۱۰ ہے۔ خوراک کا انتظام جہاز پر کر لینا چاہئے۔ عہ روپیہ روز میں اچھا کھانا مل سکیگا۔ مگر نشست برخاست۔ سونا سب ڈیک پر ہے۔ کم استطاعت و تکلیف کے عادی لوگوں کے لئے یہ درجۂ سوم کا بہت سستا سفر ہے۔ ایران میں بوشہر سے طہران اور مشہد جانے اور بغداد و بصرہ واپس آنے کے لئے کفایت شعار شخص کے لئے ایک ہزار روپیہ کافی ہے۔ اگر ڈیڑھ ہزار کا بندوبست کر سکے تو نسبتاً آسائش سے سیر ہو سکتی ہے۔

تمام ایران میں سفر خچر گدھے یا گھوڑے پر ہوتا ہے۔ اگر کوئی ایک اچھا گدھا ایک سو روپیہ میں خریدے اور قافلہ کے ساتھ سفر کرے تو بہت کفائت ہے۔ مگر یہ آزمودہ کار آدمی کا کام ہے۔ مَیں اس مضمون میں یہ باتیں بالاجمال ہی درج کر سکتا تھا۔ اگر کسی صاحب کو تفصیل کی ضرورت ہو تو حیدر آباد۔ دکن کے پتے سے مجھ سے خط و کتابت فرما سکتے ہیں کیونکہ غالباً مَیں عنقریب عازمِ ہندوستان ہونگا +

ملکم جان (از پیرس)

"رُوما کے تماشے"

جُوں جُوں اہل رُوما مغرور اور عیش پسند ہوئے۔ انکی یہ کیفیت ہو گئی کہ جب تک کوئی اُنہیں تفریح طبع کے لئے تماشے نہ دکھلاتا وُہ اُس سے کبھی راضی نہ ہوتے۔ کسی شخص کو سرکاری عہدے کی تمنا ہوتی تو یہ معمولی بات تھی کہ وُہ اہل شہر کو دلپسند تماشے دکھاکر خوش کیا کرتا۔ اب بھی وہاں جہاں پہلے زمانے میں اہلِ رُوما کی بڑی بڑی بستیاں تھیں۔ ایسے تماشا گاہوں کے کھنڈر ملتے ہیں۔ جن میں اہلِ شہر سبر دیکھنے اور لطف اُڑانے کے لئے جمع ہوا کرتے تھے۔ یہ تماشا گاہیں کہیں تو پہاڑ کے بیچ میں تراشی گئی ہیں اور کہیں میدان میں زمین کھود کر بنائی گئی ہیں۔

اس قسم کی سب سے زیادہ مشہور اور نہایت شاندار عمارت روما کی تماشا گاہ ہے شہنشاہ ویسپیسین اور اس کے بیٹے ٹائیٹس نے اسے روما کی سات پہاڑیوں کے بیچ میں ایک وادی کے اندر بنوایا تھا۔ یہودیوں نے جنہیں یہ باپ بیٹا یروشلم سے قید کر کے لائے تھے۔ اس کے بنانے میں محنت کی تھی۔ اس عمارت کا مصالحہ جو باہر سنگ سُرخ ہے اور اندر سنگ سفید۔ ایسا پختہ ہے کہ حالانکہ اس پر اتنی صدیاں گذریں اس کی صُورت میں فرق نہیں آیا۔ اسکا بیضوی شکل کا احاطہ پانچ ایکڑ زمین گھیرے ہوئے تھا۔ اِس پر محرابوں کی قطاریں کی قطاریں اوپر نیچے بنی ہوئی تھیں۔ اور اندر نشستگاہیں۔ اور نیچے عین وسط میں ایک وسیع دنگل تھا۔ جب روما کے شہنشاہ نمائش پسند ہو گئے۔ تو اُنہوں نے دنگل کو طرح طرح کی دھاتوں کے بُرادے سے قرمز سے اور بیش بہا پتھروں کے چُورے سے سجانا شروع کیا۔ تاہم بہتر یہی سمجھا جاتا تھا کہ بجائے ان تکلفات کے ایک قسم کے ملائم سفید پتھر کے باریک باریک ریزے دنگل میں بکھیرے

جائیں۔ اِن سے ذگل بالکل ایسا نظر آتا تھا گویا صاف شفاف اچھوتی برف پڑی ہوئی ہے اس احاطہ کے گرد تازہ ستھرے پانی کی ایک نہر بہتی تھی۔

تماشاگاہ کے نیچے کے درجے میں کسی قدر اُونچائی پر شہنشاہ کے لئے تخت مجسٹریٹوں اور مشیروں کے لئے سونے چاندی اور ہاتھی دانت کی کرسیاں اور راہب عورتوں کے لئے نشست گاہیں تھیں۔ اِس سے اُوپر اہل شہر کی نشستگاہیں اور سب سے اُوپر خواتین کے بیٹھنے کی جگہیں تھیں۔ اِس عالیشان عمارت میں کوئی ۸۷،۰۰۰ آدمی سما سکتے تھے۔ چھت اس پر کوئی نہ تھی۔ لیکن جب کبھی بارش ہوتی یا دھوپ تیز ہوجاتی تو زربفت اور ریشم کے سائبان تان دیئے جاتے تھے۔ رنگ ان سائبانوں کا عموماً ارغوانی ہوتا تھا۔ جس وقت دھوپ پڑتی تھی۔ تو سفید ذگل اور سفید پوشاکوں پر عجب دلفریب گلابی رنگ کا عکس پڑتا تھا۔

تماشا پسند لوگ دن دن بھر بیٹھے رہتے تھے۔ عوام سب سے پہلے جمع ہوجایا کرتے تھے۔ اس کے بعد بڑے بڑے اہلکار آتے تھے اور بیٹھتے جاتے تھے۔ اِن کے آنے پر آفرین یا نفرین کا نعرہ بلند ہوتا تھا۔ آفرین اہلکار معلوم کی ہردلعزیزی اور نفرین اُس کی نسبت ناراضی کا نشان ہوتا تھا۔ جب شاہنشاہ شامیانے کے نیچے مسند پر متمکن ہوتا تھا تو زور سے نعرے بلند ہوتے تھے "مرحبا خداوند مرحبا! تیرا اقبال بلند ہو" شہنشاہ کے بیٹھ جانے کے بعد تماشا شروع ہوتا تھا۔ بعض دفعہ سب سے پہلے ایک بازیگر ہاتھی آتا تھا اور ایک رسّی پر چڑھتا اور اُترتا تھا۔ پھر ایک ریچھ آتا تھا۔ معزز خاتونوں کا لباس پہنے ہوئے۔ ایک ڈولی میں بیٹھا ہوا جسے دو کہار اُٹھائے ہوتے تھے۔ یہ خواتین کی سواری کی نقل ہوا کرتی تھی۔ پھر ایک اَور ریچھ آتا تھا وکیلوں کا لباس پہنے ہوئے جو پچھلی ٹانگوں پر کھڑا ہو کر ایسے اشارات کیا کرتا تھا گویا مقدمے کی وکالت کر رہا ہے پھر ایک شیر نکلتا تھا۔ سر پر مرصّع تاج۔ گلے میں الماس کا کنٹھا۔ ایال اور پنجوں پر سُنہری

کام۔ جو ایک چھوٹے سے خرگوش کے ساتھ طرح طرح کی بیشمار دلپسند حرکات کیا کرتا تھا۔ اور خرگوش اُس کے آگے مزے لے لے کر ناچا کرتا تھا۔ پھر بارہ ہاتھی آتے تھے۔ چھ مردوں کے لباس میں چھ عورتوں کے بھیس میں مُنہہ پر نقاب پڑی ہوتی تھی۔ آکر کوچوں پر ایک ہاتھی دانت کی میز کے گرد بیٹھ جاتے تھے۔ اور بیٹھ کر نہایت سلیقہ کے ساتھ کھانا کھاتے تھے۔ ساتھ ہی ہنسی ہنسی میں قریب کے لوگوں پر گلاب چھڑکتے جاتے تھے۔ پھر اپنی ہی جنس کے مہمانوں کا اُٹھ کر استقبال کرتے تھے اور اُن پر سے پھول نثار کرتے تھے۔ اِس کے بعد سب مِل کر ناچتے تھے۔ یہ ناچ ہمیشہ ناچ کے مقرّرہ لباس میں ہوا کرتا تھا۔

بعض اوقات دنگل میں پانی چھوڑ دیا جاتا تھا۔ ایک جہاز تیرتا ہوا آتا تھا اور بیچ میں آکر ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا تھا۔ اس میں سے عجیب و غریب جانور نکلتے تھے۔ بعض دفعہ زمین پھٹتی تھی اور بلند بالا درخت نمودار ہوتے تھے۔ ان پر سونے کے میوے لگے ہوتے تھے۔

اِس کے بعد جنگلی درندے چھوڑے جاتے تھے۔ گینڈے اور چیتے سانڈ اور شیر تیندوے اور جنگلی سوٗر۔ اور لوگ بڑے مزے سے بیٹھے ہوئے لڑائی کا تماشا دیکھا کرتے تھے اور جوش میں آتے تھے۔ یہ جانور لڑتے لڑتے تھک جاتے تھے تو انہیں طرح طرح سے اُبھارتے تھے۔ سانڈوں کو سُرخ رنگ دکھایا جاتا تھا۔ سوٗروں کو سفید رنگ۔ بعض کے جسم میں سُرخ کئے ہوئے آنکس گھوپ دیئے جاتے تھے۔ بعض چابکوں سے پٹتے تھے۔ یہ تمام کھیل لوگ بڑے ذوق و شوق سے دیکھتے تھے اور بجائے مرعوب ہونے کے خوش ہوتے تھے۔

ان وحشیانہ تماشوں کے لئے بیشمار جانور باہر سے منگائے جاتے تھے۔ دُور دُور کے عمّال فرض سمجھکر شیروں ہاتھیوں شتر مُرغوں تیندووں کے غول کے غول تحفۃً بھیجا کرتے تھے۔ جتنا زیادہ جانور تُندخو ہوتا تھا۔ اُتنا ہی اچھا خیال کیا جاتا تھا۔

اِس وحشیانہ پن میں ایک عجیب نزاکت تھی۔ وُہ یہ کہ خُون کی بُو ناپسند خیال کیجاتی تھی اسی لئے سارے پتھر کے فرش کے نیچے نلیاں لگی ہوئی تھیں۔ اُن میں سے طرح طرح کی خوشبوؤں کے ابخرات سارے دنگل میں پہنچائے جاتے تھے۔

پھر صرف یہی مہیب کھیل کافی نہ سمجھے جاتے تھے۔ آدمیوں اور درندوں کی کشتیاں بھی ہوتی تھیں۔ بعض اُن آدمیوں میں سے مسلح ہوتے تھے۔ اور عموماً جانوروں پر غالب آجاتے تھے۔ بعض دفعہ نہتے شکاری آتے تھے۔ اور اپنی چالاکی اور پھرتی سے شیر کے سر پر کپڑا ڈال کر یا اُس کے حلق میں پہونچا ٹھونس کر شیر کو مغلوب کر لیتے تھے۔ پھر بڑے بڑے مجرم شیروں کی ضیافت کے لئے چھوڑے جاتے تھے۔ ایسے مجرموں میں بعض دفعہ کوئی غریب عیسائی بھی ہوتا تھا۔ اِس کا قتل لوگ بڑے شوق سے دیکھا کرتے تھے۔ اور یہ کھیل عموماً سب کے بعد دکھایا جاتا تھا اور سب کھیلوں سے عمدہ سمجھا جاتا تھا

ان جانوروں کی لاشیں خادم لوگ لوہے کے کانٹوں میں پھنسا پھنسا کر دُور کھینچ لے جاتے تھے۔ دنگل پر تازہ صاف ستھری تہ بچھائی جاتی تھی۔ خوشبوؤں کے بُقّے کے بُقّے چھوڑے جاتے تھے۔ اور اِس کے بعد قد آور قوی ہیکل نوجوانوں کا ایک گروہ نکلتا تھا۔ جن میں سے بعض کے پاس تلوار اور برچھی ہوتی تھی۔ بعض کے پاس ترسول اور جال۔ کوئی ہلکی سی زرہ پہنے ہوتا تھا۔ کوئی پُورے سپاہیانہ ساز و سامان سے آراستہ ہوتا تھا۔ کوئی گھوڑے پر سوار کوئی رتھ میں اور کوئی پیدل۔ یہ سب لوگ ملکر شہنشاہ کے آگے آتے تھے۔ اور تسلیم بجالا کر ہم آہنگ ہو کر پکارتے تھے۔ "بادشاہ سلامت مرنے والے تجھے سلام کہتے ہیں"۔ یہ لوگ شمشیر زن ہوتے تھے۔ انہیں ایسے ہی تماشوں کے لئے تربیت کرتے تھے۔ یہ غریب عموماً غلام ہوتے تھے۔ جنہیں فوجی مدرسوں میں تعلیم دیجاتی تھی۔ مگر بعض اوقات ان میں ایسے لوگ بھی ہوتے تھے جو اپنی خوشی سے دنگل کی لڑائی اپنا پیشہ قرار دے لیتے تھے۔ جو شمشیر زن موت سے بچ جاتے تھے۔

خدمت سے معذور سمجھے جاتے تھے۔ اور بڑھاپا آرام کے ساتھ بسر کرتے تھے۔

اُن لوگوں کی لڑائیاں طرح طرح سے ہوتی تھیں۔ کبھی ہلکی زرہ والے سپاہی اور جال بردار کا جوڑ لڑتا تھا۔ کبھی بھالا بردار اور برچھی بردار کا اور کبھی دو پُورے مسلّح جنگجوؤں کا۔ بعض دفعہ دست بدست لڑائی نہ ہوتی تھی۔ ہلّا بول دیا جاتا تھا۔ جب کوئی شمشیر زن مدمقابل کو زخمی کر دیتا تھا تو حاضرین کی طرف خطاب کر کے پکارتا تھا "وُہ مارا" اور اسکا منتظر رہتا تھا کہ حاضرین اُسکا مارا جانا پسند کرتے ہیں۔ یا چھوڑا جانا۔ اگر لوگ انگوٹھے بلند کر دیتے تھے تو مغلوب کو موقع دیا جاتا تھا۔ کہ پھر اُٹھ کر وار کرے۔ اگر وُہ انگوٹھے نیچے کر لیتے تھے تو یہ مغلوب کے قتل کا نشان سمجھا جاتا تھا۔ غریب مغلوب آخری وار لینے سے اگر کچھ کراہت ظاہر کرتا تھا تو ہر طرف سے تحقیر کے طعنے بلند ہوتے تھے۔

مقدس راہب عورتیں نرم دل ہائیں نیکدل حاکم اور مشیر سب اس بیرحمی کو معصومانہ کھیل سمجھتے تھے۔ خاص لوگ جنگل میں جا کر جانکنی کا تماشا دیکھتے تھے۔ اور لاش کے گھسیٹے جانے سے پیشتر خاص خاص بہادروں کے خون کو چکھا کرتے تھے۔

شمشیر زنوں کا کھیل اہل رُوما کے لئے بڑا دلچسپ کھیل تھا۔ یہ کھیل اُس وقت تک بھی برابر رائج رہا۔ جسوقت غیر ملک کے حملہ آوروں نے روما پر حملے کرنے شروع کئے۔

آہ! "تمہاری جان گئی آپ کی ادا ٹھہری"۔

سیّد نذیر حسین

قومی زندگی

ہمارے مکرم دوست شیخ محمد اقبال صاحب ایم۔ اے گرمی کی تعطیلوں میں اپنے برادر معظم شیخ عطا محمد صاحب سب ڈویژنل آفیسر ایبٹ آباد کے پاس تشریف لے گئے تھے۔ وہاں کے اصحاب نے باصرار شیخ صاحب سے ایک لکچر لکھوایا۔ اُس لکچر کا خلاصہ ہم ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں :۔

قوموں کی تاریخ میں یہ ایک بڑا نازک وقت ہے جو اس بات کا متقاضی ہے کہ ہر قوم نہ صرف اپنی موجُودہ حالت پر غور کرے۔ بلکہ اگر اسے اقوامِ عالم کے دفتر میں اپنا نام قائم رکھنا منظور ہے۔ تو اپنی آیندہ نسلوں کی بہبُودی کو بھی ایک موجُودہ واقعہ تصوّر کرے اور ایسا طریقِ عمل اختیار کرے جسکے احاطۂ اثر میں اس کے اخلاف کا تمدّن بھی شامل ہو۔ ایک زمانہ تھا۔ جب کہ اقوامِ دنیا کی باہمی معرکہ آرائیوں کا فیصلہ تلوار سے ہُوا کرتا تھا۔ اور یہ فولادی حربہ دنیائے قدیم کی تاریخ میں ایک زبردست قوّت تھی۔ مگر حال کا زمانہ ایک عجیب زمانہ ہے جس میں قوموں کی بقا اُنکے افراد کی تعداد اُنکے زورِ بازو اور اُن کے فولادی ہتھیاروں پر انحصار نہیں رکھتی۔ بلکہ اُن کی زندگی کا دارومدار اس کاٹھ کی تلوار پر ہے جو قلم کے نام سے موسُوم کیجاتی ہے۔ آجکل کی جنگوں کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ قومیں ہتھیار بند ہوں اور ایک خاص میدان میں آراستہ ہو کر جدال و قتال کا بازار گرم کریں۔ نہ آج کل یہ ضروری ہے۔ کہ کوئی قوم کسی ہمسایہ قوم پر فتح پانے کے لئے اس کے مُلک پر چڑھائی کرے۔ یہ تمام سامان زمانۂ قدیم کے ساتھ مختص ہے۔ ہمارے زمانے میں ایک اَور خاموش قوّت ہے۔ جس پر قوموں کی بقا و فنا انحصار رکھتی ہے اور جس کے بل پر ایک قوم گھر بیٹھے دُوسری قوم کو ہمیشہ کے لئے صفحۂ عالم سے حرفِ غلط کی طرح مٹا سکتی ہے۔ ہاتھوں کی لڑائی کا زمانہ گذر چکا۔ اب دماغوں تہذیبوں اور تمدنوں کی ہنگامہ آرائیوں

کا وقت ہے اور یہ جنگ ایک ایسی جنگ ہی جسکے زخم رسیدہ زنگاری اور کافوری مرہم سے ہرگز اچھے نہیں ہو سکتے۔ ظاہری فاصلہ جو قوموں کے خلا و ملا میں بمنزلہ ایک سد سکندری کے تھا۔ اب ریل اور پیام برقی کی حیرت انگیز ایجادوں سے گویا بالکل معدوم ہو گیا ہے اور وُہ ممالک جو کبھی ناپیدا کنار سمندروں کی وجہ سے ایک دُوسرے سے اِس قدر دُور تھے کہ ایک کو دُوسرے کی ہستی کا بھی علم نہ تھا۔ موجُودہ صدی میں فن جہاز رانی کی تعجّب خیز ترقّی سے ایک شہر کے دو محلّوں کی طرح معلوم ہوتے ہیں۔ جس سے دُنیا کی تمام قومیں ایک دوسری کی تہذیب و تمدّن سے روز بروز متاثّر ہو رہی ہیں۔ برق جسکی مضطربانہ چمک تہذیب کے ابتدائی مراحل میں انسان کے دِل میں مذہبی تاثرات کا ایک ہجُوم پیدا کر دیا کرتی تھی۔ اب اسکی پیام رسانی کا کام دیتی ہے۔ سٹیم اس کی سواری ہے اور ہوا اس کے پنکھے جھلا کرتی ہے۔ آفتاب جس کی عظمت وجلال نے نہ صرف ابراہیم کی باریک بین نگاہوں کو دھوکے میں ڈالدیا تھا بلکہ ایک مہذّب قوم کے دل و دماغ کو بھی متاثر کر دیا تھا۔ اب اپنی حرارت اور روشنی کو حضرتِ انسان کے اشارے پر صرف کرتا ہے۔ غرضیکہ نظامِ قدرت کے وہ تمام محض قوائے جنکے ناقابل تشریح عمل سے مرعُوب ہو کر قدیم قومیں انہیں رُبُوبیّت کے لباس سے مزیّن کر کے انکے لئے عظیم الشان معابد تعمیر کیا کرتی تھیں۔ موجُودہ علوم کی وساطت سے انسان کے دست بستہ غُلام ہیں۔ اور یہ ظلوم و جہُول اس عظیم الشان امانت کا بار اُٹھائے۔ جسکے اُٹھانے سے پہاڑوں نے بھی انکار کر دیا تھا۔ اپنے اشرف المخلوقات ہونے پر بجا ناز کر رہا ہے۔ اسکی مستفسرانہ نگاہیں قدرت کے سربستہ رازوں کو کھول رہی ہیں۔ اور اسکا دماغ انہی علمی فتوحات کے سہارے پہاڑوں سمندروں دریاؤں حتّٰی کہ چاند سُورج اور ستاروں پر بھی حکومت کر رہا ہے۔ یہ ہے وُہ حیرت انگیز تغیر جو زمانۂ حال کو زمانۂ ماضی سے متمیّز کرتا ہے اور جسکی حقیقت اس امر کی متقاضی ہو کہ تمام قومیں جدید رُوحانی اور جسمانی ضروریات کے پیدا ہو جانے کی وجہ سے انہی اپنی

زندگی کے لئے نئے سامان بہم پہنچائیں۔ میرا منشا یہ ہے کہ اس تغیر کے لحاظ سے اقوام ہندوستان اور خصوصًا مسلمانوں کی موجودہ حالت پر ایک نظر دوڑاؤں اور اس امر کو واضح کروں کہ زندگی کی کٹھن راہ میں ہمیں کون کون سی مشکلات درپیش ہیں اور ہمیں ان کے ازالے کے لئے کیا کیا تدابیر اختیار کرنی چاہئیں۔ میرا مقصد زیادہ تر ناظرین کے دل و دماغ کو قومی زندگی کے اہم اور ضروری سوال کیطرف متوجہ کرنا ہے۔ اور اگر ناظرین سے کسی ایک فرد کو بھی اس ضروری مسئلے پر سوچنے کی تحریک ہو گئی تو میں سمجھونگا کہ یہ مضمون لاحاصل نہیں گیا۔

واقعاتِ عالم کے مشاہدے سے حکما اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ زندگی کی مختلف صورتوں یعنے انسانوں حیوانوں پودوں وغیرہ میں ایک قسم کے عالم گیر جنگ شروع رہتی ہے۔ گویا نظامِ فطرت کارزار زندگی کا ایک دردناک نظارہ ہے۔ جس میں ہر طبقے کے حیوان اپنے ہمسایہ طبقوں سے برسرپیکار رہتے ہیں۔ اس کشمکش حیات میں کام یاب ہونے کے لئے ہر طبقہ زندگی مصروف رہتا ہے۔ لیکن فتح صرف اُسی طبقے کو حاصل ہوتی ہے جس میں رہنے کی قابلیت ہو یعنے جس نے زندگی کے متغیرہ حالات کے ساتھ موافقت پیدا کر لی ہو۔ صدہا اقسام کے عجیب و غریب چوپائے اور پرندے کبھی روئے زمین پر اور سمندروں میں موجود تھے۔ مگر اب انکا نام و نشان بھی نہیں ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہی کہ جوں جوں زندگی کے حالات اور اس کے شرائط تبدیل ہوتی گئیں۔ یہ حیوان فنا ہوتے گئے۔ کیونکہ یہ اس انقلاب کے مختلف مراحل میں حالات کے ساتھ موافقت پیدا نہ کر سکے۔ یہ قانون جس کو حکما، حال نے کمال محنت سے دریافت کیا ہے ایک عالمگیر قانون ہے۔ انسان حیوان چرند پرند درخت غرضکہ زندگی کی کوئی ایسی صورت نہیں۔ جو اس کے اثر سے آزاد ہو۔ لیکن میں اسوقت یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ اس زبردست قانون نے طبقۂ انسانی کے نشو و نما اور اس کے ارتقاء پر کیا عمل کیا ہے اور اب کیا کر رہا ہے۔ کیا موجودہ انسان

ابتدا سے ہی ایسا تھا جیسا اب ہے؟ نہیں ہرگز نہیں۔ نوعِ انسان و موجودہ نسل ان زبردست قومی تہذیبوں اور تمدنوں کی یادگار ہے۔ جو زندہ رہنے کی کوشش میں فنا کا شکار ہوئیں اور فنا بھی اس طرح ہوئیں کہ اسوقت انکا نام و نشان تک صفحہ ہستی پر موجود نہیں ہے۔ اہرام مصری کے بانی ہزار ہا سال ہوئے مٹ گئے۔ یونانیوں کے اشراقین اورمشائین کے فلسفے رہ گئے۔ لیکن قوم کا نام و نشان تک بھی دنیا میں نہیں ہے۔ افریقہ کی وہ زبردست قوم جس کے دلیر فوجی افسروں نے ممالک مغرب کو پامال کر کے اہل روما کی عظیم الشان سلطنت پر حملے کئے تھے۔ اب کہاں ہے؟ کیا اس قوم کی کوئی یادگار باقی ہے؟ صدہا قومیں پیدا ہوئیں۔ پھلیں پھولیں۔ اور آخر کار اس اٹل قانون کے عمل سے متاثر ہو کر خاک میں مل گئیں۔ نوعِ انسان کی موجودہ ترقی جیسا کہ ان واقعات سے معلوم ہوتا ہے۔ کوئی سستے داموں کی چیز نہیں ہے۔ سیکڑوں قومیں علمی اور تمدنی ترقی کی حسین دیوی کے لئے قربان ہوتی ہیں۔ اور ہزاروں افراد کا خون اس کے خوفناک قربانگاہ پر بہایا جاتا ہے۔ جنگیں وبائیں اور قحط اس ہمہ گیر قانون کے عمل کی عام صورتیں ہیں اور اگر انکو ارتقاء نوع انسانی کے اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ واقعات جو بظاہر آفات سماوی معلوم ہوتے ہیں۔ طبقہ انسانی کے لئے ایک برکت ہیں جسکا وجود نظامِ قدرت کی آراستگی کے لئے انتہا درجہ کا ضروری ہے۔ اس قانون کا اثر اقوامِ انسانی تک ہی محدود نہیں ہے۔ بلکہ بزمِ ہستی کے کسی حصّے کی طرف نگاہ کرو اسکا عمل جاری نظر آئیگا۔ سیکڑوں مذاہب دنیا میں پیدا ہوئے۔ بڑھے۔ پھلے پھولے اور آخر کار مٹ گئے۔ کیوں؟ اس کی وجہ یہی ہے کہ انسان کے عقلی ارتقا کے ساتھ ساتھ جدید روحانی ضروریات پیدا ہوتی گئیں۔ جنکو ان مذاہب کے اصول پورا نہ کر سکے۔ یہی سبب ہے کہ اہلِ مذہب کو وقتاً فوقتاً نئے نئے علم کلام ایجاد کرنے کی ضرورت پیش آتی رہی۔ جن کے اصول کے رو سے انہوں نے اپنے اپنے مذاہب کو پرکھا اور ان کی تعلیم کو ایسی صورت

ہیں پیش کرنے کی کوشش کی جو علمی اور رُوحانی زندگی میں انسان کی راہ نما ہو سکے۔ علیٰ ہذا القیاس ایک زمانہ تھا۔ جب یونانی لاطینی اور سنسکرت وغیرہ زندہ زبانیں تھیں۔ مگر اب ایک عرصے سے یہ زبانیں بیجان ہو چکی ہیں۔ اُنکی موت کا راز اس قانون کا عمل ہے اور خود پنجابی زبان جسکو ہم روزمرہ استعمال کرتے ہیں۔ اِس سے روز بروز متاثر ہو رہی ہے۔ سیکڑوں الفاظ ہیں جو تعلیم یافتہ لوگوں کے روزمرّہ استعمال میں ہیں مگر اس زبان میں موجُود نہیں۔ اظہارِ خیالات کے جدید طریق ہماری عقلی ترقی کی وجہ سے پیدا ہوئے ہیں۔ یہ زبان ان کے ادا کرنے سے قاصر ہے۔ ایسے حالات میں یہ لازم ہے کہ اس زبان کا حشر بھی وُہی ہو جو اَور قدیم زبانوں کا ہوا ہے۔ حال کی قوموں کی طرف نظر دوڑاؤ تو معلوم ہوگا کہ امریکہ اور اسٹریلیا کی اصلی قومیں ایک اعلیٰ تر تمدّن و تہذیب کے سیلِ رواں کے آگے قریبًا قریبًا نیست و نابود ہو گئی ہیں۔ اور ممالکِ ایشیا میں چینی ایرانی اور وسط ایشیا کی قومیں اس قانون کے عمل سے روز بروز متاثر ہو رہی ہیں۔ یہانتک کہ حکما کے خیال میں ان اقوام کی آئندہ حالت نہایت مخدوش ہے۔ ان واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ صاف ہستی نوع انسان کی ترقی کے لئے ضروری ہے اور یہ نہال صرف اس صورت میں بار آور ہو سکتا ہے۔ کہ ہزاروں چھوٹے چھوٹے پودے اُس کے نمو کی خاطر بادِ سموم کی نذر ہو جائیں۔ جس طرح نوع انسان کی مجموعی ترقی کے لئے مختلف اقوام کا نیست و نابُود ہونا ضروری ہے۔ اِسی طرح یہ بھی لازم ہے کہ کسی خاص قوم کے ارتقار کے لئے کئی افراد نذرِ اجل ہو جائیں۔ یا اور قوم کے نشوونما کی خاطر اُن کے ذاتی حقوق کی کوئی پرواہ نہ کیجائے۔ لیکن یہاں ایک عجیب اور مشکل سوال پیدا ہوتا ہے اور وُہ یہ ہے کہ جس صورت میں کسی خاص فرد کو قوم کی آئندہ نسلوں کی بہبُودی اُنکی عظمت و جلال اور اُنکے عقلی اور تمدّنی ترقی میں کوئی دلچسپی نہیں ہے تو کیُوں اس کے ذاتی حقوق پر قومی ارتقار کو ترجیح دیجائے؟ کیا میں آج سے سو سال بعد

زندہ ہونگا؟ نہیں پھر مجھے کیا ضرورت ہے کہ میں اپنے آپ کو قوم کے لئے قربان کروں اور اپنی نیند حرام کر کے قوم کی آئندہ بہبودی کے لئے بے خواب راتیں بسر کروں؟ یہ بےچین کرنے والا سوال ہے۔ جو کسی قوم کے افراد کے دلوں میں پیدا ہونا ممکن ہے اور جسکا کوئی عقلی جواب ہمارے پاس نہیں ہے۔ لیکن اس خطرناک شبہہ کے وقت مذہب اپنی دستگیری کرتا ہے اور ہمیں بتاتا ہے کہ ایثار یعنے اوروں کے نفع کو اپنے ذاتی نفع پر مقدم رکھنے کی بنا عقل نہیں ہے۔ بلکہ یہ نیکی جو ارتقاء نوعِ انسانی اور قومی کے لئے سخت ضروری ہے ایک فوق العادت اصُول پر مبنی ہے۔ آواز نبوت کا اصلی زور اور اسکی حقیقی وقعت عقلی دلائل اور براہین پر مبنی نہیں ہے۔ بلکہ اسکا دار و مدار اس روحانی مشاہدے پر ہے۔ جو نبی کی غیر معمولی قوائے کو حاصل ہوتا ہے اور جسکی بنا پر اُس کی آواز میں وُہ ربانی سطوت جبروت پیدا ہو جاتا ہے۔ جس کے سامنے انسانی شوکت ہیچ محض ہے۔ یہ ہے نمود مذہب کا اصلی راز جسکو سطحی خیال کے لوگوں نے نہیں سمجھا اور اسے غلطی سے اُنہوں نے اصُولِ مذہب کو خونریزیوں اور عالمگیر جنگوں کا محرک تصوّر کیا ہے۔ یہی حقیقت ہے قُربانی کی۔ جسکو تمام دُنیا کی قوموں نے وقتاً فوقتاً مختلف صُورتوں میں اختیار کیا ہے۔ باریک بین لوگ جانتے ہیں۔ کہ اگر قبائلِ انسانی کو ایثار کی تعلیم نہ دیجاتی تو یقیناً ارتقاء انسانی کا سلسلہ ٹوٹ جاتا اور موجُودہ تہذیب و تمدن کی وہ صُورت مطلق نہ ہوتی جو آج ہے۔ اگر ارتقاء تمدن و تہذیب انسان کو ایک درخت سے تعبیر کیا جاوے تو مذہب اسکا ایک پھل ہوگا۔ اور پھل بھی ایسا پھل جس کا کھانا قومی زندگی کے لئے ایسا ہی ضروری ہے۔ جیسے پانی ہوا اور غذا کا استعمال جسمانی بقا کے لئے لازم ہے مذہب کچھ تعلیم ایثار کی رُو سے ہی ارتقاء انسانی کا ممد نہیں ہے۔ بلکہ اسکا ایک اور پہلو بھی ہے۔ جسکو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اہل نظر جانتے ہیں۔ زمانۂ قدیم میں غلامی تمدن انسانی کا ایک ضروری جزو تصوّر کی جاتی تھی۔ یہانتک کہ افلاطون جیسے فلسفی

نے بھی اِسے اپنی کتاب المملکت میں جائز قرار دیا ہے - اس جواز کی ایک وجہ بھی ہے اور وُہ یہ ہے کہ اس زمانے میں کسی سے اُجرت پر کام کرا لینے کا خیال بھی انسانی ذہن میں نہیں آسکتا تھا - ملازمت ایک آزاد معاہدہ نہیں تصوّر کی جا سکتی تھی - اور چونکہ نظامِ تمدّن اصُولِ ملازمت کے بغیر قائم نہیں رہ سکتا تھا - اسواسطے غلامی کو جائز قرار دینا لازمی ہوا اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ افرادِ انسانی کی ایک بہت بڑی تعداد بیجان اشیاء کی طرح ملکیت سمجھی جانے لگی - اور آخر کار اس آزاد جنگ کے میدان سے خارج ہو گئی - جو ارتقاء انسان کے لئے نہایت ضروری ہے - سب سے پہلے نبی عرب نے انسان کی فطری آزادی کی تعلیم دی اور غلاموں اور آقاؤں کے حقوق کو مساوی قرار دیکر اس تمدّنی انقلاب کی بنیاد رکھی جس کے نتائج کو اسوقت تمام دُنیا محسُوس کر رہی ہے - ایسا کرنا گویا نوعِ انسانی کے ایک کثیر حصّے کو اس آزاد مقابلے کے میدان میں واپس لے آنا تھا - جس کے اثر سے تمدن و تہذیب کی اعلیٰ صُورتیں پیدا ہوتی ہیں اور جو دُنیا کی تمام تہذیب و شائستگی کی بیخ و بنیاد ہے - حکیمِ عرب کی اس مُبارک تعلیم کا نتیجہ کیا ہوا - مسلمانوں میں غلام بادشاہ ہُوئے - غلام وزیر ہُوئے - غلاموں کو اس کی تعلیم دی گئی - غلاموں میں فلسفی اور ادیب پیدا ہوئے - غرض کہ اس قبیح امتیاز کے مِٹ جانے سے ہر غلام ایک اعلیٰ خاندان کے آدمی کے ساتھ عقلی مقابلہ کر سکتا تھا اور اس مقابلے میں کامیاب ہو کر سلطنت کے اعلیٰ ترین مناصب پر پہنچ سکتا تھا - اس تعلیم کا سب سے اعلیٰ نمونہ جنابِ فارُوق نے پیش کیا - جب کہ وُہ بیت المقدس کے فتح کے لئے جا رہے تھے - جہاں تک مجھے معلوم ہے دُنیا کی کسی قوم کی تاریخ ایسی مثال پیش نہیں کر سکتی اور مسلمان اس تعلیم پر جس قدر ناز کریں بجا ہے - علیٰ ہذا القیاس عورتوں کے حقوق کا نازک مسئلہ ہے - جس کے متعلق حکیمِ عرب نے ایسی ہی آزادانہ تعلیم دی - مگر چونکہ یہ مضمون نہایت وسیع اور بحث طلب ہے اسواسطے میں اسے یہاں نظر انداز کرتا ہُوں - البتّہ مناسب مقام پر اس کی طرف چند اشارات کرونگا

لیکن شرائطِ زندگی کے متعلق ایک اَور غور طلب بات ہے - کیا وُہ تمام حالات جنپر کسی قوم کی زندگی کا دارومدار ہے - انسانی کوشش سے ایک خاص ترتیب میں جمع ہو سکتے ہیں؟ بالفاظِ دیگر قوم کی زندگی قوم کے اختیار میں ہے - یا پودوں اور حیوانوں کی طرح افراد انسانی کی زندگی بھی قوائے فطرت کے غیر اختیاری عمل پر منحصر ہے ؟ اگرچہ زندگی کی اصلیت مخلوقات کی صُورت میں وُہی ہے - تاہم انسان اپنی عقلِ خداداد کی وجہ سے آفرینش کی ہر صُورت سے متمیز ہے - اللہ تعالےٰ نے اسے ایک ایسی قوت دی ہے - جس کے وساطت سے یہ شرائطِ زندگی کو سمجھ سکتا - اور ہر انقلاب کے لوازم پر غور کرسکتا ہے - اسکی گرفت ایسی زبردست ہے کہ یہ قدرت کے محض قوائے کو معلوم کر کے ان سے فائدہ اُٹھا سکتا اور اپنی ارتقار کے رُخ کو متعین کرسکتا ہے - جب یہ دیکھتا ہے کہ آبادی کی افزائش کے ساتھ زمین کی پیداوار قدرتی اسباب سے کم ہو رہی ہے تو یہ ان اسباب کا مقابلہ کرتا ہے اور مختلف اقسام کی ایجادوں سے ان کے مخالف کو روک کر اپنی زندگی کے سامان بہم پہنچاتا ہے - اگر انسان عقل کے زیور سے معرا ہوتا تو ترقی تہذیب و تمدن کے لئے کوشش کرنا بالکل بے سُود ہوتا - ہماری زندگی حیوانوں اور درختوں کی طرح ہوتی - ہم کسی انقلاب کا مقابلہ نہ کرسکتے اور ہماری بقاو فنا کا انحصار محض قدرتی اسباب پر ہوتا جنکی قوت کے سامنے ہم بالکل بیکس ہوتے -

یہانتک تو مَیں نے شرائطِ زندگی پر زیادہ تر نظری لحاظ سے بحث کی ہے - اب مَیں واقعات کی طرف آتا ہوں - جن سے مَیں چند ایسے نتائج پیدا کرنے کی کوشش کرونگا جو اہل ملک و قوم کے لئے عملی لحاظ سے مفید ہوں - اگر ہم متمدن دُنیا کی گذشتہ اور موجودہ تاریخ کو دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اقوام قدیمہ میں سے صرف چار قومیں ایسی ہیں - جو قوانین زندگی کی تیز تلوار سے بچکر بُری بھلی حالت میں اب تک صفحہ ہستی پر قائم ہیں یعنی چینی ہندو بنی اسرائیل اور پارسی - حال کی قوموں میں سے دیگر مغربی اقوام کے

علاوہ ایشیا میں جاپانی اور فرنگستان میں اہلِ اطالیہ دو قومیں ایسی ہیں - جنہوں نے موجودہ تغیر کے مفہوم کو سمجھ کر اپنے تمدّنی اخلاقی اور سیاسی حالات کو اسکے مطابق کرنیکی کوشش کی ہے لیکن چونکہ ہندوؤں اور چینیوں کی قومی زندگی کے اسباب اسرائیلیوں اور پارسیوں کی قومی زندگی کے اسباب سے بالکل مختلف ہیں - اور جہانتک مضمون زیرِ بحث کا تعلق ہے - ہمیں کوئی علمی فائدے ابھی نہیں دے سکتے - اسواسطے میں ان دونوں قوموں کے دلچسپ اور حیرت انگیز سرگذشت کی طرف اشارہ نہیں کرونگا - اگرچہ یہ ساری قومیں قومی زندگی کے اصل مفہوم کو ادا نہیں کرتیں : تاہم یہ بات کچھ کم تعجب خیز نہیں ہے - کہ باوجود تمام خارجی یورشوں کے جوان کے ممالک پر وقتاً فوقتاً ہوتی رہیں - باوجود صدہا سال کی غلامی اور دیگر ارضی وسماوی آفات کے جوان قوموں نے برداشت کیں - انکا نام ونشان اب تک قایم ہے - بنی اسرائیل کی تاریخ ایک دردناک کہانی ہے - جسکو ایک دردمند دل سُن بھی نہیں سکتا - تاہم یہ قوم اپنے فطری قوائے کے لحاظ سے اس قدر حیرت انگیز ہے کہ کوئی مشرقی اور مغربی قوم سوائے ہندوؤں کے اسکا مقابلہ نہیں کرسکتی - دنیا کا سب سے پہلا مقنن اور توحیدِ مطلق کے پہلے اُستاد حضرت موسیٰ علیہ السلام تھے - علیٰ ہذا القیاس زمانہ حال میں توحید وجود کا پہلا اُستاد بھی ہالینڈ کا ایک یہودی تھا - تعجب ہے کہ حقیقتِ اشیاء کے یہ دو اصول جو بظاہر ایک دوسرے کے نقیض ہیں اور جو دنیا کی تہذیب وتمدّن میں سب سے بڑی قوتیں ہیں - ایک ہی قوم کے دل ودماغ سے کس طرح پیدا ہوئے - اگرچہ توحیدِ وجود کا مسئلہ آلِ یافث کی ایشیائی شاخ یعنے ہندوؤں میں ایک حیرت انگیز ترقی پاچکا تھا تاہم یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ ہالنڈ کے یہودی یعنے سپائی نوزا کی تعلیم ویدانت کے دقیق فلسفے سے بالکل متاثر نہیں ہوئی - سینکڑوں پیغمبر اس برگزیدہ قوم میں مبعوث ہوئے سینکڑوں شہنشاہ اور ہزاروں مقنن پیدا ہوئے - جنہوں نے قوم کے تمدن اور اسکی تہذیب کو معراجِ کمال تک پہنچایا - مگر آخر قہر الٰہی نے قوانین حیات کی صورت میں اپنا عمل کیا -

اور یہ قوم غلامی کی خوفناک مصیبتیں اُٹھاتی وطن سے بے وطن ہُوئی۔ نہ وُہ عظمت رہی نہ وُہ سلطنت نہ وُہ شوکت نہ وُہ تہذیب نہ وُہ تمدن غرضکہ پریشان اور خستہ حال ہوکر مغربی ممالک میں منتشر ہوگئی اور اب تک غیر اقوام کی سختیاں اُٹھا رہی ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ اس قوم کی ایک شاخ یعنے قوم افاغنہ ایشیا کے ایک کوہستانی حصے میں آزاد حکومت کر رہی ہے۔ تاہم قوموں کے عروج و زوال کے اسباب پر غور کرنے والے اس بات کو جانتے ہیں کہ اگر افغانوں نے موجُودہ انقلاب کے مفہوم کو نہ سمجھا اور اپنی آزاد حکومت سے تمدنی فواید نہ اُٹھائے تو یقیناً یقیناً اُنکا وُہی حال ہوگا جو وسط ایشیا کی موجُودہ قوموں کا ہو رہا ہے۔ باوجُود ان تمام مصائب کے جو قوم بنی اسرائیل نے زمانے کے ہاتھوں برداشت کئے۔ حیران کردینے والی بات یہ ہے کہ یہ قوم اب تک زندہ ہے اگرچہ قومیت اور حکومت نہیں رہی تاہم دولت کا یہ حال ہے کہ دُنیا کی بڑی بڑی سلطنتیں اس قوم کی مقروض ہیں۔ اور اس دولت کے بل پر یہ قوم ایک عرصے سے اس تجویز کو عملی صُورت دینے میں مصروف ہے کہ سلطنتِ عثمانیہ سے اپنا آبائی وطن خرید کر اپنی پُرانی عظمت و جلال کی ازسرِنو بنیاد رکھے۔ یہُودیوں کو چھوڑ کر پارسیوں کی تاریخ پر نگاہ ڈالو۔ ایک زمانے میں عظیم الشان قوم تھی۔ یہُودیوں کی طرح اس قوم میں بھی پیغمبر مبعُوث ہُوئے۔ کیانی تہذیب و تمدّن انتہائی نُقطہ تک پہنچا۔ اور آخرکار شہنشاہ یزدجرد کے عہد میں عربی تلواروں نے کیانی شائستگی کو صفحہ عالم سے معدوم کردیا۔ اور موبدوں کی آواز ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگئی۔ آتشکدے ویران ہوگئے اور پیروان زرتشت وطن سے بے وطن ہوکر ہندوستان میں پناہ گزین ہُوئے۔ لیکن کیا یہ قوم صفحہ ہستی سے مٹ گئی ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں قوموں نے اس انقلاب کے مفہوم کو کسی قدر سمجھ لیا ہے۔ جس کی سب سے بڑی خصوصیت صنعت و تجارت ہے دُنیا کی تجارت کا ایک کثیر حصّہ ان کے ہاتھوں میں ہے۔ اور یہی وجہ ان کے سنبھل جانیکی ہے۔

(باقی آیندہ) اقبال

اصلاحِ حسرت

جناب ایڈیٹر صاحب - آپ کے اخلاقِ حسنہ نے ہم لوگوں کا تو ناک میں دم کر دیا ع
ہماری جان گئی آپ کی ادا ٹھہری - موہانی صاحب ہیں کہ بار بار مخزن پر بجا و بیجا حملے کئے جا رہے ہیں - اور آپ ہیں کہ پروا تک نہیں کرتے - کوئی اس قدر بھی صلح کل ہوتا ہے؟ آپ نے شاید چاہا ہوگا کہ حسرت جیسے دشمن کو آشتی سے دوست بنالیں مگر وُہ ایسے دن پیدا ہی نہیں ہوئے کہ اُنکے ساتھ نرمی کا برتاؤ فائدہ دے - لاتوں کے دیو کہیں باتوں سے مانتے ہیں؟
جب مخزن میں پنجابی اور اقبال نے موہانی صاحب کو لتاڑ بتائی تو آپ نے کچھ اس قسم کے معذرت آمیز سے فقرے لکھے تھے کہ ہم مخزن کو میدانِ کارزار بنانا نہیں چاہتے اور تُو تُو مَیں مَیں کے شغل کو پسند نہیں کرتے - وغیرہ وغیرہ - صاحب! یہ درست فرمایا مگر جب ایک شخص کی جانب سے چھیڑ چھاڑ کی ابتدا ہو اور وُہ آپ پر حملہ کرے اور بار بار حملہ کرے اور حملہ بھی صریحًا حاسدانہ اور گستاخانہ - اُس سے آپ ایک دفعہ درگذر کر سکتے ہیں دو دفعہ درگذر کر سکتے ہیں - بار بار درگذر کرنا عوام کالانعام میں کچھ اَور ہی معنے رکھیگا کہ گویا آپ نے شکست مان لی - یہ بات کم از کم اس بندۂ درگاہ کو تو سخت ناگوار ہے -
آپ کے صُلح کل ہونے میں کسی کو کلام نہیں اور آپ دُنیا میں کسی سے تعرّض نہ کریں - لیکن ازراہِ کرم اجازت دیجے کہ حضرت حسرت سے اور اس نیاز مند سے کچھ تھوڑی سی ناز و نیاز کی باتیں مخزن ہی کے صفحات میں وقتًا فوقتًا ہو جایا کریں - اُنکے دماغ کو سلامت اور صحت پر لانا نہایت ضروری ہے اور وُہ ہیں کہ روز بروز زیادہ ہی زیادہ مخبوط الحواس ہوتے جاتے ہیں - دکن میں تو پروفیسر نقّاد نے نہایت قابلیت سے سلسلۂ اصلاحِ اردوئے معلّے شروع کر رکھا ہے اور مجھے اُن کے کام سے ہر طرح سے ہمدردی ہے - مگر مَیں بھی وقتًا فوقتًا اُن کا ہاتھ بٹا کر خاص

اڈیٹر اُردوئے معلّٰی کی نظم و نثر کو اصلاح دیا کرونگا۔ پروفیسر نقاد کی باضابطہ جماعتِ طلبہ میں اُردوئے معلّٰی کے نامہ نگار بھی داخل ہیں۔ وُہ کیا اڈیٹر اور کیا نامہ نگار سب کو پڑھاتے ہیں اور آجکل ابجد شروع کرا رکھی ہے۔ مَیں صرف اڈیٹر صاحب کے خارجی وقت کا اُستاد ہونگا۔

یہ تکلیف مَیں اپنے اُوپر گوارا نہ کرتا اگر دو خوفناک مرضوں کو روز بروز حضرت حسرت پر مسلّط ہوتے نہ دیکھتا اوّل مخزن اور اہلِ مخزن سے حسد دُوسرے جہل مرکّب۔

موہانی صاحب کا مخزن سے حسد کرنا بالکل تحقیق ہے لفظِ تنقید کے مفہُوم کو دیکھئے اور تنقید کی ذیل میں زیادہ تر جو کچھ مخزن کے بارے میں کہا جاتا ہے اُسکو دیکھئے۔ حالانکہ اَور رسالوں کے بارے میں عمومًا خوبیاں ظاہر کر دی جاتی ہیں اور کوتاہیاں چھپالی جاتی ہیں مگر مخزن کی بُرائیاں (واقعی یا خیالی) گنوا دی جاتی ہیں اور خوُبیوں پر خاموشی کا پردہ ڈالدیا جاتا ہے۔ یہ حسد نہیں تو اَور کیا ہے؟ مخزن ماہِ اگست سنہ ۱۹۰۴ء کے اغلاط کی ایک فہرست مرتّب کر کے اُردوئے معلّٰی ماہ ستمبر سنہ ۱۹۰۴ء میں چھاپی گئی ہے۔ اُسی فہرست کے بعد اسی عنوانِ تنقید کی ذیل میں گلدستۂ بہار کی خوُبیاں ہی خوُبیاں لکھدی ہیں کوتاہیاں ندارد۔ حالانکہ اسی نمبر گلدستۂ بہار میں گھٹیا غزلیں اور لچر اشعار اور غلط نثر بھی موجُود ہے جسکی تفصیل یہاں کرتا ہُوں تو گلدستۂ مذکوُر سے خواہ مخواہ کی پرخاش ہوتی ہے۔ اور مجھے صرف حضرت حسرت کو کچھ سکھانا منظور ہے۔ مطلب صرف اس قدر ہے کہ حسرت صاحب کو گلدستۂ بہار کی خوشامد ہے یا کم از کم اُس سے حسد نہیں اس لئے اُس کی کوتاہیاں نظر نہ آئیں البتّہ مخزن کی بُرائیاں دماغ پر ایسی مستولی ہوئیں کہ سر چکرا گیا اور عقل خبط ہو گئی۔ اُدھر حسد کا پردہ تو آنکھوں پر پڑا ہوا تھا ہی پھر خوُبیاں کیا نظر آتیں؟

اب غضب یہ ہے کہ جو فہرستِ اعتراضات اُردوئے معلّٰی ماہِ ستمبر میں چھپی ہے اُسکو طوُل بنانے کی غرض سے کاتب کے سہو تک صاحبِ مضمون کی طرف منسُوب کر دئے ہیں حالانکہ کاتبوں کے مظالم سے وُہ سب لوگ واقف ہیں جنہوں نے مطابع کی عملی کارروائی کبھی ذرا بھی دیکھی ہے یا کبھی بھی کوئی چیز چھپوائی ہے۔ خصوُصًا ایسے مطابع میں جہاں کام کی کثرت ہو۔ مثلاً دو اعتراض

کی بنا پر یکّا سہو کاتب ہی۔ "مبارک دیتے ہیں" "کتاب پرشیا کا ترجمہ"۔

اب لیجئے جُملہ اعتراضات نمبر وار اور اُن کے جوابات بطریقِ اختصار:۔

"جُوں جُوں سمندر میں نکلتے گئے"۔ آپ فرماتے ہیں "نکلتے گئے" کے لئے "ہم" کی ضرورت تھی حالانکہ پہلے فقرے میں "میں" ہے۔ گویا جناب کے ذہنِ مخبوط میں صاحبِ مضمون نے ضمیرِ فاعل اس لئے حذف کی ہی کہ فقرہ متصلہ ماقبل میں مذکور ہو چکی ہی اور چونکہ اس قسم کا حذف وہیں جائز ہوتا ہی جہاں دونو فقروں میں ایک ہی ضمیر ہو اور یہاں فقرہ دوم میں ضمیر جمع ہی اور فقرہ اوّل میں واحد۔ لہٰذا حذف غلط ہی۔ یہی ہی نہ آپ کی مختصر سی سمجھ کے اندر؟ اور یہی بالکل غلط ہی۔ یہاں تو حذف ضمیر فاعل اُردو کے اس عام محاورے کے مطابق ہی جیسے کہدیا کرتے ہیں "جب شراب پیتے ہیں تو آنکھوں میں سرسوں پھُول جاتی ہی"۔ یہاں "پیتے ہیں" کا فاعل محاورے میں محذوف ہی رہتا ہی۔ حتّیٰ کہ یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ اس فعل کا صیغہ متکلم کا ہی یا غائب کا یا حاضر کا اسی طرح "نکلتے گئے" کا فاعل محذوف ہی۔ ایسا حذف وہیں جائز ہوتا ہی جہاں قرینہ کلام سے فاعل صاف ظاہر ہو۔ چنانچہ یہاں قرینۂ کلام سے اہلِ جہاز یا ہم فاعل ہی۔ لہٰذا حذف عین مطابقِ محاورہ ہی۔

کئی دلوں کو لئے جاتے تھے آپ کئی کو مہمل کہتے ہیں۔ مگر آپکے کہنے کا کیا گلہ ہی؟ غالباً آپ تو اگر تعزیراتِ ہند کا کوئی جرم بھی کردیں تو بربنائے اختلالِ حواس بری ہو جائیں۔ آپ کا یہ قول بے دلیل ہی لہٰذا قابلِ جواب نہیں۔

آپ فرماتے ہیں "ریشمیں کا املا غلط ہی ریشمی چاہیئے" نیم مُلّا خطرہ ایمان آپکے خواب میں کبھی کیوں آیا ہی کہ "ین" "زبانِ فارسی میں حرفِ نسبت ہی جو اشیائے مادی کے ناموں کے آخر میں آکر صفت کے معنی کا فائدہ دیتا ہی زرین۔ سیمیں۔ نمکین۔ آہنیں۔ چوبیں وغیرہ وغیرہ اس کی مثالیں ہیں۔ آپ کچھ دنوں تک کسی اُستاد سے فارسی پڑھیئے گا پھر اعتراض کرنیکی جرأت کیجے گا۔ آپ کی علمیّت تو اسی سے ظاہر ہے کہ بجائے یہ کہنے کے کہ ریشم سے صفت ریشمین نہ آنا چاہیے بلکہ ریشمی آنا چاہیئے آپ کہتے ہیں کہ املا غلط ہی۔ واقعی آپکا مبلغ علم املا ہی تک ہی۔ آجکل پروفیسر نقاد کی

شاگردی میں املا سیکھا جا رہا ہے اس لئے املا ہی املا سوجھتا ہے۔

سنہری فرش۔ آپ فرماتے ہیں سُنہری نہیں سنہرا چاہئے۔ سُنہری یہاں بالکل ٹھیک ہے، اور قاعدۂ زبان کے مطابق یائے معروف نسبتی لگا کر ایک رنگ کے لئے یہ لفظ وضع کیا گیا ہے جیسے دھانی چمپئی۔ سنہرا ایک مکروہ لفظ ہے جسکو اہلِ ذوقِ سلیم کے کان سُننا تک گوارا نہیں کر سکتے۔ ناسخ مرحوم کے خاندان کے فخر جناب حکیم سید ضامن علی جلال لکھنوی سلمہ بھی یہی لکھتے ہیں کہ سُنہری صحیح ہے مذکر و مؤنث دونو معنوں میں۔ روپہری البتہ غلط ہے۔ اور بھلا دیکھنا جب آپ جانتے تھے کہ سنہری کے بارے میں اختلاف ہے تو آپ نے کیوں اعتراض کیا؟ اِس سے زیادہ آپ کے حسد کا کیا ثبوت ہوگا؟

ہنستی ہنستی جہاز کی طرف دوڑتی ہیں۔ آپ فرماتے ہیں "ہنستی ہنستی" کے بجائے "ہنستی ہوئی" ہونا چاہئے۔ کوئی وجہ؟ کوئی دلیل؟ آپ جیسے مخبوط الحواس مبتدی کے اعتراض کو کوئی بلا دلیل کبھی مان سکتا ہے؟ جب آپ مدلل اعتراض کرینگے تو ہم مدلل جواب دینگے فی الحال یہی جواب ہے کہ فقرہ صحیح ہے اور اعتراض غلط۔

واپس ہوتا ہوا دم لینے کے لئے راستے میں بیٹھ گیا۔ آپ فرماتے ہیں "واپسی کے وقت" یا "واپس ہوتے ہوئے" چاہئے۔ افسوس آپ نے کچھ پڑھا لکھا ہی نہیں اگر آپ کو سمجھائیں بھی تو کونسا سمجھ جائے گا۔ اے حضرت "واپس ہوتا ہوا" بھی درست ہے اور "واپس ہوتے ہوئے" بھی۔ فقرے کے معنے دونو صورتوں میں ایک ہی رہینگے صرف الفاظ متنازعہ کی نحوی حیثیت ایک دُوسرے سے مختلف ہے اور یہی وُہ نکتہ ہے جو آپ کے پست دماغ سے بہت بالا ہے۔ لیکن کوشش کیجے شاید سمجھ میں آجائے۔ "واپس آتا ہوا" کہینگے تو "واپس آتا ہوا" حال ہوگا۔ اور "میں" فاعل محذوف ذوالحال ہوگا "واپس ہوتے ہوئے" کہیں گے تو وُہ بہ معنی "واپسی کے وقت" ہوگا اور مفعول فیہ ظرف زمان ہوگا۔ ہائے ری سمجھ! تو موہانی کے حصّے میں کیوں نہ آئی!

سیر کو ہی نکلوں۔ فرماتے ہیں ہی کا استعمال غلط ہے سیر ہی کو چاہئے۔ مَیں کہتا ہوں

کہ اگر سیر ہی کو کہیں تو بیشک بہتر ہے اور اہلِ زبان کا قاعدہ یہی ہے - مگر جو سیر کو ہی کو غلط کہے اُسے اپنی سمجھ پر رونا چاہیئے - اَے بھائی ہی حرفِ تخصیص ہے اور جس لفظ کے ساتھ آتا ہے اُس پر زور دیتا ہے اب آپ یہ فرمائیے کہ کو کے بعد ہی کے آنے سے زور کسی اور لفظ پر جا پڑا یا اُسی لفظ سیر پر رہا ؟ اگر سیر ہی پر رہا تو آپ کا کیا بگڑ گیا ؟ البتہ اگر ہی کے کو کے بعد آنے سے معنی کا یہ خبط پیدا ہوتا کہ بجائے سیر کے کسی اَور لفظ پر زور جا پڑتا تو غلط کے درجے تک جا پہنچتا - اب اس کو غلط کہنا لفظِ غلط کو غلط طور پر سمجھنا ہے

مجھ کو اس شخص نے مذکورہ بالا الفاظ کہے - مَیں مانتا ہوں کہ مجھ کو کے بجائے مجھ سے ہونا چاہیئے -

غصّہ کا وُہ زہر جو ہاتھ اور بازو کے ذریعہ نہ نکلا - واقعی املا اُسی طرح ہونا چاہیئے جس طرح آپ فرماتے ہیں - اور مَیں خوش ہُوں کہ اب آپ کو املا کے قواعد تو ٹھیک آ چلے ہیں - آیندہ اُمید ہے کہ آپ کچھ نہ کچھ اَور بھی سیکھ جائینگے - مُبتدیوں سے صحتِ املا ہی بس غنیمت ہے - مگر بھائی مَیں آپ کے اِملے اور اِنشے سے تو اتفاق کر نہیں سکتا ان غریب الوطن لفظوں کی اصلی عزت و توقیر قائم رہنے دیجیے کیُوں آپ انکو گلیوں اور بازاروں کے لفظ بنائے دیتے ہیں ؟ آپ لکھتے ہیں اِملے کی یہ غلطی عام ہے - یہ پھر وُہی پُرانا قصّہ چھڑا اور پھر آپکے سر میں "سودہی کی تسخیر" ہونے لگی - اِس سے آگے جو اعتراضات آپ نے اُس نوٹ پر کیے ہیں جو پٹنے اور مولانا شاد کی نسبت ہے اُنکا جواب عرض کرتا لیکن جناب ایڈیٹر مخزن کی ایک اڈیٹرانہ مصلحت مانعِ لب کشائی ہے - لہذا اس مسرّت سے محرُوم رہتا ہُوں -

تعارفی غالبًا سہوِ کاتب ہے - اگر نہیں تو واقعی غلط ہے - تعارف چاہیئے -

پہلو پہ جس کے چھا رہا ایک سبزہ زار تھا - فرماتے ہیں چھا رہا تھا کے بجائے چھایا ہوا تھا چاہیئے - یہ پھر وُہی اعتراض ہے جو آپ کمالِ نافہمی سے حالی کے اس مصرع پر کر بیٹھے تھے ع اختلافِ قوم و ملت گھُل رہا تھا جس میں زہر - آپ نے وہاں بھی ارشاد فرمایا تھا کہ گھُل رہا تھا کے بجائے

کھلا ہوا تھا چاہیے اس کی نسبت آپ کے شفیق اُستاد پروفیسر نقاد آپ کو ایک سبق دے چکے ہیں یہ شک بھی اُنہی سے حل کر لینا۔ یہاں بھی آپ بر سرِ غلط ہیں۔ اب رہا چھارہا میں رہا کے الف کا دب کر نکلنا۔ یہ قصہ بہت دُور دراز ہی اور اگر چھڑ گیا تو خدا جانے کن کن اُستادوں کے کلام میں کون کون سے حروف علّت دب دب کر نکلیں پھر آپ اس بوجھ سے ایسے دبیں گے کہ اُبھرنا مشکل ہوگا فی الحال جتنا سبق دیا جاتا ہی اُتنا ہی یاد کر لیجے شرح اور تفسیر پھر سکھا دینگے۔ سبق یہ ہی کہ الف کا اِس طرح دب کر نکلنا جائز ہے اور اُستادوں کے کلام میں اسکی بہت سی مثالیں ہیں۔

ہس کو طہارت کے مصدر سے مشتق سمجھا جاتا ہی۔ آپ فرماتے ہیں کہ فعلِ مجہول کے ساتھ کو کا لانا غلط ہی۔ مگر آپ نے کبھی غور بھی کیا ہی کہ کو آتا کیوں ہی؟ مَیں خود بھی سمجھتا ہوں کہ اگر کو نہ لائیں تو بہتر ہو۔ اور عربی جملوں کے نمونے کا پُورا خاکہ اُتر آئے۔ مگر کو کا لانا جو اہلِ زبان میں اس قدر کثرت سے مروّج ہی اسکا علاج کیا؟ آپ نے خود ایک مضمون میں کچھ عرصہ ہوا شکایت کی تھی کہ البشیر اور فلاں اور فلاں برابر فعل مجہول کے ساتھ "کو" لکھتے ہیں اسکا علاج ہونا چاہیے۔ البشیر غریب تو پنجابی نہیں ہی اسکو فعل مجہول کے "ساتھ کو" لانا کس نے سکھا دیا؟ حقیقت یہ ہی کہ اہلِ زبان لکھتے ہیں اور لکھینگے اور یہ کوئی بڑا ظلم بھی نہیں۔ یہ عمل قاعدے اور عقل کے مطابق بھی تصور ہو سکتا ہی کو علامت ہی مفعول کی۔ سمجھا جاتا ہی فعل متعدی مجہول ہی "اُس" مفعول مالم یُسمّ فاعلہٗ قائم مقام علی کر۔ ذرا اس عبارت کو سمجھ لیجے اس میں عربی کے کئی لفظ آ گئے ہیں اور آپ ہیں کہ اپنی روزمرہ کی اُردو بھی نہیں سمجھ سکتے۔ مفعول مالم یُسمّ فاعلہٗ۔ مفعول اس فعل کا جسکے فاعل کا نام نہیں لیا گیا پس کو اگر آیا تو مفعول کے ساتھ آیا کونسا ظلم ہو گیا۔ اگر کوئی بجائے مَیں گیا کے مجھ کو گیا کہدیتا تو علامتِ مفعول کو فاعل کے ساتھ لا کر ایک صریح ظلم کرتا اب کونسا غضب ڈھا دیا؟ علامتِ مفعول آئی تو مفعول کے ساتھ آئی حق بہ حقدار رسید۔ آپ کہینگے کہ یہ تو فاعل ہی۔ فاعل نہیں ہی فاعل کا قائم مقام ہی۔ فاعل کا تو "نام نہیں لیا گیا" (لم یُسمّ فاعلہٗ)۔ کیا سمجھے؟

قُدرت نے ایک دفینہ رکھا ہوا ہی۔ یہ واقعی غلط ہی۔ "قُدرت کا رکھا ہوا ہے" کہنا چاہیے۔

یا "قدرت نے رکھا ہے"۔ چٹان میرے نزدیک بھی مؤنث ہے۔ [1]

"دو خیالات زور سے میرے دل میں جاگزین تھے۔ آپ فرماتے ہیں "زور سے جاگزین تھے" بے معنے ہے۔ یعنی آپ کی مختصر سی سمجھ کے اندر اس کے معنے نہیں سما سکے۔ خدا آپ کے حال پر رحم کرے آئیے ہم سمجھائیں۔ جاگزین تھے کے معنے ہُوئے جمے ہوئے تھے۔ بیٹھے ہوئے تھے۔ پھر یہ کہ ایسے جمے ہُوئے تھے کہ ہٹائے نہ ہٹتے تھے۔ یعنی مضبوطی سے دل میں جمے ہُوئے تھے۔ یہ "زور کے ساتھ جاگزین ہونا" نہیں تو اَور کیا ہے؟ ہائے ری سمجھ! تجھے حسرت سے کس قدر نفرت ہے!

آہ! کوئل کی یہ تانیں یہ پپیہے کا الاپ۔ فرماتے ہیں "الاپ" مؤنث ہے۔ حضرت یہ اُردو ہے خالہ اماں کا گھر نہیں ہے۔ موہان ضلع اُناؤ میں الاپ کو مؤنث بولتے ہونگے اہلِ زبان کے ہاں بکثرت مذکر بولا اور لکھا جاتا ہے۔ اساتذہ لکھنؤ میں سے قُدرت نے لکھا ہے۔ ؎

ایک ہی پردے کے تم سمجھو تو ہیں یہ سب الاپ　　گر صدائے بانگ ہے اور نغمۂ ناقوس ہے

اب ذرا دیکھیے کہ آپ نے دو چار صحیح اعتراضوں کے ساتھ ایک آدھ درجن غلط اعتراض کر کے کتنی خفت اُٹھائی۔ اگر یہی اعتراض جو ٹھیک تھے بیان کر دیتے تو ہم آپ کے ممنون ہوتے اور نہ لڑائی تھی نہ جھگڑا۔ اب ہم کو شروع سے آپ کو ابجد خواہ مخواہ بھی سکھانی پڑی۔

آپ نے لکھا ہے کہ فی الحال ہم نے ان غلطیوں کو "معمولی صُورت میں پیش کیا ہے" آئندہ مفصل اور مدلل طور پر کچھ لکھینگے۔ ہم نے بھی اکثر جوابات "معمولی صُورت میں پیش کئے ہیں" آئندہ جب آپ لکھینگے تو ہم بھی مفصل اور مدلل طور پر کچھ لکھینگے۔

آخر میں آپ نے لکھا ہے۔ "البتہ اگر ہماری رائے غلط ہو یا ہماری تحریر میں بھی کچھ غلطیاں

---

[1] میری ذاتی رائے تو قطعی طور سے یہی ہے۔ لیکن پروفیسر محمد حسین آزاد کی سند اس طرز بیان کی تائید میں موجود ہے۔ ملاحظہ ہو ؎ ٹکڑے اعزاز کے جن لوگوں نے ہیں پائے ہُوئے۔ بالیں گیہوں کی وُہ پگڑی میں ہیں لٹکائے ہُوئے۔ (خسرِ امن کا دربار) پس جو لوگ اس سند کی پیروی کریں اُنکو قطعی غلط کہنے کا اختیار ہم کو حاصل نہیں ہے +

انکو نظر آئیں تو بلا تکلف ہم کو ٹوک دیں" بھلا آپ بنفسِ نفیس فرمائش کریں اور یہ نیاز مند سراپا نیاز تعمیل نہ کرے؟ یہ کبھی ممکن ہی؟ لیجئے ضیافتِ طبعِ سامی کا کچھ تھوڑا سا سامان حاضر ہے۔

برگِ سبز است تحفۂ درویش چہ کند بے نوا ہمیں دارد

اوّل اوّل جب آپ نے تمام دُنیا پر اعتراض کرنے شروع کئے اور آپ پر کسی نے اعتراض نہ کیا تو آپ کو ضرور خیال ہو گیا ہوگا کہ اس چار دانگ ہندوستان میں ہمارا مدمقابل کوئی نہیں بس ہم ہی ہم ہیں اور کوئی ہم پر اعتراض کرے بھی تو کیونکر ہم میں عیب ہی کوئی نہیں۔ لیکن اُمّید ہے کہ پروفیسر نقّاد کی تحریروں نے کچھ کچھ تغیر آپ کے خیالات میں پیدا کیا ہوگا۔ جب نقّاد نے اُردوئے مُعلّٰے کے ہر ایک پرچے کے اغلاط کی فہرست شائع کرنی شروع کی تو آپ سے بھی سوائے عذرِ گناہ بدتر از گناہ کے کوئی جواب بن نہ پڑا۔ لیکن پروفیسر نقّاد نے ہنوز آپ کے قلمِ خاص کی نظم و نثر کو نہیں چھوا۔ مجھے آپکے نامہ نگاروں سے تعرّض نہیں صرف ذات والا صفات سے عقیدت خاص ہی۔ آپ ہی کی نظم و نثر کے مزے لوٹونگا۔ اب ذرا اُردوئے معلّٰے ماہ ستمبر سنہ ۱۹۰۲ء ملاحظہ فرمائیے صفحہ ۲۔ "اس موقع پر منشی نول کشور کی قدردانی اہل کمال کا ذکر نہ کرنا ایک ظلم صریح ہوگا یعنی ان کی سلطنت اودہ کے آخر وقت میں اور اُس کے بعد بھی مروّت اور شرافت کا جیسا برتاو خصوصًا بعض شعرائے وقت کے ساتھ آپ سے ظاہر ہوا اُس کی بہت کم مثالیں ملینگی"۔

اوّل الفاظ "یعنی اس لئے کہ" قابلِ ملاحظہ ہیں۔ جن دو جملوں کے درمیان لفظ "یعنی" واقع ہوا کرتا ہے اُن میں سے پہلا مبہم محتاجِ تفسیر اور اس لئے اصطلاحِ نحو میں مُفسَّر ہوتا ہی دُوسرا اُس کی تفسیر ہوتا ہی۔ مفسّر اور تفسیر ملکر ایک جُملۂ تفسیریہ ہو جاتا ہی۔ اگر آپ کے دونو جُملوں کو اس نوع کا سمجھیں تو "اس لئے" بے معنے اور زاید۔ کہ "بے معنی اور زاید"۔ یا "یعنی" کو چھوڑ دیا ہوتا صرف "اس لئے" کافی تھا اس صورت میں جملہ اوّل معلّل اور جملہ ثانی تعلیل۔ معلّل تعلیل سے ملکر جملہ تعلیلیہ ہو جاتا۔ آپ کا جملہ کیا ہوا؟ جُملہ تفسیریۂ تعلیلیہ بیانیہ۔ یعنی شتر گاو پلنگ۔ یہ ہے نتیجہ اُس خصوصیّت انداز کا جو خاص خاندان نسیم دہلوی کی شاخ موہانیہ کا حصّہ ہی۔ کیا اچھا ہوتا کہ نہ "یعنی" لکھتے نہ "اس لئے"

نہ کہ - تینوں کو اُڑا دیجے تو دونو جُملوں کا ربط ٹھیک ہو جائیگا اور عبارت کا آدہا بھدّا پن فورًا کافور ہو جائیگا - صرف اُدھا رہجائیگا پھر بھی آدھا کیوں رہ جائیگا - وُہ اس لئے کہ موہانی صاحب کے اندازِ تحریر سے بھدّے پن کو وُہ نسبت ہی جو گُلِ کنیر سے اُس کی بُو کو ہے - دونو لازم و ملزوم ہیں۔ ذرا دیکھئے تو یہ فقرہ ثانی کس قدر لایعنی ہی - "مروّت و شرافت کا جیسا برتاو" یہاں تک لکھا تھا کہ آگے لکھدیا "خصُوصًا بعض شعرائے وقت کے ساتھ" - اب تخصیص تو معلوم ہو گئی مگر تعمیم کا بیان ندارد - اگر الفاظ زیر خط کو اُڑا دیں تو فقرے کی لایعنیت صاف عیاں ہو جاتی ہی اور طبیعت پوچھتی رہ جاتی ہی کہ شرافت کا برتاو کس کے ساتھ ؟ چاہیے تھا کہ ظاہر ہوتا کہ عمومًا فلاں فلاں قسم کے لوگوں کے ساتھ اور خصُوصًا فلاں قسم کے لوگوں کے ساتھ اور خصُوصًا فلاں قسم کے لوگوں کے ساتھ مروّت کی گئی - مگر یہ تو وُہ کرے جس کے سر میں عقل ہو - اسوقت یہ فقرہ سراپا لایعنی ہی -

صفحہ ۳ - "مرزا نسیم مرحُوم جس زمانے میں کہ دہلی سے لکھنو تشریف لائے ہیں" - یہاں "کہ" زائد اور بے معنی ہی - اس کے بغیر ہی فقرہ مکمّل ہی اور پُورے معنے دیتا ہی - اِس کے آنے سے معنی میں کوئی ترقّی یا تغیّر نہیں ہوا -

صفحہ ۴ - "اس شاگردی کی بنا چونکہ اخلاص پر ہوتی تھی اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ مرزا نسیم کیساتھ اُن کے تلامذہ کی گرویدگی بلا مبالغہ عشق کے درجے تک پہنچی ہُوئی نظر آتی ہی" - کیساتھ کا املا غلط ہی "کے ساتھ" چاہئے - ورنہ لکھا کیجے "حسرت کیلئے" بلکہ "حسر تکیلئے" آپ تو اَوروں کو املا سکھاتے ہیں یہ آپ کے ہاں املا غلط کیوں ؟ نیز ایک وعدہ کرتا ہوں کہ آج تو فرصت کم ہی کسی دن صرف آپ کے املا کے اغلاط کی فہرست نذر کرونگا اُس میں سوائے املا کے اَور کسی شے کا ذکر نہیں آئیگا پھر آپ پر املا کی حقیقت کھلیگی - فی الحال املا سے ذرا بالاتر باتیں سُنئے - یہ آپ کا چونکہ نہایت بے معنی اور بے موقع ہی - جس طرح چونکہ اب واقع ہی اس صُورت میں قطعی لازم ہی کہ اسلئے کے بعد کے جملے کا مُسندالیہ بنا ہو جو چونکہ سے پہلے واقع ہی ورنہ چونکہ بے معنی ہی - مثلاً صحیح استعمال کی ٹھیک مثال یہ ہی "دریا چُونکہ چڑھا ہوا نہ تھا اِسلئے پایاب تھا"

یا باب تھا مسند دریا مسندالیہ۔ اگر موجودہ عبارت کو آپ صحیح رکھنا چاہتے ہیں تو چونکہ کو اٹھا دیجیے یا فقرے کے اوّل میں رکھ دیجیے۔

صفحہ ۵۔ "پانچویں شعر کو دیکھیے کس قدر اچھوتا مضمون ہے اور کتنے اچھوتے الفاظ میں ادا کیا گیا ہے"۔ واقعی تحسین ناشناس اسی کا نام ہے۔ شعر کی داد دینے کا شوق تو چرایا مگر داد دی غلط الفاظ میں۔ کتنے اچھوتے الفاظ کے کیا معنے؟ کتنے الفاظ یا کتنے اچھوتے؟ یہ کتنے کونسے معنی میں ہے مقداری معنی میں یا عددی معنی میں؟ اگر کہیے مقداری معنی میں ہے تو عددی میں کیوں نہیں یا اگر کہیے عددی معنی میں ہے تو مقداری میں کیوں نہیں؟ یعنی کونسا قرینہ ہے جس سے کوئی بھلا آدمی سمجھے کہ دو ممکن معنوں میں سے یہاں لازمی طور پر فلاں معنی مراد ہیں؟ ایسا مبہم لفظ بول کر فقرہ بے معنی کر دیا۔ ابہام دور کرنے کا کوئی ذریعہ آپ کے فقرے کے اندر موجود نہیں ہے کتنے کاٹ ڈالیے کیسے بنائیے۔

صفحہ ۱۶۔ "وضع قوانین کے معاملے میں نہایت غور و فکر کے ساتھ دلچسپی رکھتی ہے"۔ "معاملے میں دلچسپی رکھنا" بے معنی ہے۔ "معاملے سے دلچسپی رکھنا" چاہیے۔

صفحہ ۱۷۔ گذشتہ ۱۵ یا ۱۲ سال کے عرصے میں ان باتوں کو جن معمولی کوششوں کے ذریعے سے ہم نے حاصل کیا ہے اُس کے دیکھتے ہوئے کسی کو مایوس ہونے کی ضرورت نہیں"۔ اُس کے بے معنی ہے۔ معلوم نہیں کس کے؟ "اُس" کا مرجع "کوششوں" ہو نہیں سکتا۔ کہ واحد اور جمع کا فرق ہے اور کوئی مرجع نظر نہیں آتا۔ غرض مثل حسرت سراپا بے معنی ہے۔

صفحہ ۲۰۔ "مثلاً دادا بھائی نوروجی سر ولیم ویڈربرن وغیرہم کے موجود ہونے کی بھی اُمید ہے" سیدھا اُردو کا ہر روز کا وغیرہ لکھ دیتے تو کوئی کچھ نہ کہتا۔ آپ نے عربی الاپنی شروع کر دی بھلا جس کو اُردو نہیں آتی اُسکو عربی تو کاہے کو آئی تھی وغیرہم بہ صیغۂ جمع غلط ہے۔ بہ صیغۂ تثنیہ وغیرہما کہیے دو ہی تو نام لیے ہیں نوروجی اور ویڈربرن پھر یہ ہم کہاں سے ہنک کر آ کودا؟

صفحہ ۲۰۔ "کیا عجب ہے کہ جلد اس خطۂ تاریک میں بھی کچھ جوش و خروش قائم ہو جائے"۔

کیسا بھونڈا تخیل ہے! ایک تو خطۂ تاریک واقع ہوا ہے پھر اُس میں ہو جائے جوش و خروش۔ نتیجہ کیا ہوگا؟ اندھیرے میں جُوتا چلے گا اور سر پھوٹینگے۔ ظالم! خطۂ تاریک کے لئے کوئی شعاعِ نُور مانگی ہوتی! مگر غریب کیا کرے جو اس میں خبط ہے۔

صفحہ ۲۵ - "یہ حال تھا کہ ہال اور اُس کے ملحقات اس کی سیڑھیوں حتیٰ کہ اُس کے سامنے کی زمین پر تل رکھنے کی جگہ نہ تھی"۔ حرف جار پر کا عمل چار لفظوں پر ہے ہال - ملحقات - سیڑھیوں اور زمین - ہال کے ساتھ پر غلط ہے ہال میں ہونا چاہئے۔

صفحہ ۲۵ - "بانیانِ جلسہ کے لئے ضروری ہُوا کہ یا تو جلسے کو ملتوی کر دیں یا اُسے میدان میں منعقد کریں"۔ یہاں "اُسے" کس قدر بھدّا اور بھونڈا اور خلافِ روشِ زبانِ اُردو ہے۔

صفحہ ۲۵ - "باقی تمام حاضرین چاروں طرف پھیلے ہُوئے تھے"۔ اسے کہتے ہیں "اُردو کو اُلٹی چھُری سے حلال کرنا"۔ یہ پھیلے ہُوئے تھے ملاحظہ کیجے - اس لفظ میں انتشار کا خیال اور انتشار میں بکھرنے اور الگ الگ ہونے کا خیال مضمر ہے - اور آپ بیان کر رہے ہیں ایک ایسے مجمع کا کھڑا ہونا جس میں کہیں تل رکھنے کو جگہ نہ تھی - یہاں حاضرین کا "پھیلنا" قطعی غلط ہے "صف بہ صف کھڑے تھے" کہئے - "پرے جمائے کھڑے تھے" کہئے - صرف "کھڑے تھے" کہئے - مگر آپ تو عقلِ سلیم کے پیچھے ڈنڈا لئے پھرتے ہیں۔

یہ چند (صرف چند) مثالیں آپ کی نثر کی غلطیوں کی ہیں اب آپ کی غزل بتاتی ہیں۔

صفحہ ۴۸ - غزلِ حسرت موہانی :-

ہجومِ بیکسی کو وجہ لُطفِ بیکراں پایا | کہ ہم نے آج اُس نامہرباں کو مہرباں پایا

واللہ کیا بے معنی شعر کہا ہے! ارے میاں کس کی بیکسی کو وجہ لُطفِ بیکراں پایا؟ اپنی یا اپنے یار کی؟ آپ کے لفظوں کی رُو سے دونوں معنوں کا امکان بالکل برابر ہے اور کوئی قرینہ نہیں جس سے ایک معنی کو دوسرے کے مقابلے میں اختیار کر لیں۔ شاید آپ کو جو بہت بیکسی کی حالت میں دیکھا تو آپ کے یار کو آپ کی حالتِ زار پر رحم آ گیا۔ یا یُوں ہُوا کہ پہلے تو آپکا

یار آپ کو گانٹھنا تھا کیونکہ ہر وقت آپ کے دو چار رقیب اُس کے گرد رہتے تھے اب جو سب نے اُسکو چھوڑ دیا اور وُہ بیکس رہ گیا تو آپ کی قسمت جاگ گئی اور وُہ ناچار کس مپرسی سے تنگ آکر آپ کے گلے کا ہار ہو گیا - کونسے معنے سمجھے جائیں اور کیوں ؟ ادھر لفظ بیکراں چلا چلا کر کہ رہا ہے کہ مجھ ناکردہ گناہ کو اِس لئے بیگار میں پکڑا ہے کہ قافیے کی ضرورت ہے - تک بندی کی ضرورت میں میں مارا گیا ورنہ معنی میں میرا کوئی حصہ نہیں - واللہ باللہ ثم باللہ میں حشو محض ہوں -

---

مگر تھا رنگ بزمِ یار میں نیرنگِ عالم کا　　　کسی کو سرنگوں دیکھا کسی کو شادماں پایا

ہائے رہی لاچاری پربت سے بھاری ! شادماں کے مقابلے کے لئے کوئی لفظ زبان بھر میں دستیاب نہ ہوا آخر سرنگوں کے آگے سر جھکایا کہ بھائی اللہ تم ہی چل بیٹھو وزن تو پورا ہو جائے گا - حالانکہ شادماں اور سرنگوں میں مطلق کوئی تضاد یا تقابل نہیں ہے - سرنگوں کے معنے میں افسردگی اور رنجیدگی کا خیال لازم نہیں ہے - جس کو سرنگوں دیکھا کیا ضروری ہے کہ وُہ بمقابلۂ شادماں رنجیدہ یا افسردہ خاطر ہی ہو ؟ شاید نشے میں یا نیند کے غلبے میں ذرا اونگھ گیا ہو - یا گہرے خیال میں سر جھکائے سر بگریبانِ تفکر کچھ سوچ رہا ہو - اِس صورت میں شادماں سے کیا خاک مقابلہ ہوا - اور نیرنگِ عالم کے رنگ کا کیا ثبوت ہوا ؟ کس قدر بودا اور بے معنی شعر ہے !

نہ پا سکتے کبھی پابند رہ کر قیدِ ہستی میں　　　سو ہم نے بے نشاں ہو کر تجھے او بے نشاں پایا

کیا بھدا اور بھونڈا تخیل ہے - ادھر تو ہستی کا ایک پھندا تیار کیا اور اُس میں اپنا پاؤں پھنسا بیٹھے - سو اس کے مقابلے میں چاہیئے تھا کہ اس پھندے سے چھوٹنے کا ذکر آتا اور قید اور پابند کے مقابلے میں آزاد ہو جانے کا ذکر کرتے - مگر اُدھر چھپکے سے بے نشان ہو گئے - ظالم ! اگر بے نشاں بننے کی دل میں تھی تو مصرع اول میں نام و نشان کا ذکر کیا ہوتا - اگر مصرع اول میں ہستی کا ذکر کیا تھا تو مصرع ثانی میں عدم یا نیستی یا نابودی کا ذکر لازم تھا اور قید اور پابند

کے استعارے کا جواب استعارے میں ضروری تھا - المختصر اگر کچھ کہنے کو اُٹھے تھے تو شعر کے رنگ کو نباہا ہوتا - مگر ان باتوں کو تو وُہ سمجھے جسے شعر سے کچھ مس ہو -

---

نہ جائے کوئی میری وضعِ رسوا پر کہ اَے حسرت — کمالِ شاعری نے مجھ کو یکتائے زماں پایا

واللہ اس شعر نے تو لغویت کا خاتمہ ہی کر دیا - پایا ضرور پایا - کس نے پایا ؟ کمالِ شاعری نے کس کو پایا ؟ حسرت کو - کیسا پایا ؟ یکتائے زماں - ہیں ؟ یکتائے زماں کس جانور کو کہتے ہیں ؟ یعنی کھول کر کہو کس چیز میں یکتائے زماں ؟ ورنہ ہم کیا سمجھیں کس چیز میں یکتا لغویت میں - حماقت میں - لیاقت میں - جہالت میں - صداقت میں - آخر کس امر میں ؟ بس یہی تو اس شعر کی لغویت کا ثبوت ہی کہ خُدا جانے کس چیز میں یکتا پایا - مگر پایا یکتا - گویا ممکن ہی کہ یہ شعر آپ کی مذمت میں ہو ممکن ہی مدح میں ہو - اِس ابہام کے صدقے اس نے شعر کو کس قدر لایعنی بنا دیا -

بس آج اِسی قدر اِصلاح کافی ہی آیندہ کے لئے یار زندہ صحبت باقی +

تحقیق

اَلنَّدوَہ یہ رسالہ ۲۰×۲۶ تقطیع کے بتّیس صفحوں پر انجمن ندوۃ العلمأ کی سرپرستی میں شاہجہانپور سے شایع ہوتا ہی - اسکا مقصد قدیم اسلامی علوم کا احیا اور علوم قدیمہ و جدیدہ کا موازنہ ہی - چونکہ اسکی ترتیب شمس العلمأ مولوی شبلی صاحب نعمانی اور مولوی حبیب الرحمٰن خان صاحب شیروانی جیسے دو مستند عالموں کے ہاتھ میں ہی اس لئے ہمیں اُمید ہی کہ اسے اپنے مقصد میں ضرور کامیابی ہو گی - علاوہ اور خوبیوں کی لکھائی چھپائی بھی پاکیزہ ہی - قیمت اوّل قسم کی کاغذ پر چار روپئے (للعہ) مع محصولڈاک - دوم قسم کے کاغذ پر تین روپئے (عہ) خریداری کے متعلق خط و کتابت سیّد عبدالحی صاحب منیجر النّدوہ شاہجہانپور سے ہونی چاہیے +

تحفۂ گلاب

جناب حافظ سید فضل حق صاحب آزاد عظیم آبادی کے کلام سے تو ہم بارہا مستفید ہو چکے ہیں۔ مگر جو لطف اس نظم میں جو آج شائع ہوتی ہے۔ آیا۔ وہ ہمیشہ سے نرالا ہے۔ ممکن ہے اس لطف میں بظاہری اسباب بھی شریک ہوں۔ کہ لندن میں بیٹھے۔ وطن سے ہزارہا میل کے فاصلے پر۔ سمندروں کے پار۔ وطن کا تحفہ پایا۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ اصل میں یہ نتیجہ خود کلام کی اندرونی خوبیوں کا ہے۔ گلاب کا مضمون ہمارے علم ادب میں پامال مضمون ہے۔ مگر اس میں کیسی جدت پیدا ہوئی ہے۔ اور کس خوبی سے ادا ہوا ہے کہ کوئی پہلو تخیل کا جو گلاب کے پھول کو دیکھ کر پیدا ہو سکتا ہے۔ باقی نہیں رہا۔ اس پر زبان کتنی سلیس اور پیاری ہے اور پھر سلاست کو کس طرح عالی خیالی کے ساتھ نباہا ہے۔ کہ بے اختیار آزاد کے قلم جادو رقم کی تعریف کرنی پڑتی ہے۔ ایسے ہی موقعوں پر تو اپنی کم بضاعتی پر افسوس ہوتا ہے۔ کہ نہ ہوئے شاعر۔ ورنہ ایسے تحفے کا شکریہ خشک نثر میں نہ کرتے۔ اور اب بھی روکھے پھیکے الفاظ سے یہ بہتر ہے کہ دل کو شکریہ کا کام سپرد کر کے ہم اس تحفے کو اپنے ہندوستان کے دوستوں کو بھیجیں :۔ (عبد القادر)

بوٹے سے تیرے قد پر کیا حسن چھا رہا ہے　　در پردہ حسن قدرت جلوہ دکھا رہا ہے
پروان چڑھ رہی ہے ہستی پلٹ کے کایا　　کس حسن کی پری کا تجھ پر پڑا ہے سایا
کیا تھا خدا کی قدرت۔ کیا چیز ہو گیا تو　　اک سبز چار پتے بس! اور کچھ نہ تھا تو
خود رنگ تھا نکالا آخر کو پاؤں تو نے　　آنکھوں میں ہے۔ دکھائی جو دھوپ چھاؤں تو نے
سب میں نکھر کے نکلا کیا رنگ روپ تیرا　　اک چھب دکھا کے تو نے رخ کو ہوا کے پھیرا

مہدِ زمیں کی رونق اب ہے ترے ہی دم سے
گلشن میں چہچہے ہیں تیرے ہی دم قدم سے

نشو و نما کی کھیتی تجھ سے ہری بھری ہے
جس بھیس میں ہے ظالم تو حور یا پری ہے

رضواں نے بھی نہ پائی شاید یہ خندہ روئی
غلماں غریب کو ہے خود فکر چارہ جوئی

نوزادگی میں ایسی کب تازگی کوئی ہے
جو تجھ میں ہے نزاکت وہ جانِ نازکی ہے

اُٹھتا ہے پیار دل میں کیا بار بار تیرا
مُنہہ چومتی ہے آکر خود نوبہار تیرا

یہ ہلکی ہلکی رنگت یہ بھینی بھینی خوشبو
چُبھتے ہوئے ہیں فقرے چلتا ہوا ہے جادو

ہر پنکھڑی ہے تیری اک گلستانِ معنیٰ
ہر ہر ادا ہے تیری جان و جہانِ معنیٰ

گلدستۂ معانی ایک ایک پھول تیرا
مقبولِ جملہ عالم حسنِ قبول تیرا

صلِّ علیٰ ہیں تجھ میں کیا کیا صفاتِ عالی
غنچوں کی مٹھیاں بھی زر سے نہیں ہیں خالی

پھولوں کو دیکھتا ہوں کہتی ہے طبع جویا
ٹنکے ہوئے ہیں تارے اک آسماں میں گویا

شمعوں کی جھلملاہٹ شاید ہے شہ نشیں میں
یا لعل جڑ دیئے ہیں بُرجِ زمرّدیں میں

غنچے کھلے ہیں گویا ہنستے ہیں کھلکھلا کر
تخت آ رہا ہے پریوں کا اِک طرف ہوا پر

نازک سی ٹہنیوں میں کیا پھول جھولتے ہیں
نوزادگانِ گلشن جھولوں میں جھولتے ہیں

یا زر بکف ہے حاتم یا جم ایاغ برکف
کسریٰ ہے تاج برسر ۔ نرگس چراغ برکف

چھڑکا یہ کس نے پوڈر کس نے ملا یہ غازہ
بچھڑے ہوؤں کی تجھ سے دل میں ہے یاد تازہ

آنکھوں کو تجھ سے ٹھنڈک دل کو سرور تجھ سے
نامِ خدا وہ جوبن شرمائے حور تجھ سے

اس گلستاں میں تیری باندھی ہوئی ہوا ہے
کانٹا سا پھر جو کھٹکے تیرا قصور کیا ہے

گو کامیاب تجھ سے ہیں سربسر نگاہیں
کچھ اَور ڈھونڈھتی ہیں یہ منتشر نگاہیں

اس حسنِ قدرتی سے یوں سرفراز ہونا
ہے تیرے حق بجانب سرمستِ ناز ہونا

کیفیتیں کہاں ہیں وہ بادہ و سبو میں
نیرنگیاں جو دیکھیں اک تیرے رنگ و بو میں

یہ جھومنا لچکنا یہ پھولنا پھبکنا
یہ اینڈنا ۔ سمٹنا ۔ یہ پھیلنا ۔ بہکنا

مرکز میں اپنے کیا کیا ہے دوڑ بھاگ تجھ کو
اِس بیخودی میں بھی ہے آپے سے لاگ تجھ کو

ہشیاریاں چھپی ہیں بیہوشیوں میں تیری
گویائیاں ہیں مضمر خاموشیوں میں تیری

ہے زیر بار ہو کر ثابت قدم کہاں تک
تو نے بھی بار اُٹھایا ہے اُٹھ سکا جہاں تک

رنج و خوشی سے خالی ہستی نہیں ہے تیری
کچھ اس جہاں سے باہر بستی نہیں ہے تیری

جیسے جہان فانی ہستی بھی تیری فانی
سب سے الگ نہیں کچھ قانونِ زندگانی

گردوں نے چھیڑنے کو جب چھیڑ چھاڑ رکھی
تُو نے بھی گرد اپنے کانٹوں کی آڑ رکھی

دیکھے ہوا کے تیور جھٹ پتے نئیں سنبھالیں
جُھڑنے پر آگیا جب شاخیں نئی نکالیں

ہر چشمہ ہے جو صافی کب ہو سکا ہے گدلا
سال اس طرف نہ بدلا تو نے لباس بدلا

صبر و رضا کی دولت بگڑی کو بھی سنوارا
چَھٹ چھٹ کے اور جُھرمٹ شاخوں نے تیری مارا

اہلِ نظر کرینگے کچھ تیری قدردانی
کانٹوں میں تو نے کھنچکر کاٹی ہے زندگانی

شبنم نے لاکھ تجھ پر گوہر کئے نچھاور
رکھا قدم نہ تو نے زنہار حد سے باہر

دن کی طرح ہے روشن نظم و نسق سے تیرے
محرومِ محض کب ہے تو نورِ آگہی سے

رُوحوں کو تجھ سے راہیں اور ربط زندگی کو
پانی کے تیرے چھینٹے پھر غش کہاں کسی کو

نرمی نہ چھوڑی تو نے کیا کیا کڑی اُٹھائی
اللہ ری نزاکت تو بھی کڑی نہ پائی

پھُولوں میں تجھ کو سب سے نازک حسین جو پایا
خوشبو کی رال ٹپکی اور رنگ رنگ لایا

کیا کیا پھسل پڑا ہے چکنی زمین پا کر
پھسلن بھی چل پڑی ہے چلنی چمک دکھا کر

بے لاگ کہ رہا ہے یہ آتے آتے آنا
تھا دسترس سے باہر یکسر قدم جمانا

یہ رنگ کیا ہے گویا اک رنگ کا ہے سایا
نیرنگ دستِ قدرت اس رنگ نے دکھایا

کچھ سُرخ زرد نیلا آبی نہ ہے شہابی
اس رنگ کو تو کہتے ہیں صاف ہم گلابی

یاروں کی اب سمجھ میں کچھ آئے یا نہ آئے
خوشبو گلاب کی پھر چھپتی ہے کب چھپائے

ہے یہ گلاب آزاد اپنے چمن کا تحفہ
لندن کے دوستوں کو یعنی وطن کا تحفہ

اِس پھول بھیجنے میں یہ مصلحت ہے ساقی
مُرجھا بھی جائیگا تو کچھ بُو رہیگی باقی

آزاد عظیم آبادی

ہمارا دیس

جذباتِ دل کے ایک سینے سے دوسرے پر منعکس ہونیکا بھی عجیب قانون ہے۔ ہمارے دوست نے مندرجۂ ذیل اشعار میں ہُوبہُو وہ خیالات ظاہر کئے ہیں۔ جو وطن سے دُور ہونے کے سبب راقم کے دل میں ہیں۔ میں اگر نظم لکھتا تو شاید لندن سے وہ خیالات ظاہر کرتا جو اقبال نے لاہور میں بیٹھے ہُوئے کئے ہیں۔ (عبدالقادر)

سارے جہاں سے اچّھا ہندوستاں ہمارا ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا
غُربت میں ہوں اگر ہم رہتا ہے دل وطن میں سمجھو وہیں ہمیں بھی دل ہو جہاں ہمارا
پربت وہ سب سے اُونچا ہمسایہ آسماں کا وُہ سنتری ہمارا وہ پاسباں ہمارا
گودی میں کھیلتی ہیں اس کی ہزاروں ندیاں گلشن ہے جن کے دم سے رشکِ جناں ہمارا
اے آبِ رودِ گنگا وُہ دن ہے یاد تجھ کو اُترا ترے کنارے جب کارواں ہمارا
مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا
یونان و مصر و روما سب مٹ گئے جہاں سے اب تک مگر ہے باقی نام و نشاں ہمارا
کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری صدیوں رہا ہے دشمن دورِ زماں ہمارا
اقبال کوئی محرم اپنا نہیں جہاں میں معلوم کیا کسی کو دردِ نہاں ہمارا

(اقبال)

کشمیر و حُسنِ کشمیر

یہ نظم دیر ہوئی لکھی گئی تھی - اور دُور سے آئی ہے - ہم عرصہ سے اس کے منتظر تھے - بعض اتفاقات سے اب تک ہمیں نہ ملی تھی - اس میں خیالات کی بلند پروازی بعض قیودِ معمولی کو توڑتی ہوئی نظر آتی ہے - مگر شاعروں کو یہ باتیں معاف ہیں - لیکن شاعر کے قلب پر جو اثر ایسے نظارے سے ہو سکتے ہیں - اُن کی خوب تصویر ہے :-

یارا نہیں فخرِ حسیناں نہ بنایا ہوتا — یا نہیں جامۂ شاہانہ نہ پہنایا ہوتا
تو نے جنت جو یہ دُنیا میں بنا رکھی ہے — کاش شیطان کبھی اس میں نہ آیا ہوتا
مملکت یہ جو ہے پریوں کی سلیمانوں کی — اہرمن نے تو یہاں دخل نہ پایا ہوتا
قیس وارفتۂ لیلیٰ ہی رہا جنگل میں — یہ مرقع تو کبھی اُسکو دکھایا ہوتا
مجھ کو طوبیٰ کا نہیں چاہیئے سایہ ہرگز — ان چناروں ہی کا فردوس میں سایا ہوتا
حوضِ کوثر کے عوض چشمۂ شاہی ہی ملے
یہ نہیں ہوگا تو منعم سے ہمیں ہونگے گلے

میں نہ جاؤنگا نہ جاؤنگا جو کشمیر نہیں — لاکھ جنّت ہو یہ ایسی تو وُہ تعمیر نہیں
حوریں بنجائینگی واں جا کے بتانِ کشمیر — ورنہ فردوس عجوزوں ہی کی جاگیر نہیں
انکو بزدل نہ سمجھنا ہیں بلا کے سفاک — پاس گو کہنے کو شمشیر نہیں تیر نہیں
اپنے قیدی کے لئے زلف ہی کیا کچھ کم ہے — گرچہ ان پاس سلاسل نہیں زنجیر نہیں
کیا عجب گر ہوئے بے پیر بتانِ کشمیر — ہیں یہاں سب ہی جواں نام کو بھی پیر نہیں
پر غضب ہے کہ یہاں موت چلی آتی ہے

غربت امراض کو بھی ساتھ لگا لاتی ہے

ہم کو اُس عالمِ بالا کی خبر ہے معلوم
جسکی مُدّت سے ہر دُنیا میں پڑی ایسی دُھوم
بیش ازیں نیست کہ کشمیر کی ہوگی اِک نقل
وُہ بھی دُھندلی سی پریشاں سی مثالِ موہُوم
جب میں سمجھونگا کہ برائی تمنّائے دِلی
ایک کشمیری ہو خنجر ہو مرا ہو حلقوم
تھے جو لاعینی صنم اُن کی پرستش ہُوئی منع
نہیں کشمیر میں اصنام پرستی مذمُوم
پاؤں پر دُخترِ دہقاں کے وُہ سر رکھدیتا
کبھی کشمیر میں آجاتا اگر قیصرِ روم

مَیں بھی اَے کاش کسی وادی ہی میں کھو جاؤں
یا کسی حُسن کی دیوی پہ فدا ہو جاؤں

یلدرم (از بغداد)

مراثی شاد

حال ہی میں جو مرثیہ تین سو بندوں کا حضرتِ شاد نے تصنیف فرمایا ہے - ابتدا میں قریب تیس بندوں میں وحی والہام کی حقیقت بطور فلسفہ و ادلّہ حکمیہ کے بیان فرمائی ہے جو دیکھنے ہی کے لائق ہے۔ اس وقت تک واقعی اس صراحت و وضاحت سے وحی کا بیان سُنا نہیں گیا آغاز میں یہ بند تمہیداً تصنیف کئے ہیں :-

اَے صدق و صفا آئینہ نفس میں گھر کر
اے پرتوِ الہام مرے دل میں گذر کر
ساقی ہے کرم عام ترا مجھ پہ نظر کر
پیاسا ہُوں کوئی جام پلا آج تو بھر کر
ہے کب سے تحیّر مری حیرت کو گھٹا دے

یہ پردۂ اسرار تو للہ ہٹا دے

اِس بزم میں آنیکا سبب جان تو لُوں میں
لینے کو نہ لُوں کچھ مگر ایمان تو لُوں میں
سمجھاتا ہے جو نفس اُسے مان تو لُوں میں
دھوکا نہ کوئی ہو تجھے پہچان تو لُوں میں
اچھا نہ کسی راز سے یُوں مجھ کو خبر کر
حسرت یہ ہے کہ کیا یاد کروں گا تجھے مر کر

اِنساں پہ صفت نفس کی کُھلتا ہے بہ مشکل
سارے حکما اس میں ہیں اب تک متأمل
دُنیا میں کٹھن سب سے سوا ہے یہی منزل
موقوف اِسی پر ہے تمیز حق و باطل
دریافت کریں نفس کی حالت یہ کدیں ہیں
کیا کیا صفتیں اس کی ہیں کیا اسکی حدیں ہیں

اسکے بعد نفس کی حالتیں اور الہام و وحی کی حقیقت بیان کی ہے۔ اور اسی مرثیہ میں گرمی کی کیفیت چند بندوں میں یوں ذکر فرمائی ہے۔

ممکن نہیں اُس دن کی جو گرمی کا ہو مذکور
گلخن کی طرح آگ سے وہ دشت تھا معمُور
افراطِ حرارت سے برودت یہ ہوئی دُور
گرمی میں بڑھا مُشک سے بھی رُتبۂ کافور
جل جل کے دھواں دیتے تھے ڈالے شجروں کے
اخگر کی طرح خشک تھے خوشے ثمروں کے

وُہ جیٹھ کی گرمی وُہ کڑی دُھوپ وہ میداں
وُہ ریت کا تپنا کہ جُھکا جاتا تھا انساں
وُہ لُو وُہ حرارت کہ جگر ہوتا تھا بریاں
تر تھے جو گریباں تو جبین عرق افشاں
مُنہہ دُھوپ کی شدت سے جُھکا لیتے تھے گھوڑے
رہ رہ کے قدم اپنے اُٹھا لیتے تھے گھوڑے

کچھ کام نہ کرتی تھی نظر دُھوپ کے مارے
آنکھوں میں چمک اُٹھتے تھے رہ رہ کے ستارے
پوشیدہ تھے کثرت سے پرندوں کے کچھارے
سب مُردہ صفت بیٹھے تھے دریا کے کنارے
پانی پہ دم ارباب جہاں دینے لگے تھے
کھولے ہوئے دریا بھی دُھواں دینے لگے تھے

کالا ہوا گرمی سے جہاں رنگ تھا کاہی — گھولا تھا یہ پانی کہ گلی جاتی تھی ماہی
گر گر پڑا تھا غش کھا کے ہوا جب کوئی راہی — دبکے ہوئے تھے آڑ میں گھوڑوں کی سپاہی
زرہوں کے نہ سینے فقط اس لو سے چھپنے تھے
مغفر بھی سلگتے ہوئے تنور بنے تھے

ہر شے کو تب و تاب تھی تھا ظہر کا ہنگام — جل جاتے تھے گرتے ہی زمیں پر ثمرِ خام
چوپائے بھی پانی سے نہیں ہٹتے تھے دو گام — تھے صبح سے منہ ڈالے ہوئے منتظرِ شام
بغلوں میں چھپائے تھے طیور اپنے سروں کو
پتوں میں چھپے جاتے تھے پھیلائے پروں کو

سایہ بھی درختوں کی نگاہوں سے ہوا اوجھل — جو شاخ بریدہ ہے وہ سلگی ہوئی مشعل
گر پڑتا ہے کملا کے بڑھا پھول سے جب پھل — جو برگ ہرا اخگر ہے جو تھالا ہے وہ منقل
نقصاں جو بڑے آگ کے لگنے سے سہے ہیں
کہسار بھی اجزائے دروں پھینک رہے ہیں

زرہیں بھی پگھلتی تھیں وہ اس دن تھی کڑی دھوپ — تیورا کے گرا خاک پہ وہ جس پہ پڑی دھوپ
تھراتا تھا خود مہر کہ ہے آج بڑی دھوپ — کیا منہ تھا کسی کا کہ سہے ایک گھڑی دھوپ
ذی روح جھکائے ہوئے سر ہانپ رہے تھے
جتنے تھے جمادات وہ سب کانپ رہے تھے

سرسبز شجر سوکھ گئے باغ کے بالکل — منہ زرد تھا اور غرق پسینے میں ہر اک گل
منقار کو کھولے ہوئے تھراتی تھی بلبل — پڑتی تھی کڑی دھوپ تو بل کھاتا تھا سنبل
تھی بند ہوا عقل تھی گم چرخِ کہن کی
خس خانے کے اندر تھی زمیں صحنِ چمن کی

جھک پڑتے تھے پانی کی طرف سرو لبِ جو — قمری کو فراموش ہوا نالۂ کوکو

بن میں صفتِ مُشک سیہ فام تھے آہو
شبنم تھی یہ تشنہ کہ پئے جاتی تھی آنسو
بُو اُڑ گئی گھبرا کے گُلوں کی چمنوں سے
پتّوں کی بھی باہر تھیں زبانیں دہنوں سے

دھرتی ماتا

اَے مری دھرتی ماتا مائی ۔ اے سارے سنسار کی دائی ۔ بُوڑھے بچّے پالنے والی
کچّے بچّے پالنے والی ۔ آدم وحوّا کی اولادیں ۔ سب ہیں تیری ہی اولادیں
تیرے پیٹ پہ دویں گادیں ۔ ناچیں کوُدیں شور مچاویں ۔ تجھ سے پیدا چڑیا چُنگل
طوطے ۔ مینا ۔ شاما ۔ بُلبل ۔ کالی گھٹائیں ساقن تیری ۔ بادِ بہاری مالن تیری
باغ میں ہے ہریالا تیرا ۔ گاتی ہے بُلبل سہرا تیرا ۔ ساون بھادوں کی رُت آوی
اور پپیہا شور مچاوے ۔ کالی گھٹا سے پانی برسے ۔ پانی کیسا موتی برسے
کیوڑا مہکے بیلا پھُولے ۔ ڈال پہ بُلبل جھُولا جھُولے
آہا کیسے کیسے مزے ہیں
کیا کیا ہم یہ دیکھ رہے ہیں
قُدرت کی اے راج دُلاری ۔ اَے سارے سنسار کی پیاری ۔ مجھ کو سَیر دکھانیوالی
میرا دِل بہلانے والی ۔ اَی مری جانی اَی مری بوجھی ۔ میرے ساتھ کی کھیلی کُودی
ایک زمانہ تک تو کتنی ۔ میری نظروں میں تھی پیاری ۔ آہ مرے بچپن کا زمانہ
وُہ مرا بھولا بھالا زمانہ ۔ جب میں واقف بھی نہ تھا اِس سے ۔ جینا کیا ہے مرنا کیا ہے
اور وہ مری بیفکر جوانی ۔ غفلت میں جو میں نے کاٹی ۔ لیکر تیرا سودا سر میں

دیس بدیس میں سیر و سفر میں　　پھرتا تھا میں مارا مارا　　تیری محبت میں آوارہ
آہ مجھے سب یاد ہے اب تک　　کتنی تو دلچسپ تھی جبتک　　سبزہ تیرا فرش تھا میرا
برسوں میں ہوں اُس پر لوٹا　　تیرے باغ اور تیرے جنگل　　تیرے اکھاڑے تیرے دنگل
تیری کھیت اور تیری جھیلیں　　تیری دُکانیں تیری سبیلیں　　برسوں میں ہوں اُنمیں گھوما
سیریں کیں اور دیکھا بھالا　　تیری نہر کا بہتا پانی　　برسوں دیکھی اُسکی روانی
گھنٹوں بیٹھا ہوں میں جاکر　　پانوں پانی میں لٹکا کر　　وہ تیری پُر تفریح ترائی
برسوں میں نے ہوا ہی کھائی　　کھیلا ہوں میں کرکٹ اکثر　　تیری گیندے کے گیند بنا کر
ہری بھری پھلواریاں تیری　　وہ بیلے کی جھاڑیاں تیری　　پھرتی ہیں یوں میری نظر میں
تصویریں ہیں دیوار پہ گھر میں　　یاد ہے مجھ کو جب میں چڑھ کر　　ایک پہاڑی کی چوٹی پر
شاخ پر ایک درخت کے بیٹھا　　کرتا تھا میں تیرا نظارا　　کوسوں تک وہ تیرا سبزہ
دہانی - ماشی - کاہی بھورا　　کوسوں تک وہ تیرے میدان　　ستھرے صاف - چٹیلے میدان
چھٹکی چھٹکی جھاڑیاں اسپر　　قدرت کی گلکاریاں اسپر　　تال - تلیاں - دریا ریتی
باغ - چمن - آبادی کھیتی　　ایسے تھے سب میری نظر میں　　پائیں باغ ہو جیسے گھر میں
جب میں یہ سب دیکھ رہا تھا　　خوش تھا دل اور یہ کہتا تھا　　حدّ نظر کو اور بڑھاؤں
ایسی بلندی پر چڑھ جاؤں　　ایسی چوٹی پر بیٹھوں میں　　صاف جہاں سے دیکھ سکوں میں
شہر اور صوبے گاؤں اور قصبے　　بکھرے بکھرے چھٹکے چھٹکے　　سارا قدرت کا فرنیچر
میرے آگے آئے سمٹ کر　　ساری انسانی آبادی　　یعنی دنیا کی آبادی
میرے آگے کھیل رہی ہو　　روتی گاتی اور ہنستی ہو　　اس محویت میں جب میں تھا
مجھ کو ہوا معلوم کہ گویا　　کوئی مجھ کو کھینچ رہا ہے　　چونک پڑا میں کون ہے کیا ہے
لیکن آہ نہ جانا میں نے　　تجھ کو نہ تھا پہچانا میں نے　　اب جو میں نے ہوش سنبھالا
غور سے تجھ کو دیکھا بھالا　　کُھل گئی تیری ظاہر داری　　دھوکہ بازی اور مکاری

یعنی کشش وہ تیری ہی تھی
توہی مجھ کو کھینچ رہی تھی

آخر تو نے گرا کر چھوڑا
خاک میں مجھ کو ملا کر چھوڑا

ای میری جھوٹھے وعدوں والی
چکنی چپڑی باتوں والی
جسکی دوست اسی کی دشمن

جسکی مولد اسی کی مدفن
جسکو سنوارے اسکو بگاڑے
جسکو پالے اسی کو مارے

جانی دشمن اچھی خاصی
جان کی بھوکی خون کی پیاسی
لاکھوں چڑیا چنگل کھائے

لاکھوں نتھیں منہہ میں دبائے
لاکھوں پالے لاکھوں مارے
لاکھوں تولے لاکھوں گاڑے

جھگڑے پیدا کرنے والی
فتنے برپا کرنے والی
لڑوا دینا کام ہے تیرا

بس بہرا بسوہ نام ہی تیرا
تیری ذات کا سارا جھگڑا
آئے دن کا خون خرابا

جسکو تو نے آہ ہنسایا
آٹھ آٹھ آنسو اُنکو رلایا
راجہ پرجا اور سپاہی

سادھو جوگی اور سنیاسی
اوّل اوّل ریجھے تجھ پر
پھر جو دیکھے تیرے چلتر

ایسے ایسے چرکے کھائے
وہ وہ صدمے دل پہ اٹھائے
خون کے آنسو اُٹھے رو کر

ایسے گئے ناخوش ہوکر
پھر نہ تیری صورت دیکھی
اور نہ اپنی شکل دکھائی

نادر علیخان نادر (کاکوروی)

چاندنی

کشمیر میں جہاں اَور دلفریبیاں اور دلآویزیاں دلوں پر قبضہ کئے لیتی ہیں۔ شب ماہ کا دلکش منظر بھی خصوصاً ماہ اگست میں اہل دل کیلئے ایک خاص لطف رکھتا ہے۔ انہی دنوں میں

اتفاق حسنہ سے حسن نیچر کی کشش ہمارے مکرم آنریبل مسٹر شاہ دین صاحب ہمایوں کو بھی کھینچ کر لے گئی چنانچہ ایک دعوت کی تقریب پر جہاں جناب ہمایوں اور جناب چوہدری خوشی محمد صاحب ناظر اور دیگر علم دوست اصحاب بھی موجود تھے۔ حضرت صادق نے پچاس شعر کی ایک نظم پڑھی جس میں سے چند شعر ہم ناظرینِ مخزن کی نذر کرتے ہیں:-

واہ کیا دلکش ہے تیرے دم سے منظر چاندنی — تو نے جادو کر دیا شاعر کے دل پر چاندنی
ہاتھ لگ جاتا ہے اس کے جب کوئی دامانِ ابر — مُنہہ چھپا لیتی ہے کیا پہلو بدل کر چاندنی
اِس لئے کھینچا ہے حق نے کوہساروں کا حصار — تا نہ جانے پائے اس وادی سے اُڑ کر چاندنی
ہم کو ایوانوں سے مطلب جب سے ہیں صحرا نشیں — ہے زمیں اپنا بچھونا اور چادر چاندنی
پھول کرتے ہیں سحر کو اپنی خوش رنگی پہ ناز — شب کو رکھ لیتے ہیں جیبوں میں چُرا کر چاندنی
جا لپٹتی ہے جوانانِ چمن سے بار بار — چُومتی پھولوں کو ہے نظریں بچا کر چاندنی
شُعلۂ جوالہ ساں ارض و سما پر ہے محیط — بحرِ فطرت کی ہے گویا موجِ مضطر چاندنی
اچھے اچھے اہلِ دانش کی بھلا دیتی ہے ہوش — ہے نکلتی رات کو جب بن سنور کر چاندنی
ہیں جو بالاتر سدا رکھتے ہیں پستوں کا خیال — آسماں پر چاند ہے اور ہے زمیں پر چاندنی
دامنِ کوہسار میں کبکِ دری ہنستا ہے کیوں — چاند کا پیغام لائی مسکرا کر چاندنی
توڑ کر نکلا کوئی دیوانہ زنجیرِ جنوں — ڈھونڈتی پھرتی ہے اس کو آج گھر گھر چاندنی
تشنہ کامِ بحرِ قدرت آئے اور دیکھے یہاں — بہ رہی ہے مثلِ موجِ آبِ کوثر چاندنی
دیکھ انوارِ لطافت فلسفی اور دم نہ مار — سانس لینے سے نہ ہو جائے مکدر چاندنی
سبزے پر بکھرا ہے یہ کوئی ستارہ ٹوٹ کر — باغ میں آتی ہے یا شاخوں سے چھن کر چاندنی
ایسی ٹھنڈک۔ یہ ہوا۔ یہ بوئے دلکش اور یہ نور — کر رہی ہے بارشِ کافور و عنبر چاندنی
لوریاں دیتا ہے اسکو آبشاروں کا الاپ — یا ہوئی پانی کے تاروں پر نوا گر چاندنی
ہو مبارک جلسۂ یارانِ اخوان الصفا — جلوۂ نورِ خدا اندر ہے باہر چاندنی

ذرہ ذرہ میں ہوئی حسنِ ازل کی سی نمود — بسکہ ہے دشت وجبل میں جلوہ گستر چاندنی
کاش آنکلیں کہیں نیرنگ اور اقبال بھی — وُہ بھی سُنتے ہیں۔ کہ ہیں تیرے ثنا گر چاندنی
کام آیا اے ہمایوں تیری خاطر کا طلسم — آگئی تحریر کے شیشے میں اُڑ کر چاندنی
صادقِ بیدل پڑے ہیں گوشۂ کشمیر میں — جیسے جاڑوں میں رہا کرتی ہے شب بھر چاندنی

صُوفیانہ رنگ کے پردے

میں غش ہوا جو پردہ اُٹھا روئے یار کا — پردہ ڈھکا رہا مرے صبر و قرار کا

(سرور)

حُسنِ معنی جو ہوا پردہ کشائے نیچر — چٹکیاں لینے لگی دِل میں ادائے نیچر
تیری قدرت جو ہُوئی جلوہ فزائے نیچر — ماہ وخورشید ہوتے محوِ لقائے نیچر
پھر تو بے پردہ تجلّی نظر آئی تیری
دِل کے آئینے میں تصویر اُتر آئی تیری

آشکارا ہُوئی وحدت تری کثرت بنکر — نظر آنے لگی خلوت تیری جلوت بنکر
تو جو ظاہر ہوا پردے سے حقیقت بنکر — پھر تو اُڑنے لگی شہرت تری نگہت بنکر
بنکے جب کارگہِ دہر میں اُستاد آیا
لئے اِک بوقلموں پردۂ ایجاد آیا

تیری شوخی نے اُٹھایا جو حیا کا پردہ — نظر آیا عجب اِک حُسنِ ادا کا پردہ
اُٹھ گیا صاف۔ جو حائل تھا خفا کا پردہ — رُخ کا پردہ تھا نہ اب زلفِ دوتا کا پردہ
بنکے آئے نظر ایام ولیالی دونوں
تھے نتری جلوہ نمائی سے نہ خالی دونوں

اپنے بندوں سے جو پردہ تجھے ستار نہ تھا — کوئی بندہ ترا حسرت کشِ دیدار نہ تھا
درمیاں میں جو ترا پردۂ اسرار نہ تھا — آئینہ تشنہ لبِ جلوۂ انوار نہ تھا
لاکھ پردوں سے نظر تو مرے ستار آیا
حُسن بنکر ترا یوسف سرِ بازار آیا

تری صُورت میں عجب عالمِ یکتائی تھا — ایک عالم تری صُورت کا تماشائی تھا
تو نہ کب تشنہ لبِ انجمن آرائی تھا — برق بے پردہ نہ کب پردۂ رعنائی تھا
شوخیٔ حُسن ازل کہتی تھی دلہن بنکر
مَیں رہونگی نہ چراغِ تہِ دامن بنکر

تو اُٹھاتا نہ اگر پردۂ انوار شہود — دیکھتا کون تجلّی تری یاربِ ودُود
پردۂ غیب سے ہوتا کسی شے کا نہ وجُود — ہیں کرشمے ترے جلوے کے یہ سب یا معبُود
تو نہ پردے میں اگر پردہ کشائی کرتا
کس کو قدرت تھی کہ پیدا یہ خدائی کرتا

محتجب پردۂ وحدت میں جو کثرت ہوتی — پردہ داری جو تیرے حُسن کی عادت ہوتی
تو خُدائی تری ہوتی نہ یہ خلقت ہوتی — اَور ہی عالمِ ایجاد کی صُورت ہوتی
چاند سُورج نہ یہ ہوتے نہ یہ تارے ہوتے
تیری قدرت کے نہ آنکھوں کو نظارے ہوتے

گھر سے بے پردہ نکلتی جو نہ وحدت تیری — بیٹھی ہوتی کہیں سمٹی ہُوئی کثرت تیری
مُنھہ چھپا لیتی دُلہن بنکے جو قدرت تیری — کس پہ کھلتی مرے ستار حقیقت تیری
رُخ سے پردہ جو حیا کا نہ اُٹھایا ہوتا
بنکے یُوسف سرِ بازار نہ آیا ہوتا

تو اُٹھاتا نہ اگر پردۂ اخفائے عدم — دیکھنے والے تجلّی کے تری کون تھے ہم

تو دکھاتا نہ اگر جلوۂ انوارِ حرم — کس پہ کھلتا میرے ستّار ترا رازِ قدم
پوجتی پاؤں ہر اِک بُت کے خدائی تیری
شُکر ہے - ہم کو تجلّی نظر آئی تیری

حُسنِ باطن کو جو پردے میں بٹھالا ہوتا — نُور تیرا ترے آغوش کا پالا ہوتا
طُور پہ برقِ تجلّی کو سنبھالا ہوتا — گھر سے بے مقنع و چادر نہ نکالا ہوتا
آنکھ مُوسےٰ سے جو تو نے نہ لڑائی ہوئی
طُور پر برقِ تجلّی نہ گرائی ہوئی

حُسنِ ایجاد کا پردہ تو اُٹھاتا نہ اگر — تری صنعت کے نمونے نظر آتے کیونکر
وُہ عناصر کا ہیولا جسے کہتے ہیں بشر — بطنِ مادر کے نہ پردے سے نکلتا باہر
برق بے پردہ جو گرتی تیری چلمن بنکر
بیٹھ جاتی کہیں شوخی تیری دُلہن بنکر

جلوہ فرما نہ ترا حُسنِ تماشا ہوتا — کہ خود آئینہ تو اُو آئنہ سیما ہوتا
اپنے بندوں سے جو یارب تجھے پردا ہوتا — آکے دُنیا میں ترا حسن نہ رسوا ہوتا
تجھ کو تشہیر کیا تیری خود آرائی نے
کردیا عام تجھے جلوۂ ہرجائی نے

وحیدن بیگ دہوی

ناظم

نوّاب محمد یُوسف علیخاں بہادر مرحوم رئیس رام پور مُراد آباد | نوّاب محمد سعید خاں بہادر کے فرزند ارجمند تھے - ۵ ربیع الآخر ۱۲۳۱ھ ہجری سال ولادت ہے - دس برس چار مہینے گیارہ روز وسادہ آرائے ریاست رام پور رہے - ۲۴ - ذیقعدہ ۱۲۸۱ھ ہجری کو رحلت فرمائی - ریاست کے نظم ونسق میں اپنی

فکر صائب سے اصلاحات پسندیدہ کیں - باغات اور تعمیرات سے شہر کی رونق بڑھائی - غدر ۱۸۵۷ء کے پرآشوب زمانہ میں رام پور کو شر و فساد سے محفوظ رکھا بلکہ حسب رائے سرکار انگلشیہ ضلع مراد آباد کا انتظام بھی اپنے ہاتھ میں لیا اور فیروز شاہ کو پسپا کیا - جنگ کے صلے میں دولت برطانیہ نے ایک قطعہ ملک خراجی ایک لاکھ اٹھائیس ہزار پانسو روپیہ ملحق ریاست اور اختیار فصل خصومات دیوانی و فوجداری عطا فرمایا اور تمغائے ستارۂ ہند اور خطاب فرزند دلپذیر بھی مرحمت ہوا - جملہ علوم و فنون مشرقیہ میں مہارت تھی - علی الخصوص منطق کی جانب میلان طبعی تھا - ذہین و طباع رنگین طبیعت خوش صحبت تھے - فن شعر کے قدردان تھے - منشی مظفر علی خاں اسیر جناب امیر مینائی مرحوم - منشی سید اسمٰعیل حسین منیر - شیخ امداد علی بحر - مرزا محمد رضا برق - منشی احمد حسن عروج کو طلب فرمایا اور قدر افزائی کی - ہمیشہ علمی مباحث اور سخن آفرینی کے مشغلے رہتے تھے - چنانچہ ایک غزل میں مقطع کہتے ہیں - ع شعر کا چرچا ہو اور شاعر کی قدر - خوش ہوئے ناظم کے ہم دربار سے - خود بھی شعر فرماتے تھے - ابتدا میں جب دلی میں تھے تو مومن مرحوم کو کلام دکھاتے تھے پھر مرزا غالب سے مشورہ ہوا اور بعد رحلت مرزا - منشی مظفر علی خاں اسیر لکھنوی سے استفادہ فرمایا - دیوان جو ملاحظہ مرزا غالب مرحوم میں گذرا ہے وہ مطبع حسنی رام پور میں ۱۲۸۰ء ہجری میں بکتابت محمد کریم اللہ خوشنویس طبع ہوا ہے اس دیوان میں علاوہ غزلیات کے ایک خمسہ اپنی غزل کا اور تین سہرے اپنے بھائی نواب حیدر علیخاں مرحوم کی عقد مناکحت کے اور نو سلام اور رباعیات اور ایک قطعہ تاریخ عطائے ملک جدید یہ سرمایہ ہے - ہر صنف شعر میں جدت ترکیب نوی الفاظ تازگی مضمون شوخی ادا اور تمام خصوصیات کلام مرزا کی پائی جاتی ہیں - اور خوب دیوان ہے -

انتخاب جو میں نے اس دیوان کا کیا ہے - وہ بعد نظر ثانی جناب ثاقب رسالہ مخزن میں پیش کرتی ہوں - اُمید کہ مقبول معنی سنجان دقیقہ یاب ہو -

راقمہ

عفت عاصیہ

منتخبات از دیوان ناظم

اُترے گا تری گلے سے جو ہار
پیرایۂ نو بہار ہوگا۔

پیرایۂ نوبہار - اچھی ترکیب ہے۔

تو نہ آیا پر اجل وقت سے پہلے آئی — آدمی اس کی اگر اتنی تمنا کرتا
گر پڑ کے لیا میکدہ سو بار مگر گیا — بھر دیتے ہیں گر مے سے تو مینا نہیں اُٹھتا

مینا نہیں اُٹھتا - کیا ضعف ہے۔

کیا ہم بھی یہاں آئے تو بُت بنگئے ناظم — بُتخانے سے در تک قدم اپنا نہیں اُٹھتا
دل کے لینے ہیں یہ قدرت اسے اللہ نے دی — جس کو مٹی کے کھلونے پہ مچلتے دیکھا
کہاں کی نیند ادا جب یہ اسکی یاد آ جائے — اُٹھا کے تکیہ سے بازو پہ سر کو دھر لینا
دیکھ کر شمع پہ گرتے ہوئے پروانے کو — پُوچھتے ہیں کہ یہ ہوتا ہے تماشا کیسا
بس اے حریص قتل کہ اب ہوگیا ہے تنگ — ارواح کے ہجوم سے عالم مثال کا
ڈھونڈوں تو کس پتے سے اُسے پاؤں اے خدا — عاشق ہوں حسنِ سادہ بےخط و خال کا
فرقت میں بندھ رہا ہے تصور وصال کا — داغِ جگر چراغ ہے بزمِ خیال کا
یہ عالم آئینہ ہے تیرے رُوے زیبا کا — وُہ تو ہی ہوگا اگر کوئی دوسرا ہوگا
گداز دل ہے ناظم یہ جو آنکھوں سے ٹپکتا ہے — پڑا ہے مجھ کو رونا داغہاے سینہ فرسا کا
ناظم وفاے وعدہ کی اُمید ہے کسے — مرنا بھی اس فریب میں دشوار ہوگیا

سبحان اللہ - کیا شعر ہے۔

ہوتے ہی دردِ دل کا بیاں اُٹھ کھڑے ہوئے — یعنی یہ ایسے ہیں کہ نہ اُن سے سُنا گیا
معتقد ہوں کعبے کا ناظم یہ وہاں جا کر مجھے — عبرت آتی ہے کہ کیا بُتخانہ ویران ہوگیا
بات ایسی کونسی ہے کہ جسکو بڑھائیے — اک مختصر سوال ہے یا بوسہ یا جواب
مے پیجئے بہار میں پُوچھے اگر خدا — ہے عذر ذوقِ بخششِ آب و ہوا جواب

دوسرا مصرع گویا مرزا کے دیوان ریختہ کا فارسی مصرع ہے۔

زمیں پہ گر کے بھی ہوتی نہیں شراب ہلاک — کہ زیرِ خاک ہیں رنداں بادہ خوار بہت

گر نہ تھی ہجر میں اُمیدِ وصال — جیتے رہنے کا ہوا کیا باعث
چشمۂ خضر میں مے ہے بیشک — آب ہو عمر فزا کیا باعث
عشق ایک گنج ہے مگر اس میں ہوئی ہیں جمع — غمہائے جاں گداز و مرضہائے لاعلاج
دکھلاؤں حال کیا انہیں جنکی تمام عمر — دیکھی یہی طرح کہ نہ دیکھا کسی طرح

یہی طرح - کو دیکھیئے اور عالمِ خیال کے لُطف اُٹھائیے۔

لائے کس کے لئے پہنچائے کسے جائے کہاں — بُوئے گل سے ہے خفا بادِ سحر میرے بعد
وہی تم ہو وہی خنجر ہے پر انصاف کرو — ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے ہو کیا میرے بعد

قطعہ

اس تلازم کو تو دیکھو کہ جو بھیجے تم کو — شوقِ دیدار میں لکھ لکھ کے مکرر کاغذ
پھاڑ کر پھینکدیئے تم نے پر اُن ناموں کے — جمع ہیں سُرمہ فروشوں کی دکاں پر کاغذ
خوش ہیں سب غنچے کے کھلنے سے کرے کون خیال — کہ بنا زخمِ جگر عقدۂ دل وا ہو کر
قتل سے میرے عبث ڈرتے ہو دب جائیگی بات — کوئی دو چار جگہ شہر میں چرچا ہو کر
نہ دو نزاع کو اتنا بھی طُول ڈرتا ہوں — کہ جا پڑے نہ کہیں بات روزِ محشر پر
ملے ہیں آج کفِ پائے یار سے ناظم — بجا ہے دُوں اگر آنکھوں کو میں جگہ سر پہ

قطعہ

کل سُنا ہے کہ مرض کھونیکا دعوے کر کے — اِک بڑے چارہ گر آئے ترے بیمار کے پاس
دی دوا لکھ کے پر اس خستہ نے لی راہ عدم — نسخہ پہنچا بھی نہ ہوگا ابھی عطار کے پاس

قطعہ کے مصرعِ آخر کی شوخی اندازِ خاص ہے مرزائے مرحوم کا۔

تیر ابھرتا اس فضا میں دیر تک منظور ہے — ورنہ حق کو کیا ہی طولِ روزِ محشر سے غرض

یہ خیال بھی خصوصیاتِ اُستاد سے ہے۔

میں نے کہا کہ دعوئے اُلفت مگر غلط — کہنے لگے کہ ہاں غلط اور کس قدر غلط

کسقدر غلط کے وسعتِ معنیٰ مُلاحظہ ہو۔

آجائے کوئی دم میں تو کیا کچھ نہ کیجیئے — عشقِ مجاز و جستم حقیقت مگر غلط

مصرعِ اولیٰ کی شوخی اور مصرعِ آخر کی ترکیبِ پارسی اُستاد کی توجّہ پر دلالت کرتی ہے۔

بوس و کنار کے لئے یہ سب فریب ہیں — اظہارِ پاکبازی و ذوقِ نظر غلط
مٹھی میں کیا دھری تھی کہ چپکے سے سونپ دی — جانِ عزیز پیشکش نامہ بر غلط
پوچھو کہ کوئی مر کے بھی کرتا ہے کچھ کلام — کہتے ہو جان دی ہے سرِ رہگذر غلط
ہم پوچھتے پھریں کہ جنازہ کدھر گیا — مرنے کی اپنے روز اڑائی خبر غلط
آیت نہیں حدیث نہیں جسکو مانئے — ہے نظم و نثر اہلِ سخن سر بسر غلط

خوب غزل لکھی ہے اور ردیف کتنی استوار ہے۔ اس غزل کو استاد مرحوم جناب امیر مینائی علیہ الرحمۃ اور نواب مرزا خاں داغ دہلوی نے بھی تضمین کیا ہے۔ داغ کے مصرعے نہایت شوخ ہیں۔

مٹ گئے حرف بسکہ تھیں نمناک — میں نے آنکھوں سے کیوں لگایا خط
دل دے کے زندگی میں دعا پاتے تھے ثواب — کرتا ہوں جان دینے میں تکرار وقتِ نزع

عالمِ نزع کی بے آرامی اور دیر پائی کو کہتا ہے کہ گویا میں جان دینے میں تکرار کرتا ہوں۔ یہ بھی غالب کا فیضانِ سخن ہے۔

طاؤس لالہ زار میں تو نے کیا ہے رقص — جوڑے گئے الجھ کے ترے بال و پر میں داغ

بال و پر میں داغ الجھ کے رہ گئے۔ یہ نوی خیال میرزا صاحب کا قصہ ہے۔

نو بہار آئی اور کیا ہوگا — کچھ نکھر جائیگا خزاں کا رنگ

بہار سے خزاں کا رنگ نکھر جائیگا۔ کیا شادابی خیال ہے۔

کیا غضب ڈھائے دیکھئے ناظم — ہے برا چشمِ خوں فشاں کا رنگ

ہمنشیں صورت آرائش عالم کب تک — جاودانی سہی یہ نقش مگر ہم کب تک
کیا نہ سو کہینگے سرشک اور نہ دم ٹوٹیگا — گریہ پے در پے و فریاد دما دم کب تک
چارہ گر چھوڑ کہ مجھ میں نہیں طاقت باقی — زخمِ دل لطمہ خورِ پنبۂ مرہم کب تک
پھاڑ ڈالو مرے ناموں کو ملے گر نہ جواب — ہونگے دیوار کے روزن میں فراہم کب تک
بت سے ناخوش ہے تو کیوں اٹھ نہیں جاتا ناظم — دیر میں تذکرۂ کعبہ و زمزم کب تک

زخمِ دل لطمہ خورِ پنبۂ مرہم کب تک۔ کب تک یا تا کے۔

یارب عدو کی بالش و بستر سے لی نہ ہو — لائی ہے باد راکہ جان فزائے زلف

ترکیب اور توانائی الفاظ قابل ستائش ہیں اور خیال بھی اچھا ہے۔

قیمت سالانہ مع محصول ڈاک قسم اول (للعہ) فی پرچہ ۴ر قسم دوم (للعہ) فی پرچہ ۳ر

جلد (۸) دسمبر سنہ ۱۹۰۴ء نمبر (۳)

ایڈیٹر شیخ عبدالقادر بی اے

مخزن

اُردو علم ادب کی دلچسپیوں کا ایک ماہوار مجموعہ



مضامین نثر

دیباچہ غرۃ الکمال امیر خسرو - مولوی حبیب الرحمن خان شروانی ۱
ہندوستان - منشی حامد علی صدیقی سہارنپوری - ۱۱
انسانی افعال اطاعت - لالہ دیوان چند بی اے پلیڈر ۱۷
قرۃ العین - منشی نیاز احمد از میرٹھ - ۲۴
کرشن جی - "اختر" دہلوی - ۳۰
زندگی کی محبت - خواجہ لطیف احمد بی اے - ۳۸
اہل قلم کی اپیل - قلم باز خان - ۴۲

مضامین نظم

جگنو / صبح کا ستارہ - شیخ محمد اقبال ایم اے ۴۶ / ۴۷
وجد و سماع - حافظ سید فضل حق آزاد عظیم آبادی ۴۸
لوری - چوہدری خوشی محمد بی اے - ۵۰
بارہ دری - سید علمدار حسین ہنوطی ۵۴
تلاش محبت - میر نیرنگ بی اے ۵۶
مرغ و صیاد - منشی درگا سہائے سرور جہان آبادی ۵۸
تازہ غزلیں ۶۲

لوکروڑ ہندوستانی اُردو بولتے ہیں - اور اسی قدر اور ہندوستانی اردو سمجھتے ہیں

○ ان شہروں میں اردو مادری زبان ہے ▭ ان شہروں میں اردو مروج ہے ⊕ ان شہروں میں اردو سمجھی جاتی ہے

خادم التعلیم سٹیم پریس لاہور میں ملک عبدالعزیز مینیجر کے اہتمام سے چھپا
اور شیخ محمد اکرام اسسٹنٹ ایڈیٹر نے شائع کیا

مخزن

دیباچۂ غُرّۃ الکمال امیر خسرو

پر

ریویو

یہ امر مسلم ہے کہ خسروِ اقلیم سخن امیر خسرو کا خزانۂ کلام شمار سے باہر تھا۔ نسل تیمور کے ایک فرماں روا کے کتابخانے میں امیر ممدوح کے لاکھ سے زیادہ شعر موجود تھے۔ جب نئے کلام کی آمد موقوف ہو گئی تو اُس کو دعویٰ ہوا کہ اب اس سے زائد نہیں ہے اگر ہے تو کوئی لائے اور انعام لے۔ انعام کے شوق میں لوگ تلاش کر کر کے نئے نئے مجموعے لاتے جو آتا یہاں موجود ملتا۔ جب دعویٰ فیصلہ بن چکا تو ایک ضخیم جلد آئی جو شاہی کتابخانے میں نہ تھی۔ بادشاہ کو کوکبۂ خسروی کے سامنے سر جھکانا پڑا اور اُس نے تسلیم کیا کہ امیر باکمال کا کلام حد شمار سے خارج ہے۔ داغستانی نے لکھا ہے کہ امیر خسرو کے تین دیوان ہیں۔ تُحفۃ الصّغر۔ وسط الحیٰوۃ۔ غُرّۃ الکمال۔ لکھنؤ میں جو دیوانِ خسرو چھپا ہے اُس کے دیباچے میں فرماتے ہیں "اب تک میرے چار دیوان ہو چکے ہیں۔ تُحفۃ الصّغر۔ وسط الحیٰوۃ۔ غُرّۃ الکمال۔ بقیہ نقیہ۔ یہ مجموعہ انہیں اربعہ عناصر سے صورت پذیر ہوا ہے۔ اس کے بعد جو کلام موزون ہوگا وہ پانچواں دیوان ہوگا" خاکسار کو ایک قلمی مجموعہ ملا ہے جس کا نام نہایۃ الکمال ہے۔ جس میں دیباچہ۔ قصائد غزل وغیرہ سب کچھ ہے۔ ممکن ہے کہ یہ پانچواں

دیوان ہو۔ دیباچے میں اس کا ذکر نہیں کہ یہ کونسا دیوان ہے۔ اس کے سوا میرے یہاں ایک اور ضخیم قلمی نسخہ ہے۔ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ مستقل مجموعہ ہے یا عطر مجموعہ۔ لکھنوی نسخے کی بعض غزلیں اس میں ہیں (جو مختلف دیوانوں کی ہیں) لیکن اس کی بیسیوں غزلیں اس میں نہیں۔

تحفۃ الصغر ہاتھ آیا تو اُس کے دیباجے کا خلاصہ ناظرینِ مخزن کی نذر کیا گیا۔ اب خوبی قسمت سے غرۃ الکمال کا دیباجہ دستیاب ہوا ہے۔ شوق کہتا ہے کہ اِس کے جواہرات بھی مخزن کو بھیج۔ اگرچہ جوہری سات سمندر پار علم کے موتی رولنے چلا گیا لیکن جواہر خانے کا دروازہ کھلا ہوا ہی۔

ہنوز آں ابرِ رحمت دُرفشان است

مَے و میخانہ با مہر و نشان است

خدا اس خزانے کو معمور رکھے۔ غریب الوطن دوست کی نشانی ہے۔ دیباچہ غُرۃ الکمال کے تئیس صفحے ہیں۔ عبارت اوّل سے آخر تک مرصّع اور رنگین ہے۔ مگر دربار خسروی کا یہ آداب ہے کہ مرصّع اور رنگین عبارت کا خلعت واقعات کو عطا ہوتا ہے۔ کارچوبی پوشاک خیالی پیکر کو نہیں پہنائی جاتی۔ حمد کے بعد نعت ہے نعت کے بعد پیر کی مدح۔ پھر سلسلۂ سخن یُوں آغاز فرماتے ہیں کہ انسان کا سرمایۂ ناز نطق ہے۔ اور نُطق قدرتِ الٰہی کا برگزیدہ نمونہ۔ اِسی سلسلے میں لکھتے ہیں کہ دیکھو بہرا اور گونگا چُونکہ فیضِ سخن سے محروم ہے لہذا کسی بزم میں توقیر نہیں پاتا۔ طوطی اور شارک (مینا) حالانکہ جانور ہیں مگر انسانی کلام کی نقالی کی بدولت وُہ قدر پاتے ہیں کہ انسان کی خوش بیانی کی مثال اُن سے دی جاتی ہے۔ نمونۂ عبارت ملاحظہ کیجئے:۔

"طُوطی کہ حیوان غیر ناطق است بسبب نطقِ عاریتی درجتے یافتہ است کہ ارباب الباب جملہ فصحاء عالم و فضلاء عالم را نسبتِ سخن برو میکنند و مدام قفسِ عزتِ او را در بالین گاہ سران و پائین جائے سروران بآئینِ مکنت مکانے بلند ارزانی میدارند......[۵۱]

[۵۱] طوطی جو ایک حیوان غیر ناطق ہے اُس کا درجہ عارضی گویائی کی وجہ سے اتنا بلند ہے کہ سارے عقلا فاضلوں اور فصیحوں کی گویائی کو اس کے ساتھ تشبیہہ دیتے ہیں۔ اور اسکا پنجرہ سرداروں کے یہاں سر بلند ہی

ملے ودر سوادِ ہندوستان کہ خیال بہشت در آئین ہائے پرطاؤسان او بتوان دید۔ مرغیست کہ آنرا شارک میگویند ودر خراسان سارو(واؤ مجہول) میخوانند۔ واین خبر سار در طوطیانِ جہان طیران نمودہ کہ زبان آموزان ماہر مُہر دہانش چنان باز میکنند کہ .... بسخن شیریں شکر خواری مے شود کہ پیشِ او بلبلاں را گاہ شکر خائی زبان شیریں درکام گرفتہ میگردد بلکہ سخن در دہان .... باز ہم در ..... ہندوستان زنار دارانند .... زبان ایشاں بربیان منطق الطیر در افواہ افتادہ چنانچہ درمعرفت بانگ زاغ کتاب ہا ساختند وچیزے از مغیبات ازاں سواد میتوانند کہ بخوانند۔ واز تیزی زبان گنجشک بالقطع فالے میگیرند ومیگویند کہ بیشتر موافق ومقابل مے اُفتد وبعضے مردمان ناقص عقل کہ از مرتبہ عاقلی غافل اند ایشاں را بجہتہ بیان منطق مرغے کہ میگوید ونمیداند کہ چہ میگوید شب وروز پرسش وپرستش میکنند وہر روائیتے کہ آں بیخبراں ازیں علم مے آرند آں جمع غیر سلامت وُجوہ نحو آں میکنند وبتعلّم وتلمّذ بپذیرند۔

ملے ملک ہندوستان میں جسکے طاؤس کے پر بہشت کا جلوہ دکھلا رہے ہیں۔ ایک جانور ہی جسکو شارک کہتے ہیں (مینا) اور خراسان میں اس کا نام سارو ہی۔ یہ امر تمام دُنیا میں مشہور ہی کہ ماہر لوگ اسکو ایسی اچھی طرح بولنا سکھاتے ہیں کہ بلبل اس کے سامنے بولنا بھُول جاتی ہے۔

ہندوستان میں ایک گروہ ہی جسکی نسبت یہ مشہور ہی کہ وہ پرندوں کی بولی سمجھتا ہے۔ چنانچہ اُس نے کوّے کی آواز پر کتابیں لکھ ڈالی ہیں۔ جن سے وہ غیب کا حال بیان کرنے کا دعویٰ رکھتا ہے۔ چڑیا کی آواز سے شگون لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اکثر ٹھیک اور صحیح ہوتا ہے اور بعض بے عقل کہ جو اپنے مرتبہ سے ناواقف ہیں، انکو جانوروں کی بولی سمجھنے والا سمجھکر رات دن انکی پرسش و پرستش میں مصروف ہیں حالانکہ جن جانوروں کی وہ بولی ہی اُسکو وہ (جانور) خود نہیں سمجھتے کہ ہم کیا کہتے ہیں۔ اور جو کچھ وہ نافہم بک دیتے ہیں یہ بیعقل اس کی تاویل گڑھتے ہیں اور انکی شاگردی اختیار کرتے ہیں*

آگے یہ کہکر کہ انسان کیسا سادہ لوح ہے کہ باوجود نطق اصلی کے نقلی گویائی پر فریفتہ ہوجاتا ہے - فرماتے ہیں۔ **قطعہ**

گر بود بہتر ز گفتِ آدمی گفتِ دگر — کے خدائے پاک مردم را خطابِ قل کند
لیک نشناسد چو مردم قیمتِ گفتارِ خویش — فالِ میموں گیرد از پرندہ و غلغل کند
ناسپاسی میکند شاعر کہ با گفتِ چناں — ہر زماں وصفِ بیانِ قمری و بلبل کند
آرے آرے شاہ با چنداں خورش سر کہ خورد — خوب رویاآں چناں رخسار میل گل کند
نعمتِ کلیست نطق و گر بداند قدرِ آں — جزو جزو بندہ شکر نعمت آں کل کند

فضیلتِ نطق ثابت کرکے اس کی دو قسمیں کی ہیں نظم و نثر۔ نثر پر نظم کی ترجیح کے جو دلائل لکھے ہیں اُن میں ایک یہ بھی ہے کہ موسیقی سا فن لطیف نظم کا محتاج ہے۔ نظم نہ ہو تو ریشم کے ساز کے نغمے بھی بے لطف ہیں۔ کلیات میں یہ مضمون کیسے پاکیزہ پیرائے میں ادا کرتے ہیں **قطعہ**

مطربے میگفت خسرو را کہ ای گنجِ سخن — علم موسیقی زجنسِ نظم نیکوتر بود
زانکہ ایں علمیست کز دقت نیاید در قلم — واں نہ دشوارست کاندر کاغذ و دفتر بود
پاسخش گفتم کہ من در ہر دو معنی کاملم — ہر دو را سنجیدہ بر وزنیکہ آں بہتر بود
فرق سن گویم میان ہر دو معقول و درست — تا دہد انصاف کاں از ہر دو دانشور بود
نظم را علمے تصور کن بنفسِ خود تمام — کو نہ محتاجِ سماع و صوت خنیاگر بود
گر کسے بے زیر و بم نظمم فرو خواند رواست — نے بمعنی ہیچ نقصاں نے بلفظ اندر بود
در کند مطرب بسے ہاں ہاں و ہوں ہوں در سرود — چوں سخن نبود ہمہ معنی او ابتر بود
نائے زن را بیں کہ صوتے دارد و گفتار نے — لاجرم در قول محتاجِ کسے دیگر بود
پس درین صورت ضرورت صاحبِ صوت و سماع — از برائے شعر محتاجِ سخن پرور بود
نظم را حاصل عروسی داں و نغمہ زیورش — نیست عیبے گر عروسِ خوب بے زیور بود

سلسلہ بالا میں متقدمین شعرا میں مولانا صفی الدین نیشاپوری اور مولانا ظہیر الدین فاریابی کے علم و فضل

کی مدح کرتے ہیں اور متاخرین میں مولینا شہاب الدین مہمرہ اور مولینا بہار الدین بخاری کی - اس بحث کو ختم کر کے نظم فارسی و عربی کا موازنہ کیا ہے - یہ تسلیم ہے کہ عربی اپنی خوبیوں میں پارسی پر فائق ہے لیکن نظم پارسی نظم عربی سے بہتر ہے - اور اس کی تین دلیلیں ہیں - اوّل شعر کی جان وزن ہے - اور اشعارِ فارسی کا وزن عربی نظم کے وزن سے زیادہ لطیف اور کامل ہے - کیونکہ جو زحف عربی شعروں کے وزن میں جائز ہے وُہ اگر فارسی شعر میں لے آئیں تو ناموزون ہو جائے - فارسی نظم ایک حرف بلکہ ایک حرکت کے تغیر سے غیر موزون ہو جاتی ہے - عربی نظم میں حرف بلکہ لفظ کا تغیر بھی کھپ جاتا ہے - جو خوبی وزنِ فارسی میں ہے عربی کیا عبری وغیرہ میں بھی نہیں - واقف کار جانتے ہیں - دُوسری دلیل - عربی زبان اپنی وسعت کے لحاظ سے بے پایاں ہے - ایک معنی کے لئے ہزار لفظ اور ایک لفظ کے لئے دس معنی - جس کے قبضے میں یہ خزانہ ہو وُہ کسی موقع پر تنگدست نہیں ہو سکتا - فارسی میں برعکس ہے - یہاں ایک لفظ کے ایک سے زاید معنے بہت کم ہیں - انصاف سے دیکھئے پارسیوں کو کس قدر دشواری نظم میں مطلب ادا کرنے میں ہے اور عربی دانوں کو کس قدر آسانی - تیسری دلیل - ہم عرب عَربا (خالص عرب) کے کلام سے بحث کرتے ہیں - وہاں قافیہ ہی قافیہ ہے - اگرچہ اہل فارس نے عربی نظم میں ردیف کو داخل کیا ہے لیکن اُنکا کلام ٹکسالی نہیں - فارسی میں قافیے کے ساتھ ردیف بھی ہے اور ردیف نظم کے لئے سرمایۂ آرائش و زیبائش ہو خلاصہ یہ کہ عربی شعر عرب میں کیا باعتبارِ وزن اور کیا بلحاظِ وسعتِ زبان و ترکِ ردیف ہر طرح آسانی ہے باایںہمہ خُوبی معنی کے لحاظ سے فارسی شاعری عربی شاعری سے بالاتر ہے - اس موقع پر یہ اعتراض نہیں کرنا چاہئے کہ شعرِ عربی کا مرتبہ اس لئے بلند ہے کہ اُس سے کلامِ ربّانی کی تائید ہوتی ہے اور نہ یہ کہ خود کلامِ ربّانی اس زبان میں نازل ہوا ہے - کیونکہ مَیں یہ خود تسلیم کرتا ہُوں کہ فارسی کلام اس مقام میں مقابلہ عربی محض پوچ اور ہیچ ہے - ؎

درآں مقام کہ از شرعِ مصطفےٰ گوئید   نعوذ باللہ کہ از شاعری سخن رانم

لیکن یہ موقع شرعی بحث کا نہیں۔ ارباب معنی کو مضامینِ خاقانی کی بلندی۔ کلامِ انوری کی روانی۔ سعدی کا حسن۔ نظامی و ظہیر کی نظم کا حسن پیشِ نظر رکھ کر انصاف فرمانا چاہیئے۔ مقام دعویٰ سے مقام انصاف میں آئیں تو کہہ سکتے ہیں کہ ہم لُطف زبان عربی کے قائل ہیں وُہ لُطف نظم فارسی کے وزن کو مانیں۔ ایک لطیفہ کا مقابلہ دُوسرے سے ہو گیا۔ ہمارے یہاں خیالات بدیع ہیں۔ اُن کے یہاں تخیلات رفیع یہ دونوں بھی برابر رہے۔ ہمارے ردیف کے مقابلے میں وُہ کوئی خُوبی پیش نہیں کر سکتے۔ لہٰذا پارسی شعر کو فوقیت رہی۔ سلسلہ کلام دراز ہو چکا۔ دیباچے میں اس سے زیادہ گنجایش نہیں لیکن ایک مضمُون جو دِل میں چُبھ رہا ہے بے اختیار زبانِ قلم پر آتا ہے۔ یہ بات ثابت ہے کہ پارسیوں کو شاعرانہ طبیعت کے لحاظ سے عربوں پر ترجیح ہے۔ اگر عرب کا شاعر کامل و فصیح ملک فارس میں جائے۔ تو ممکن نہیں کہ وُہ زبان پارسی میں بات چیت بھی صحیح اور درست طور پر کر سکے۔ معانی اہل فارس کا استنباط کرنا یا پارسی نظم و انشا پر قادر ہونا تو دُوسری بات ہے۔ اس کے برخلاف پارسی کا شاعر اپنے مُلک میں عربی ادب و فضل حاصل کر کے شعر عربی کہہ سکتا ہے بلکہ عربی الفاظ کو معانی پارسی سے ربط دیکر ایسا عمُدہ مجموعہ تیار کر سکتا ہے کہ جو منصف مزاج دونوں مزوں سے واقف ہوگا وُہ بے اختیار احسنت کہہ اُٹھیگا۔ اور اگر شاعر مذکور مُلکِ عرب میں جا پہنچے تو وہاں کے فصحار کو اُس کے علم و فضل کا اعتراف کرنا پڑیگا۔ زمخشری[۵۱] خوارزم کا باشندہ تھا عرب میں علامہ مشہور ہُوا۔ سیبویہ[۵۲] جو مجمل چھوڑ گیا تھا اُس نے مفصل کر دیا۔ ہندوستان کے باشندے طباعی میں تمام عالم سے بڑھے ہُوئے ہیں۔ اس دعوے کی دلیل یہ ہے کہ عرب۔ خراسانی۔ ترک۔ ہندو وغیرہ جو ہندوستان کے اسلامی شہروں میں (مثلاً دہلی۔ ملتان۔ لکھنوتی)، نہ اُن شہروں میں جو ہندوؤں کے مرکز ہیں (مثل گجرات۔ مالوہ۔ دیوگیر) آئے اور تمام عُمر یہاں کی زبان سیکھی ناممکن ہے کہ اُسکو صحیح اور درست بول سکے۔ اپنے ہی مُلک کے انداز پر گفتگو کریگا۔ عرب عربی پر قادر ہوتے ہیں جب یہاں کی بولی بولتے ہیں بھرم کھُلجاتا ہے۔ ہند و خواہ

سلہ ۵۱ علامہ زمخشری مُصنفِ تفسیرِ کشاف و مفصّل وغیرہ۔ سلہ ۵۲ نحو کا امام مشہور۔ جو اس فن کے مُوجدوں میں ہے۔

شہر کے باشندے ہوں خواہ گانو کے دہلی میں آکر رہتے اور زبانِ پارسی سیکھتے ہیں۔ لیکن ماہر ہرگز نہیں ہوتے۔ خراسانی۔ عراقی۔ شیرازی اور ترک کی جودتِ طبع زبان ہندی کے آگے سر جھکا دیتی ہے۔ اور وُہ بیچارے ہر چند کوشش کرتے ہیں۔ لیکن جب بولتے ہیں مُنہہ کی کھاتے ہیں۔ جو اہل قلم ہندوستان کے اسلامی شہروں خصُوصاً دہلی میں نشو و نما پاتے ہیں۔ وُہ ہر مُلک کی زبان بولنے اور اُس میں نظم و نثر لکھنے پر قادر ہوتے ہیں۔ جس دیس میں پہنچ جائیں اُسی کی روش پر چل سکتے ہیں۔ یہ بات تجربے سے ثابت ہو چکی ہے کہ ہم میں بہت سے ایسے ہیں جنہوں نے ملکِ عرب دیکھا بھی نہیں تاہم زبانِ عرب کو اس فصاحت کے ساتھ حاصل کیا کہ بُلغائے عرب اُن کے مرتبے کو نہ پہنچ سکے۔ اور بہت سے تاژیک (مقابل تُرک جیسے عجمی مقابل عربی) میں[ا] نے دیکھے ہیں کہ اُنہوں نے زبانِ تُرکی ہندوستان میں سیکھ کر وُہ گویائی حاصل کی کہ اس گروہ کے فصحا اُن کی زبان سُنکر دنگ رہ گئے۔ زبانِ پارسی کی یہ کیفیت ہے کہ ہر چند وُہ پارس سے یہاں آئی ہے لیکن سوائے ماوراءالنہر کے (جہاں کی پارسی ہندوستان کی پارسی کے مطابق ہے) کسی مُلک کی فارسی کے الفاظ درست نہیں۔ خراسانی "چہ" کو "چی" اور بعضے "کجا" کو "کجو" کہتے ہیں۔ کتاب میں دیکھو "چہ" اور "کجا" لکھا جاتا ہے اور الفاظ صحیح وُہی ہیں جو کتابی ہوں۔ اُن کے یہاں بہت سے ایسے الفاظ ہیں جو اس کسوٹی پر کھوٹے ثابت ہوتے ہیں۔ اِسکے برعکس ہندوستان کی فارسی دریائے سندھ کے کنارے سے سمندر کے کنارے تک یکساں اور دری (خالص اور ٹکسالی) فارسی[۲] ہے۔ ہندوستان کی زبان[۳] کا یہ حال ہے کہ ہر سو کوس پر اور بولی ہے۔ پارسی اِس

[ا] امیر خسرو کی مادری زبان تُرکی تھی +

[۲] آگے چلکر تم دیکھوگے کہ ملتان سے لیکر بنگالے کے انتہا تک امیر خسرو مختلف مقامات میں رہے تھے لہٰذا اُنہوں نے جو کچھ لکھا ہے سُنکر لکھا ہے سُنی سُنائی بات نہیں لکھدی۔ ہندوستان پر مسلمانوں کے حملے اگرچہ عہدِ سُلطان محمُود سے (چوتھی صدی ہجری کے آخر میں) شروع ہوگئے تھے لیکن مستقل سلطنت قطب الدین ایبک نے آغاز صدی ہفتم میں قائم کی۔ امیر خسرو نے جس زمانے میں دیباچہ لکھا ہے وُہ ساتویں صدی کا آخری زمانہ تھا۔ مسلمانوں کی سلطنت کا غایتِ اقتدار تھا کہ سو برس سے کم عرصے میں ٹکسالی فارسی پنجاب سے انتہائے بنگالہ تک مادری زبان بن گئی

[۳] معلوم ہوتا ہے کہ آج سے چھ سو برس پیشتر بھی ہندوستان میں کوئی عام زبان نہ تھی اگر تھی تو فارسی تھی +

چار ہزار کئی میل میں ایک ہی ہے۔ اور پھر اس خوبی کے ساتھ کہ گفتگو کتابی زبان کے مطابق ہے ...
(اس مقام پر دیباچہ کی عبارت مشکل ہے) کی طرح نہیں ہے جو "کردہ" کو "کردہ کُن" اور "کردہ ہین" بولتے ہیں۔ نہ سیستانیوں کے مثل جو ہر لفظ کے آخر میں "ہیں" ضرور بڑھاتے ہیں جیسے "گفتہ ہیں"۔ اور "رفتہ ہیں"۔ ولائت کے آنے والے عُلماء و فصحا (عوام اور اوباش کا ذکر نہیں) دہلی کے فارسی کی مدح کرتے ہیں اور اہلِ دہلی اُنکی زبان پر ہنستے ہیں۔ یہاں کی زبان پر وہ گرفت نہیں کر سکتے اس لئے کہ یہاں کی زبان "نرم و شُستہ و لطیف و نظیف و درست (موزون) و فصیحانہ" ہے۔ لُطف یہ ہے کہ ہم سب کی بولی بولتے ہیں ہماری (ہاں) بولی کوئی نہیں بول سکتا۔ جو ہماری زبان پر کلام کرے۔ اُس پر میرا یہی دیباچہ حجت ہے

گوبیاؤ بہ بین ودم درکش ۔۔۔ گردگر گوں بود قلم درکش

اہلِ دہلی کی زبان کی خوبی جس کو تسلیم نہ ہو اُس کو میرے سامنے لے آؤ تاکہ اُس کا دعویٰ سرِ تسلیم خم کردے۔

اس سلسلے کے بعد لکھا ہے کہ شعر و سخن پر اس بُنیاد پر اعتراض کرنا کہ اُس میں ہجو و ذم وغیرہ مذموم مضامین ہوتے ہیں بجا نہیں۔ اِس لئے کہ قابلِ مذمت یہ مضامین ہیں نہ نظم۔ کمال کی مدح سرائی میں سیف الدولہ اور متنبّی کا یہ لطیف لطیفہ درج کر گئے ہیں۔ مشہور ہے کہ سیف الدولہ متنبّی کے سامنے شعرا کی فلاکت اور بے سروسامانی پر طعن کر بیٹھتا تھا۔ اور مال کی بحیثیت مربّی کمال ہونے کے تعریف کیا کرتا تھا۔ ایک روز سیف الدّولہ حمام میں تھا متنبّی کو بھی بُلا بھیجا۔ دونو لنگی باندھے ہوئے تھے۔ خلوت تھی اور امیر کی طبیعت شگفتہ۔ زندہ دِل شاعر کو فی البدیہ ایک مضمون سُوجھا۔ عرض کی کہ جہاں پناہ اسوقت آپ کی اور بندے کی یہ حالت ہے کہ سوائے ایک لُنگی کے کچھ پاس نہیں۔ متنبّی تو اب بھی متنبّی ہے۔ مگر حضور ذرا غور فرمائیں کہ کتنے پانی میں ہیں سیف الدولہ متنبّی کی سیف زبانی سے کٹ گیا اور بَل کھا کر کہنے لگا "اَنَسِیتَ قِربَتَكَ" یعنی کیا تو اپنی مشک بُھول گیا (متنبّی کی نسبت مشہور ہے کہ سقّا تھا) متنبّی نے برجستہ کہا "اَنسَانِی قُربُتكَ" یعنی آپکے تقرّب نے بھلا دی۔ جواب کی آبداری غُصّے کی جلتی آگ پر پانی کا کام کر گئی۔ شُعراء کی تین قسمیں

قائم کی ہیں۔ اوّل صاحب طرز خاص وجدید۔ جیسے حکیم سنائی۔ انوری۔ ظہیر و نظامی۔ چونکہ خاقانی مجیر (بیلقانی) کا اور کمال اصفہانی رضی الدین نیشاپوری کا اور مُعزی مسعود سعد سلمان کا تتبع کرتے ہیں اس لئے اس قسم سے خارج ہیں۔ دوم جو متقدمین یا معاصرین میں سے کسی کی طرز کے پیرو ہوں۔ سوم جو پرائے مال کو تاکیں۔ اوّل اُستاد ہیں دُوسرے شاگرد تیسرے غارتگر۔ جس باکمال میں چار شرطیں جمع ہوں وُہ اُستاد مانا جائیگا۔ پہلی شرط یہ ہے کہ اس کی طرز اَوروں سے ممتاز ہو۔ دُوسری یہ کہ اُس کے کلام کی عذوبت وسلاست شعرا کی طرز پر ہو نہ واعظوں اور صوفیوں کے انداز پر۔ تیسری یہ کہ کلام خطا سے پاک ہو۔ اور چوتھی یہ کہ اِدھر اُدھر کے پیوندوں سے اپنا مرقع آراستہ نہ کرے یعنی اَوروں کے مضامین نہ اُڑائے۔ شاگرد تین طرح کے ہوتے ہیں۔ شاگردِ اشارت۔ شاگردِ عبارت اور شاگرد غارت۔ شاگردِ اشارت کی یہ صُورت ہے کہ مُبتدی کا شعر وزن میں گر جائے یا مضمون خبط ہو جائے۔ تو اُستاد دانا اشارہ کر دے کہ اسکو یُوں درست کرو اور یُوں باندھو[ملہ]۔ یونہی اشاروں اشاروں میں مُبتدی فن کی باریکیاں سمجھنے لگتا ہے۔ شاگردِ عبارت وُہ مُبتدی ہے کہ اُستادوں کی پیروی کرے اور اُن کے کلام میں جو لفظ اور معنی دیکھے اُنکو اپنے کلام کا نمونہ قرار دے۔ شاگرد غارت وُہ حریف ہیں جو خود کچھ کرنے کی ہمت نہیں رکھتے مگر مُصنّف بننے پر مرتے ہیں۔ یہ لوگ اُستادوں کے خزانے سے مال نکال کر اپنے ویرانے میں رکھتے اور دُوسروں کے قطرہائے خُون کو اپنا جگر گوشہ بتاتے ہیں۔ خدا ایسے بے شرموں کے شر سے بچائے۔ یہ نہ سمجھنا کہ اُستادی اور شاگردی کی بحث میں نے اس لئے اُٹھائی ہے کہ مجھ کو اُستادی کا دعوٰی ہے۔ حاشا۔ مَیں نے جو شرطیں اُستادی کی قرار دی ہیں اُن میں سے بعض مجھ میں موجُود نہیں وجہ یہ کہ میرے کلام کے بہت سے شعبے ہیں اور وُہ اربعہ عناصر سے مرکب ہیں۔ وعظ اور حکمت پر جو کچھ مَیں نے لکھا ہے اُس میں سنائی وخاقانی کی پیروی کی ہے۔ اور یہ انداز بوجہ بلندی آگ سے مشابہ ہے۔ جو عالمِ بالا کی طرف میل رکھتی ہے۔ تخلّص (قصیدہ) اور خلاصہ خیال میں طرز رضی و کمال اختیار کی ہے جو روانی اور صفائی میں پانی سے ملتی جُلتی ہے۔ غزل اور مثنوی میں سعدی و نظامی کے

ملہ؛ معلوم ہوا کہ اصلاح کی اسی ہی حد ہے ۱۲

قدم بہ قدم ہوں۔ اِس روش کو بلحاظِ لطافت و شادابی ہوا سے مناسبت ہے۔ میرے کلام کا حصّہ مقطّعات۔ رباعیات معمّا و لُغز خود میرے وجُود خاکی کا غبار ہے۔ جو اس لحاظ سے نمک ہے کہ اُس میں بہت سے جواہرات چھپے ہُوئے ہیں۔ میری نثر بھی میری ہی طبیعت کا جوہر ہے اور نثر کے معاملے میں کسی کا ممنُونِ احسان نہیں ہوں۔ خلاصۂ کلام یہ ہے کہ اُستادی کی چار شرطوں میں سے پہلی شرط یعنی صاحبِ طرزِ خاص ہونا مجھ میں موجُود نہیں۔ مَیں عرض کر چکا ہوں کہ مَیں نے بہت سے اساتذہ کا تتبع کیا ہے۔ دُوسری شرط کہ کلام خطا اور قصُور سے پاک ہو اور اسکا بھی مجھ کو دعویٰ نہیں۔ بندے کی نظم اگرچہ رواں ہے لیکن غزل اور لغز (چیستاں) میں جا بجا لغزشیں بھی ہیں (”نظمِ بندہ اگرچہ بیشتر روانست امّا جا بجا در غزل و لغز لغزیدنی ہم ہست“) دونوں مذکورۂ بالا شرطوں کی نسبت مجھ کو اقرار ہے کہ پایۂ اُستادی تک میری رسائی نہیں۔ رہی تیسری شرط یعنی کلام شاعرانہ ہو نہ واعظانہ و صوفیانہ۔ مجھ کو دعویٰ ہے کہ میرا کلام شاعرانہ ہے صوفیانہ اور واعظانہ نہیں ہے۔ چوتھی شرط کہ مرقع دوزی نہ ہو یہ بھی مجھ میں موجُود ہے مَیں نے آج تک دُوسروں کے متاع نہیں تاکے۔ قصّہ مختصر مَیں مالکِ طرزِ خاص نہیں۔ خطا سے میرا کلام پاک نہیں۔ میرا کلام اسلوبِ شُعرا کے مطابق ہے سرقہ مَیں نے نہیں کیا۔ بس اُستادی کی دو شرطیں مجھ میں ہیں دو نہیں ہیں۔ مَیں نے اپنا محاکمہ خود کر دیا کہ سندِ اُستادی نصف میرے قبضہ میں ہے نصف نہیں ہے

ع ناتمام ناتمام ناتمام ٭

(باقی آئندہ)

ہندوستان

(۱)

اگر تم کسی طرح ہوا میں اتنے اونچے پہنچ جاؤ جتنا اونچا عقاب اڑتا ہے اور پھر وہاں سے ملک ہندوستان پر نظر ڈالو تو تمہیں ایک بڑا لمبا چوڑا زمین کا قطعہ بحر ہند کی طرف پھیلتا ہوا دکھائی دیگا۔ شکل میں یہ بہت کچھ مثلث سے ملتا ہے۔ مثلث کہتے ہیں تکونی شکل کو۔ اس کے پورب کے کونے سے ایک اور ٹکڑہ خشکی کا دکن کی طرف کچھ دور سمندر میں نکلا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ یہ صوبہ برہما ہے۔ اسی طرح پچھم کی طرف بھی خشکی کا کچھ حصہ آگے کو نکل گیا ہے۔ یہ صوبہ سندھ ہے۔ اگر ادھر سے سندھ اور ادھر سے صوبہ برہما ہندوستان کی سرزمین سے تراش دیئے جائیں تو پھر یہ ہو بہو مثلث معلوم ہوگا جسکی چوٹی راس کماری سمجھو۔ مثلث کی چوٹی اوپر اتر کی طرف ہوا کرتی ہے۔ لیکن تم یہ سمجھ لو کہ یہ الٹا مثلث ہے۔ جسکی چوٹی نیچے دکن کی طرف ہے۔ اگر اس مثلث کی اتر کی طرف دیکھو تو تمہیں اس سرے سے اس سرے تک ایک بڑا بھاری سلسلہ پہاڑوں کا دکھلائی دیگا۔ یہ ۶۰۰ میل لانبا ہے اور ہمالیہ پہاڑ کہلاتا ہے۔ یہ ساری دنیا کے پہاڑوں سے بڑا ہے۔ آبادی کے اعتبار سے اس کے کتنے ہی حصے ہیں۔ ان میں مشہور یہ ہیں۔ پورب کی طرف نیپال۔ سکم۔ بھوٹان یہ تینوں خودسر ریاستیں ہیں۔ اور پچھم کی طرف کماؤن۔ گڑھوال۔ المورڑہ۔ نینی تال۔ شملہ۔ ڈلہوزی۔ چمبہ۔ کاشمیر۔ ہمالیہ کی بعض چوٹیاں اتنی اونچی ہیں کہ بادلوں کے تختے سے بھی اونچی نکل گئی ہیں۔ اور ان پر بارہ مہینے برف جمی رہتی ہے۔ جیسے کنچن جنگا۔ دھولگڑہ۔ ایورسٹ۔ یہ زمین سے کوئی ۲۹۰۰۰ فیٹ یا کچھ کم دس ہزار گز اونچی ہے۔ اور سدا بادلوں میں چھپی رہتی ہے۔ اس پہاڑی سلسلہ کے ہونے سے تمہیں یہ فائدہ ہے کہ اگر کوئی غنیم اتر کی طرف سے تمہارے ملک پر حملہ کرنا چاہے تو ہمالیہ کی یہ لوہا لاٹ دیوار اسے ایک قدم بھی نہیں بڑھنے دیگی۔ ہمالیہ پربت کے بیچوں بیچ۔ دھولگڑہ کی چوٹی ہے جو ۲۸۰۸۰ فیٹ یا کچھ کم ۹۴۰۰ گز اونچی ہے۔ اگر تم دھولگڑہ سے دکن کی طرف سیدھے نظر دوڑاؤ تو راس کماری

تک پہنچنے میں کوئی دو ہزار میل کا راستہ طے کرنا پڑیگا۔ لیکن اِس راستے میں افریقہ کے سے نرے گرم۔ خشک۔ اُجاڑ ریگستان ہی نہ ملینگے۔ کہ انہیں دیکھ کر وحشت ہو۔ نہ کہیں مُلک رُوس کے سے صرف بنجر اور چٹیل میدان سُوجھینگے۔ بلکہ دھولگڑھ کی ہیبت ناک اُونچائی سے اُترتے ہی ایسا معلوم ہوگا کہ گویا تم ایک پھلے پھُولے باغ میں داخل ہو رہے ہو۔ پہاڑ کے دامن سے تھوڑی دُور چلکر وُہ سرزمین آتی ہے جس میں سے گنگا ہو کر گذرتی ہے اور پورب دکن کے رُخ بہتی ہُوئی خلیج بنگالہ میں جا گرتی ہے۔ گنگا کے پانی کی بدولت یہ علاقہ بڑا سر سبز اور پیداوار کا ہے۔ یہاں طرح طرح کے پھل پھُول اور غلّے پیدا ہوتے ہیں۔ یہ وُہی سرزمین ہے جہاں ہزاروں برس ہُوئے کہ آریہ قوم اُتر پچھم کے کھونٹ سے ہندوستان میں داخل ہو کر دریا کے کنارے آباد ہُوئی تھی۔ وُہ اس علاقے کو آریہ ورت کہتے تھے۔ اور جغرافیہ میں اس کو وادی گنگا کہتے ہیں۔ گنگا کے علاوہ ایک اَور بڑا دریا پورب کی طرف ہمالیہ پہاڑوں سے بہتا ہُوا خلیج بنگالہ میں گرتا ہے۔ یہ برہمپتر ہے۔

برہمپتر کی وادی بھی اتنی ہی سر سبز ہے۔ اسی طرح پچھم کی طرف ایک اَور بڑا دریا ہے جو اُتر پچھم کے کونے سے بھکر اور پنجاب کے پانچوں دریاؤں کو ساتھ لیکر مُلک سندھ میں داخل ہوتا ہے اور پھر یہاں سمندر میں جا گرتا ہے۔ یہ دریائے سندھ ہے۔

برہمپتر۔ گنگا۔ سندھ ان تین دریاؤں کے سبب ہندوستان کا اُتر کا حصہ ایک گل گلزار بنگیا ہے۔ جس میں طرح طرح کی قدرتی نعمتیں موجود ہیں۔ الغرض دھولگڑھ کی چوٹی سے اُتر کر اور پہاڑ کے دامن کو طے کرکے تمہاری نظر اس وادی گنگا کی سیر کرے گی۔ پھر بندھیاچل پہاڑوں کا سلسلہ ملیگا۔ یہ سلسلہ ہندوستان کی پُر فضا زمین کے بیچ میں اس طرح واقع ہے جس طرح کوئی آدمی نفیس لباس پہنکر کمر میں ایک خوبصورت پٹکہ باندھے۔ بندھیاچل کی اونچی نیچی چوٹیوں اور بڑی بڑی گھاٹیوں سے گذر کر تھوڑا ہی آگے بڑھنا پاتے ہیں کہ ایک دُوسرا پہاڑی زنجیرہ پیش آتا ہے۔ یہ ست پڑا ہے۔ اور سر سبزی و شادابی میں بندھیاچل پہاڑ سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ دونوں کے بیچ کا علاقہ دریائے نربدا کی وجہ سے نہایت ہی ہرا بھرا ہے۔ یہ پُورب سے پچھم کو بہتا ہُوا خلیج کھمبایت میں جا گرتا ہے۔ جہاں ست پڑا پہاڑ کا

دامن ختم ہوتا ہے وہیں سے ملکِ دکن شروع ہو جاتا ہے۔ اسکو جزیرہ نمائے ہند بھی کہتے ہیں۔ اس علاقے میں بھی دو مشہور دریا ہیں یعنی گوداوری اور کرشنا جو پچھم سے پورب کی طرف سرزمین دکن کو مالا مال کرتے ہوئے کارومنڈل گھاٹ پر سمندر میں جا گرتے ہیں۔ عقاب کی اونچائی سے تم شہر اور قصبے نہیں دیکھ سکتے۔ کیونکہ یہ چھوٹی چیزیں ہیں ملک کی بڑی اور ابھری ہوئی چیزیں پہاڑ اور گھاٹیاں اور دریا اور میدان ہی ہیں۔ یہ ایسے ہیں جیسے کسی آدمی کے چہرے پر آنکھ۔ ناک۔ کان خاص دکن سے راس کماری تک کوئی ابھری ہوئی چیز نہیں سوجھتی۔ البتہ مالابار گھاٹ کے برابر اتر دکن میں ایک لمبا سلسلہ پہاڑوں کا چلا گیا ہے جو کچھ کچھ ایسا ہے جیسے سمندر کی زبردست موجوں کے تھپیڑ سہنے کے لئے پتھروں کی ٹکر یا سدِ آب بنا لیتے ہیں۔ یہ نیلگری پربت ہے۔ اسی طرح کارومنڈل گھاٹ پر بھی دور دور تک ریت کے بیابان اور اوپر چلکر خلیج بنگالہ کے قریب دلدل پھیلی ہوئی سوجھتی ہے۔ اگر مالابار اور کارومنڈل کو دکن کی دامن سمجھیں تو ادھر نیلگری پربت کا زنجیرہ ادھر ریت اور دلدل کا سلسلہ ان دامنوں کی سنجاف ہیں۔ اتر کی طرف اگر ہمالیہ پربت تمہیں غنیم کے حملے سے بچائیگا تو دکن کی طرف نیلگری پربت کی سنگین دیوار اور ریگستان دشمن سے محفوظ رکھینگے۔ اس طرح ہندوستان ان قدرتی فصیلوں کی وجہ سے گویا ایک قلعہ بند شہر ہے۔ وہ کونسی قدرتی خوبی ہے جو ہمارے ہندوستان میں نہیں ہے۔ پہاڑ اتنے اونچے اونچے اور لمبے کہ یورپ کا الپس پہاڑ بھی ان کے سامنے چھوٹا معلوم ہوتا ہے۔ بعض چوٹیاں اتنی اونچی معلوم ہوتی ہیں کہ انسانی قدموں نے آج تک انکو چھوا نہیں اور نہ کبھی چھو ئینگے۔ میدان ایسے سرسبز۔ ہموار اور ایسے لمبے چوڑے کہ اگر انکو زمرد کے بحیرے سے تشبیہ دیجائے تو بجا ہو۔ جہاں تک نگاہ کام کرتی ہے گویا سبز مخمل کا فرش پھیلتا چلا جاتا ہے اور آخر کو افق میں چھپ جاتا ہے۔ مالابار جیسے وسیع گھاٹ جس پر پہاڑوں کا زنجیرہ کھنچا ہوا ہے سمندر کے نیلگوں پانی کی موجوں کو اوپر نہیں اٹھنے دیتا۔ کیونکہ سمندر کی طرف زمین ڈھلوان ہوتی گئی ہو۔ سال میں جتنا مینہہ یہاں برستا ہو اتنا دنیا کے کسی اور حصہ میں نہیں برستا۔ وہ وہ چٹیل اور بنجر میدان ہیں کہ افریقہ کے صحرا بھی انکے آگے گرد ہیں۔ جنگل ایسے گنجان اور وسیع کہ

اقیموں کا پتہ نہیں لگتا۔ جیسے کبلی بن مس میں لکھوکھا درخت اور بیلدار جھاڑیاں سینکڑوں پیچ و خم کھا کر زمین سے بلند ہوتے ہیں۔ یہاں کے دریا اگرچہ لمبائی چوڑائی اور شان میں مصر کے رود نیل اور امریکہ کی مس سپی کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ مگر ملک کو سرسبز کرنے اور عام فائدہ پہنچانے میں ان سے کسی طرح کم نہیں ہیں۔ جیسے برہم پتر اور دریائے گنگا اپنے معاونوں سمیت باغ ہندوستان کے پورب کی طرف کے حصے میں پانی دیتے ہوئے خلیج بنگالہ میں گرتے ہیں اور دریائے سندھ پنجاب کے پانچوں دریاؤں کو ساتھ لئے اس باغ کے پچھم کے حصے کو سینچتا ہوا سمندر میں گرتا ہے اسی طرح نربدا۔ تاپتی اور مہاندی وسط باغ کی آبیاری کرتے ہیں اور گوداوری اور کرشنا دکن کے حصے کو سیراب کرتے ہیں۔ خیال کرو کہ یہ دریا سالانہ کتنے کروڑ من ریت اور مٹی سرزمین ہند سے بہا کر سمندر میں لیجاتے ہونگے۔ ٹھیک ٹھیک اندازہ کرنا تو ناممکن ہے۔ لیکن علم طبقات کے عالموں نے تخمینہ لگایا ہے کہ اگر ایک ہزار جہازوں کا بیڑا بنایا جائے اور ہر جہاز اتنا بڑا ہو کہ ۲ ہزار ٹن (۲۸ من = ٹن) بوجھ اٹھا سکے تو جتنا ریت مٹی یہ تمام بیڑا لیجائیگا اتنا ہی ریت ایک سال میں ہندوستان کے دریا سمندر میں بہا کر لیجاتے ہیں۔ پیداوار کے اعتبار سے دیکھو تو بھی ہندوستان دنیا کے کسی ملک سے کم نہیں۔ ایک ایک کرکے تو گننا مشکل ہے لیکن خلاصے کے طور پر یہ بتلایا جاتا ہے کہ دنیا کے تمام حصوں میں سے صرف ان حصوں کی پیداوار جو قطب شمالی اور قطب جنوبی کے آس پاس ہیں یا سمندر کے ایسے گھاٹ پر ہیں جہاں آج تک انسان نہیں پہنچا ان پیداواروں کے سوا اور تمام روئے زمین کی پیداوار ہندوستان میں موجود ہے اور اگر نہیں ہے تو پیدا ہو سکتی ہے۔ کیونکہ یہاں کی زمین میں ہر طرح کی پیداوار کی صلاحیت ہے۔ ہر طرح کا غلہ۔ گیہوں سے لیکر جو اکثر اونچان میں پیدا ہوتا ہے اور چاول تک جو ہمیشہ دلدل میں پیدا ہوتا ہے۔ جیسے بنگالہ یا دکن کے آس پاس کی زمین جو نچان میں ہے۔ ہر قسم کے میوے۔ لگاکی سیب سے جو پہاڑی زمین میں پیدا ہوتا ہے اور انبہ اور امرود تک جو گرم سرزمین میں پیدا ہوتا ہے۔ ہر طرح کے پالو جانور (چوپائے) بیل اور گھوڑے سے لیکر اونٹ اور ہاتھی تک ہر قسم کے خونخوار جانور شیر

بھیڑیا۔ بھگرا۔ شکاری جانور جیسے چیتا۔ ہر طرح کی کھالیں اور ہر طرح کے سمور سنجاب۔ شیر اور ریچھ سے لیکر بکری تک قسم قسم کے مویشیوں کے چمڑے جو بڑے قیمتی اور کارآمد ہوتے ہیں۔ ہر طرح کی اون اور پشم پہاڑی بکروں سے لیکر لومڑی تک۔ ان میں بعض ایسی ہیں کہ اگر یورپ کی مشہور لیڈیوں میں لیجاؤ تو بڑی بڑی پرکھنے والی نہ بتلا سکیں کہ کیا ہے کیونکہ وہاں اب تک ان کو کوئی جانتا بھی نہیں۔ ہر طرح کی رسّی بٹنے کے درخت ریشہ دار۔ لگا کی سن۔ پتوارے۔ بانس۔ کیوڑہ اور ناریل تک اسی پتوار کی بنی ہوئی چیزوں کی بڑی شہرت ہے۔ ہر قسم کے تیل کے درخت ناریل سے لیکر جس کے تیل سے مومی بتیاں بنتی ہیں اور عطر گلاب تک جو سونے کے تول تُل کر بکتا ہے۔ ہر طرح کے رنگ روغن نیل سے لیکر لاکھ تک اور اس کے علاوہ سینکڑوں ہزاروں رنگ پیدا ہوتے ہیں۔ نیل خاصکر مشہور ہے۔ یہ ہندوستان کے اُتّر کے ملکوں میں پیدا ہوتا ہے اسکی تجارت زیادہ تر انگریزوں کے ہاتھ میں ہے وُہی یہاں سے دُوسرے ملکوں میں بھیجتے ہیں۔ چنانچہ ان ممالک میں نیل کی تجارت کرنے والے انگریزوں کا ایک بڑا گروہ بن گیا ہے۔ ہر قسم کی منشّیات اور مفرّحات۔ افیون سے لیکر آسام اور دنیا کی کافی چاء تک۔ ان میں افیون بڑے نفعے کی چیز ہے۔ کیونکہ چینی اس کے بہت شایق ہیں اور اس کے بدلے میں ہمیں چینی چاء دیتے ہیں جو بڑی اچھی اور مزے دار چاء ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ ہر طرح کے مصالحے۔ خوشبودار بخورات۔ ادویات۔ ہر قسم کے شہتیر اور کارآمد لکڑیاں ہمالیہ کی دیودار سے لیکر ساگون تک جو جہاز بنانے کے کام میں آتی ہیں۔ اور شیشم سال سے لیکر صندل تک۔ ہر قسم کے بانس جو طرح طرح کے کام میں آتے ہیں۔ ہر قسم کی دھاتیں۔ سونے سے لیکر اچھے سے اچھے لوہے تک۔ ہر طرح کے پتّھر۔ سنگ خارہ۔ سنگ ابرک۔ سنگ مرمر۔ اور اور قیمتی پتھروں سے لیکر لعل و یاقوت۔ رمان۔ ہیرا۔ زمرّد۔ پکھراج۔ نیلم اور یشب تک۔ اس کے علاوہ اور صدہا طرح کے نگ جن کے رنگ کو کسی چیز سے تشبیہ دیکر وُہی نام اُن کے رکھدئے ہیں۔ مثلاً گربہ چشم کیونکہ اس نگ کا رنگ کچھ کچھ بلی کی آنکھ سے مشابہ ہوتا ہے اور جب انگوٹھی میں جڑا جاتا ہے تو ہو بہو بلی کی آنکھ معلوم ہوتا ہے۔ آبادی کے لحاظ سے ہندوستان بڑا غدار ملک ہے قریباً ۲۸ کروڑ باشندے ہیں۔ گویا انگلستان خاص اور صُوبہ ویز کی معمولی آبادی سے دس گُنا زیادہ آباد ہے۔ اگر اس کی آبادی کے پانچ حصے

برابر کئے جائیں تو اُن میں سے صرف ایک حصہ آبادی کا ایسا ہے جو حضور ملک معظم ایڈورڈ ہفتم کی رعیت نہیں۔ باقی چار حصے زمین کے رعیت ہیں۔ ملک معظم کی حکومت میں اس قدر ملک ہیں کہ دُنیا میں جدھر سُورج گھومتا ہوا جاتا ہو اُدھر کچھ نہ کچھ حصہ زمین کا تاج برطانیہ کے ماتحت ضرور ہوتا ہے۔ ان میں اگر کوئی مُلک ایسا ہی جس پر دولت برطانیہ کو بڑا ناز ہے تو وُہ صرف ہمارا ہندوستان ہی ہی۔ اور مقامات ایسے ہیں کہ برطانیہ کے تاج میں گوہر ہیں اور ہندوستان ایسا ہے کہ گویا ان سب میں گوہرِ شب چراغ ہے۔ یوُرپ کے تمام بادشاہوں کو ہمیشہ سے یہ آرزو رہی کہ وُہ ہندوستان کو اپنا بنالیں۔ پندرھویں صدی کے اخیر میں شاہ ہسپانیہ کی طرف سے کلمبس نے ہندوستان کی تلاش میں بحرِ ظلمات کنگھالا۔ لیکن پتہ نہ ملا۔ پھر اور من چلے فرنگیوں نے سمندروں میں جہازرانی کی۔ کسی نے کہا ہم اتر پورب کے کھونٹ سے ہندوستان کا راستہ نکالینگے۔ کسی نے کہا ہم اُتر پچھم کی راہ نکالینگے۔ واسکو ڈی گاما نے برِّ اعظم افریقہ سے گھومکر پہلا راستہ پیدا کیا۔ ولندیزوں نے بھی قدم جمانے کے لئے اپنے سے بہت کی۔ فرانسیسیوں نے تو جنوبی ہندوستان کے بعض حصوں پر قبضہ بھی کر لیا۔ لیکن اخیر کو پالا انگریزوں کے ہاتھ رہا۔ اور ہندوستان دولت برطانیہ کی مضافات میں داخل ہوگیا۔ ہم نے اب تک ہندوستان کی موٹی موٹی باتیں بتلائی ہیں اور باہر سے جو چیزیں معلوم ہوسکتی ہیں صرف وہی دکھلائی ہیں۔ آؤ اب ہندوستان کی اندر سے سیر کریں۔ اُسکے خوشنما شہروں اور اسکی مشہور عمارات کو دیکھیں۔ ریلیں اس زمانے کی شاہراہیں ہیں اور وہ بڑے بڑے قصبوں۔ شہروں سے گذرتی ہیں۔ آؤ ان میں سے کسی بڑی ریل میں سوار ہو کر ہندوستان کا سفر کریں۔ کلکتہ اور بمبئی دو بڑے بڑے شہر ہیں۔ یہاں بندرگاہیں بھی ہیں اور یہاں سے تمام اطراف میں ریلیں جاتی ہیں۔ بہتر ہو کہ ہم اپنی سیاحت بمبئی سے شروع کریں۔ لیکن خشکی کی راہ سفر کرکے کناروں کے حالات معلوم نہیں ہوسکتے۔ کنارے یا ساحل یا گھاٹ پر مشہور آبنائے ہوتی ہیں۔ خلیجیں۔ کھاڑیاں۔ راسیں۔ جزیرے۔ بندرگاہیں ہوتے ہیں اور یہ بھی ملک کے جغرافیہ کے اُبھرے ہوئے خط و خال ہیں۔ انکا معلوم ہونا ضروری ہے۔ اسلئے بہتر ہے کہ اوّل ایک تری کا سفر بمبئی سے کلکتہ کو کریں اور کارومنڈل گھاٹ کے پاس پاس ہو کر چلیں کیونکہ بمبئی سے آگے مالابار گھاٹ اتنا آباد نہیں ہے اور نہ کراچی کے سوا اُس پر اور کوئی شہر قابلِ ذکر واقع ہے +

اِنسانی افعالِ اطاعت

یعنی

ڈالی - سلام - خوشامد پر ایک نظر اصُول ارتقاء کے لحاظ سے

جس خوش اسلوبی سے حکیم ہربرٹ سپنسر نے قانون ارتقاء کے عمل کو تمدنی زندگی کے مختلف پہلوؤں میں دکھایا ہے ناظرین کو اسکا اندازہ اس دلچسپ مضمون کے پڑھنے سے ہو جائیگا جو ہمارے مکرّم دوست لالہ دیوان چند بی - اے پلیڈر نے ہمیں عطا فرمایا ہے۔

اِنسان کے جملہ افعال دو قسم کے ہوتے ہیں - اوّل وُہ جنکا مقصُود اسکی اپنی ذات ہے - دوئم وُہ جنکا تعلق دیگر افراد سے ہے۔

مؤخر الذکر کی دو اقسام ہیں - افعالِ محبّت و افعال اطاعت -

جو افعال بوجہ اُلفت - شفقت - عنایت یا رحم وغیرہ کیئے جاتے ہیں (اور وُہ بے شمار ہیں مثلاً محبت - پیار - بوس و کنار - مصافحہ کرنا - بغلگیر ہونا - گلے لگانا - دُوسرے کو دیکھ کر خوشی میں اُچھلنا کودنا - نعرے مارنا - بغلیں بجانا - ہبہ - بخشش - تحفہ وغیرہ وغیرہ) یہ سب افعالِ محبت کی قسم میں داخل ہیں - ان سب افعال کا مدّعا یہ ہوتا ہے کہ فریقِ ثانی کی پسندیدگی کا اظہار ہو - اِن کو چھوڑ کر باقی تمام افعال افعالِ اطاعت میں داخل ہیں - اگر لفظ اطاعت کو وسیع معنوں میں لیا جاوے - ان افعال کا مدعا اظہار پسندیدگی کے بجائے حصُولِ خوشنودی یا رضامندی ہوتا ہے حیوانات میں بھی افعالِ اطاعت دیکھے جاتے ہیں - مثلاً ایک کُتا مالک کو خفا دیکھ کر دُم کو دباتا - دبک کر - سہم کر - آہستہ آہستہ لیٹتا لیٹتا اور اطاعت کی دیگر علامات دکھلاتا ہُوا - مالک کے پاؤں میں آجاتا ہے - اور اپنے آپ کو اس کے رحم پر چھوڑ دیتا ہے - علیٰ ہذا القیاس جب وُہ ایک مضبُوط و زبردست کُتے کو حملہ آور دیکھتا ہے - اور تابِ مقابلہ نہیں رکھتا اور یہ معلوم کرتا ہے کہ دانت نکال کر بچاؤ پر کھڑا رہنا بھی لاحاصل اور خلافِ مصلحت ہے - تو پیٹھ کے

بل گر کے۔ ٹانگیں اُوپر کر کے۔ مسکین شکل بنا کر آگے لیٹ جاتا ہے۔ اور قدرے دردانگیز طور پر غرغرانا شروع کرتا ہے۔ گویا تمام ہتھیار وغیرہ ترک کر کے پُورے طور پر اطاعت قبول کرتا ہے تاکہ جان بخشی ہو اور حملے کے نقصان سے بچے۔ اِسی قسم کے دیگر افعالِ اطاعت کُتّے اور نیز دیگر حیوانات میں بھی پائے جاتے ہیں۔ جن کا ذکر اگرچہ خالی از لُطف نہیں۔ مگر انسانی افعالِ اطاعت کے مضمون سے باہر ہیں۔

اِنسانی افعالِ اطاعت کی تین موٹی اقسام ہیں:۔ ڈالی - سلام - خوشامد -

ڈالی یعنی قسم اوّل میں وُہ افعال داخل ہیں جن کے ذریعے سے کوئی چیز اپنی ذات سے علیحدہ کیجاوے اور دُوسرے کو دیجاوے تاکہ لینے والا خوش ہو۔

افعال قسم دوم میں بھی اگرچہ اندرونی خیالِ اطاعت کا اظہار مقصود ہوتا ہے۔ لیکن اپنے سے کوئی چیز علیحدہ نہیں کی جاتی - صرف اعضاء بدنی کی حرکات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ یہ سلام ہے۔

قسم سوم خوشامد ہے۔ یہ صرف لفظی جمع خرچ ہے۔ نہ اپنے سے کوئی چیز علیحدہ کی جاتی ہے۔ نہ بطور بیرونی علامت کے بدن یا بدن کے کسی حصّے کو جُنبش یا حرکت دیجاتی ہے۔ صرف "زبان ہزار نعمت ہے" کے مسئلے پر عمل کر کے دُوسرے کی تعریف - بڑائی - صفت و ثنا کر کے اسکو خوش کیا جاتا ہے۔ یا دُوسرے کے مقابلے میں اپنا عجز ظاہر کر کے ٹیڑھے طریقے سے اس کی عظمت ظاہر کی جاتی ہے۔

ترقی تمدن کے مختلف مراحل میں یہ تین افعال مختلف ناموں۔ اور مختلف لباسوں میں نظر آتے ہیں۔ اور جو تبدیلیاں ان ابتدائی افعال کے نام یا صُورت میں ہوئیں وُہ ضرورتِ مُلکی کی وجہ سے یکے بعد دیگرے ایک قابلِ فہم قدرتی سلسلے میں واقع ہوئیں۔ اور اگر غور سے دیکھا جاوے تو مذہب میں بھی ڈالی سلام خوشامد کی رسم پائی جاتی ہے۔ اور بعض موجودہ رسُوم و عقاید کی بُنیاد میں یہ تین ابتدائی خیال ایک قدرتی سلسلے میں دیکھے جاتے ہیں۔ سوسائٹی کے متعلق ان تمام متفرق - کثیر التعداد اور ہم شکل مگر بظاہر مختلف افعال کا سلسلہ وار ذکر کرنا۔ اور یہ جتلانا کہ بعض رسومات یا عقاید مذہبی ان تین ابتدائی افعال سے کس طرح پیدا ہُوئے۔ مضمون ہذا کا مدعا ہے:۔

ڈالی

(۱)

آجکل اگرچہ مساوی حیثیت کے اشخاص میں ڈالی کا رواج پایا جاتا ہے۔ لیکن یہ حالت شروع کی نہیں۔ آخری حالت ہے۔ آغاز اِس کا اس طریق سے ہوتا ہے کہ محکوم۔ حاکم کو۔ یا مغلوب۔ غالب کو۔ یا ادنیٰ۔ اعلیٰ کو کوئی تحفہ بطور رضا جوئی کے دیتا ہے۔ بعد میں دوسری حالت یہ ہوتی ہے کہ اعلیٰ۔ ادنیٰ کو یا حاکم۔ محکوم کو تحفہ یا ڈالی کے مقابلے میں بطور نشانِ خوشنودی کچھ چیز واپس کرتا ہے۔ جب ڈالی اور عطیے کی رسم مستحکم ہو جاتی ہے۔ اور اپنے سے کچھ چیز علیحدہ کر کے دوسرے کو دینے میں حصولِ خوشنودی یا رضا جوئی مفہوم ہونے لگتا ہے۔ تو مساوی حیثیت اشخاص میں ڈالی کا رواج موجود ہو جاتا ہے۔ یہ صریحاً درست ہے کہ سوسائٹی کے آغاز میں جب کہ کل اشخاص مساوی حیثیت کے تھے۔ اور کسی ایک شخص کی حکومت دوسروں پر نہ تھی۔ سلام۔ خوشامد کی طرح۔ ڈالی کا رواج بھی معدوم تھا۔

اِس فعل کا آغاز بطورِ فعلِ اطاعت کے ہوا۔ اور اس کا بیج اسوقت بویا گیا جب ایک شخص نے چند دیگر اشخاص کو بوجہ طاقتِ بدنی۔ یا طاقتِ دماغ و فکر قابو میں لاکر ان کو اپنے ماتحت کیا۔ اور مفتوح کی جان۔ اسکا مال۔ اس کی اولاد۔ غرض ہر ایک چیز فاتح کی ملکیت سمجھی جانے لگی۔

غالب کا مغلوب سے خارجی علامت اطاعت کا طلب کرنا۔ سب سے مقدم خیال ہوتا ہے۔ جو شخص مقابلہ چھوڑ کر اطاعت قبول نہ کرے۔ وُہ دشمن ہوتا ہے جس کے زیر کرنے بلکہ بعض اوقات نیست و نابود کرنے سے ہی شخص غالب کی طاقت باقی مغلوبین پر قائم رہ سکتی ہے۔ یہ ضروری ہوتا ہے کہ جو شخص مقابلہ کرے یا تو اس کی طاقت کو توڑ کر اس کو مطیع بنا لیا جاوے۔ یا اگر اس کی طاقت زیادہ ہو۔ تو مفتوح ہونے پر وُہ تمام افراد جو شخص مغلوب کے مطیع ہوں۔ شخص غالب کے دائرہ اطاعت میں لائے جاویں۔ اِسی طرح لڑائی۔ جھگڑے۔ کُشت و خون کے بعد جب ایک شخص اپنی طاقت بمقابلہ دوسروں کے فائق ظاہر کرتا ہے۔ تو کمزوروں کے لئے مقابلہ و مخالفت کا ترک کرنا مصلحت

ہوتا ہے۔ اور فاتح۔ مفتوح سے علامتِ اطاعت طلب کرتا ہے۔ سب سے اوّل فعل اطاعت ہتھیار رکھ دینا ہوتا ہے۔ یعنی بیرونی علامتِ مخالفت ومقابلہ ترک کرکے اور مطابعت قبول کرکے مفتوح کے رحم پر یا اُس کے قابو میں اپنے آپ کو ڈال دینا۔ اِس کے بعد جب مسلسل تابعداری مطلوب ہوتی ہے۔ تو غالب مغلوب سے قدرتاً یہ طلب کرتا ہے کہ آیندہ کے لئے بھی فرمانبرداری و وفاداری کی حلف اُٹھالی جاوے۔ یعنی اطاعت غیر مشروط کے بعد قسمِ رفاقت لی جاتی ہے۔ لیکن اس کے سوا غالب مغلوب سے کچھ طلب نہیں کرتا۔ البتہ چونکہ آغاز تمدّن میں مفتوح کی جان ومال فاتح کے کلّی اختیار میں ہوتی تھی۔ اور کوئی شخص کسی چیز کو شخص غالب کی صریح یا معنوی اجازت کے بغیر استعمال نہ کرسکتا تھا۔ اور نیز چونکہ حاکم کی ناراضگی پر کل جائداد چھین لی جاسکتی تھی۔ اور ہر طرح کا نقصان پہنچنے کا احتمال ہوسکتا تھا۔ اِس لئے مصلحت زمانہ کے مطابق محکوم کی جانب سے حاکم کو خوش رکھنے کی پہلی ترکیب۔ اپنی مقبوضہ اشیاء میں سے بعض اشیاء کا خود بخود دیدینا شروع ہوا۔ تحفہ تحائف کی بنیاد قائم ہوئی۔ اور ڈالی کا بیج ڈالا گیا۔ ہر ایک شخص اپنی ذاتی منفعت کو مدِّ نظر رکھ کر۔ اس خیال سے کہ اگر شخص غالب دندانِ طمع دراز کرے۔ یا خوش نہ رہے۔ تو کل اشیا مقبوضہ ضبط کرلیگا۔ خود بخود اپنی ملکیت میں سے کچھ حصہ بطور تحفہ دینے لگ گیا۔ تحفہ تحائف کا دینا شروع میں فرض نہ تھا۔ بلکہ ایک مصلحت تھی۔ جس کا اصول یہ تھا کہ ملکی حاکم کو جس کے اختیار میں کُل کا چھین لینا ہے۔ اِس کو پیشتر ہی سے جُزو جائداد دیکر اس اظہارِ اطاعت سے خوش کیا جاوے اور دوئم اس کے ذاتی لالچ کو خود بخود پُورا کرکے آیندہ کے زیادہ نقصان سے محفوظ ہو جاویں۔ اگرچہ شروع میں یہ رسم غیر لازمی تھی لیکن تمدّن کے ترقی کرنے پر اس کی شکل وماہیت میں تبدیلی واقع ہوئی۔ ایک پہلو سے تو یہ دیکھا گیا کہ ملکی حاکم کا اختیار غیر محدود سے محدود ہو گیا۔ اور کُل جائداد کے خواہ مخواہ چھین لینے کا اختیار جاتا رہا۔ جو مال ومتاع کہ مغلوبین کے پاس صرف انکا مقبوضہ ہوتا۔ وُہ اب انکا مملوکہ خیال کیا گیا۔ ان کی ذات وجائداد محفوظ قرار دی گئی۔ تاوقتیکہ قانون کی خلاف ورزی پر۔ بطورِ سزا۔ یا پاداشِ جرم قید۔ جرمانہ۔ یا ضبطی جائداد کا حکم صادر نہ ہو۔ لیکن دوسرے

پہلو سے بادشاہ یا ملکی حاکم کو جو تحفہ تحائف غیر لازمی طور پر دیئے جانے شروع ہوئے تھے۔ وہ لازمی ہو کر بادشاہ کا حق قرار دئے گئے۔ بجائے گاہ بیگاہ دیئے جانے کے معیّن اوقات میں لئے جانے شروع ہوئے۔ اور بجائے کُل جائداد کے صرف جزو جائداد پر حقِ شاہی قائم ہُوا۔ یعنی آغازِ تمدن میں جس وقت بادشاہ مطلق العنان ہوتا تھا۔ اور قانون اس کی زبان ہوتی تھی۔ کل جائداد کے آئندہ ضبط ہوسکنے کے احتمال سے مصلحتاً پیشتر سے ہی گاہ بیگاہ خود بخود ملکیت کا کچھ حصہ بطور تحفہ و اظہارِ اطاعت پیش کیا جانا شروع ہوا۔ لیکن تمدن کے ترقی کرنے پر جب ذات و جائداد محفوظ ہو گئی (علاوہ اس کے کہ جُرم خلافِ قانون مقررہ سرزد ہو) اس کے ساتھ ہی جُزو جائداد کا بادشاہِ وقت کی خدمت میں بطور نذرانے کے اوقات معیّن پر پیش کرنا لازمی ہو گیا۔ گویا ڈالی ٹکس اور مالگذاری کی شکل میں نظر آنے لگی۔ شروع میں جب نقدی کا رواج نہ تھا۔ تو ہر ایک چیز کا حصہ جنسی لیا جانا جاری تھا۔ بعد میں ٹکس نقدی کی صورت میں منتقل ہو گیا۔ جب بجائے سابقہ غیر معیّن اشخاص سے غیر معین اوقات پر تحفہ تحائف لینے کے معیّن طریق پر مستقل آمدنی شاہی قائم ہو گئی۔ تو ڈالی کی شکل میں ایک اور تبدیلی واقع ہونے کی صحیح وجہ موجود ہو گئی۔ ایک طرف سے تو علاوہ مقررہ ٹکس کے کوئی فرض نہ تھا کہ شخص مطیع کوئی نذر نذرانہ خود بخود دیوے۔ لیکن دوسری طرف سے اس فعل کا وُہ اثر کہ جس کے باعث یہ رسم شروع ہوئی جاتا رہا۔ جب قانون ہو گیا کہ ہر شخص جو پانچسو صما سے زیادہ آمدنی رکھتا ہے اپنی آمدنی میں سے فی روپیہ ۵ پائی داخلِ خزانۂ سرکار کرے۔ یا جب یہ بات فیصلہ پا گئی کہ پیداوارِ اراضی اُٹھانے کے بعد سرکار کو فی کنال ۸ معاملہ ادا کیا جاوے تو انکم ٹکس یا مالگذاری یا یُوں کہو کہ فرائضِ قانونی ادا کرنے سے خاص طور پر بادشاہ کی خوشنودی کے حاصل کرنے کا موقع جاتا رہا۔ یعنی وُہ اثر اور وُہ مطلب جو شروع میں رسمِ تحفہ کا محرک تھا موجودہ صورت میں حصولِ خوشنودی کا محرک نہ رہا۔

جب یہ حالت ہُوئی تو جن اشخاص کو خاص ذاتی اغراض کی وجہ سے خصوصیت سے اظہارِ اطاعت اور حصولِ خوشنودیِ مزاجِ حاکمِ ملکی مطلوب تھا۔ وُہ اس پر اکتفا نہ کر سکتے تھے کہ معمولی

طریق پر مثل دیگر اشخاص صرف ٹکس - یا مالگذاری ہی دیدیویں - اُنہوں نے خصوصیت ظاہر کرنے کی وجہ سے اور انسانی طبیعت سے فائدہ اُٹھانے کی نیّت سے بروقتِ مُلاقات - حاکم ملکی کے پاس کوئی خاص تحفہ علاوہ معمولی ٹکس یا مالگذاری کے خود بخود لیجانا شروع کیا - اسی طرح سے ہر ایک شخص نے جس کو غرض حصولِ خوشنودی بادشاہ تھی - تحفہ تحائف بروقتِ مُلاقات لیجا کر رواجِ نذر نذرانہ کی بُنیاد قائم کردی - یہ رسم بھی اگرچہ قانونی فرض نہ بنی بوجہ اس کے کہ قانونی حق بادشاہ کا پہلے قائم ہوچکا تھا - لیکن مستحکم ہوکر مستقل رواج کے پائے تک پہنچ گئی - اور یہ رواجاً لازمی ہوگیا کہ ہر ایک شخص خواہ امیر ہو خواہ غریب - خواہ غرض رکھتا ہو خواہ محض مُلاقات کے لئے جائے - جب حاکمِ وقت کی خدمت میں حاضر ہو تو بروقتِ حصول نیاز کچھ نہ کچھ نذر نذرانہ ضرور پیش کرے -

اس درجے پر پہنچ کر - رواج واپسی نذرانہ کا قائم ہوجاتا ہے - شروع میں نذرانہ صرف اُن اشخاص کا واپس کیا جاتا تھا جو غریب ہوتے تھے - یا جن کو کوئی ذاتی منفعت مطلوب نہ ہوتی تھی - یا جن اشخاص میں یہ توقع پیدا کرنی مناسب نہ ہوتی تھی کہ اسکا معاوضہ بادشاہ کی طرف سے اُن کو کسی آئندہ وقت میں ملیگا - بعد ازاں بلا تمیز ہر ایک حالت میں نذرانہ واپس ہونا شروع ہوتا ہے - لیکن نذرانے کے پیش کرنے کی رسم - بطور بیرونی علامت مطابعت و وفاداری کے قائم رہتی ہے - نذر نذرانہ پیش کرنا رواجی فرض ہوجاتا ہے - اگرچہ ساتھ ہی جیسا کہ ٹکس اور مالگذاری کے بارے میں ذکر کیا گیا - پھر اصل مطلب و منشاء جس کی وجہ سے آغاز اس رسم کا ہؤا وُہ معدوم ہوجاتا ہے - دیسی ریاستوں میں مثلاً مہاراجہ صاحب جمّوں و کشمیر کے دربار میں روپئے نذر کے طور پر پیش کئے جاتے ہیں - مہاراجہ صاحب چھُو کر واپس کر دیتے ہیں - اور اگرچہ روپئے دکھلانے یا پیش کرنے میں کوئی خاص حصولِ خوشنودی مزاج نہیں ہوتا کیونکہ ہر ایک شخص کے واسطے یہ ایک معمولی رسم ہے - لیکن اس رسم کا ادا نہ کرنا - باعثِ رنجیدگی خاطر ضرور ہوتا ہے -

انگریزی حکام اعلیٰ مثلاً چیف کمشنر - لفٹنٹ گورنر - اور وایسرائے کو بھی خاص دربار کے موقعوں پر سفید ریشمی رومالوں پر اشرفی وغیرہ رکھکر پیش کرنے کا رواج اب تک موجود ہے - گویہ اب محض ایک اظہارِ اطاعت ہے - اور اس کا اصلی مطلب یعنی خاص طور پہ ذاتی منفعت کی غرض سے بادشاہ کی خوشنودی حاصل کرنا اب معدوم ہو گیا ہے -

جب ایک رسم محض اسی غرض سے قائم ہوئی کہ غیر معمولی طریق پر بوقتِ ملاقات تحفہ پیش کر کے خاص طور پر حاکم ملکی کی رضاجوئی کر کے مطلب براری ہو سکے - اور جب یہ رسم عام ہو جانے کی وجہ سے رواجی فرض میں تبدیل ہو گئی - بلکہ رواج واپسی نذرانہ بھی قائم ہو گیا - تو ایک اور ترکیب اسی سلسلے میں دیکھی جاتی ہے - خاص عنایاتِ شاہی کے جو مطلوب ہوں - اُن کا خاص طور پر معاوضہ علاوہ معمولی ٹکس - اور علاوہ رواجی نذر کے جاری ہو جاتا ہے - یعنی خاص ضرورت اور غیر معمولی ضرورت امداد شاہی کے وقت خاص میں سے کام چلایا جاتا ہے - مہاراجہ صاحب گلاب سنگھ سابق والی جموں و کشمیر کا قاعدہ تھا کہ ایک روپیہ خاص طور پر دیئے جانے پر رعایا کے عرائض سُنا کرتے تھے -

انگلستان میں بھی کچھ زیادہ عرصہ نہیں ہوا - امداد شاہی خاص نذرانہ سے حاصل ہو سکتی تھی - بعد میں یہ استحقاق رعایا کا قائم کیا گیا کہ رسوم مقررہ کے ادا کرنے پر امداد شاہی حاصل کر سکیں - جس طرح سے تحفہ تحائف غیر لازمی سے لازمی ہو جانے پر ٹکس کی شکل میں تبدیل ہوئے - اور بعد ازاں ضرورت نے نئی رسم نذرانہ پیدا کی اور جس طرح کہ بعد میں یہ رسم بھی پایۂ مستقل رواج کے پائے پر پہنچکر - دوبارہ ضرورت خاص فیس کی ہوئی - اسی طرح سے خاص فیس کے دیئے جانے کی رسم مستحکم ہو کر لازمی بن گئی - اور قانون ہو گیا کہ سوائے رسوم مقررہ کے کوئی امداد شاہی نہ دیجا دیگی - اب اگر استغاثہ کرنا ہو تو کورٹ فیس - عرضی دائر کرنی ہو تو رسوم عدالت لازمی ہیں - سلسلۂ ارتقا میں ڈالی اسوقت کورٹ فیس کے لباس میں دیکھی جاتی ہے -

(باقی آئندہ)

قرۃ العین

ناظرین - آپ نے میرزا علی محمد باب کا نام اکثر سُنا ہوگا جس نے ایران میں پیغمبری کا دعویٰ کیا اور ۱۸۴۰ء میں بابی مذہب کی بُنیاد ڈالی - اِس شخص نے باب کا لقب اِس لئے اختیار کیا تھا کہ وہ اپنے آپ کو باب اللہ سمجھتا تھا - یعنی دروازہ جس سے آدمی خدا کے ایوانِ معرفت میں داخل ہو سکتا ہے - رفتہ رفتہ اس مذہب کو ایسی ترقی ہُوئی کہ ایک انبوہِ کثیر میرزا محمد علی کا پَیرو ہو گیا جس میں بڑے بڑے عالم اور ذی عزّت لوگ شامل تھے - ہر طرف اِس نئے فرقے کا ایک تہلکہ مچگیا تھا یہاں تک کہ سلطنتِ ایران کو اس کے ساتھ مقابلہ و مجادلہ کرنا پڑا - اِس مذہب کی بہت بڑی حامی ایک عورت قرۃ العین نامی گذری ہے جو بابیوں میں مثل خواتینِ اہل بیتِ رسالت بہت ہی احترام کے قابل مانی جاتی ہے - اور اُسی کے حالات اِس وقت لکھے جاتے ہیں جو دلچسپی سے خالی نہیں ہیں۔

قرۃ العین کا اصلی نام زرین تاج تھا جو اُس کے سر پر سُنہری بال ہونے کی وجہ سے رکھا گیا تھا - اور عُلمائے قزوین کے ایک مشہور خاندان سے تھی - چنانچہ اس کا باپ حاجی محمد صالح ایک مشہور فقیہہ تھا اور اس کا چچا ملا محمد تقی قزوین کا ایک معزز عالم تھا - علاوہ ان کے اس خاندان کے اور چند ممبر بھی اعلیٰ درجے کے عالم مانے جاتے تھے - بچپن سے اس لڑکی کو تحصیلِ علم کا بہت شوق تھا اور اسی وجہ سے اپنا گھر چھوڑ کر کربلا تک گئی - اور وہاں کے مشہور فضلا سے تعلیم پائی - غرضکہ اپنی کوشش سے وہ علم و فضل کا مجسم نمونہ ہو گئی تھی - بارگاہ ایزدی سے اُسے حُسن بھی خُوب عطا ہوا تھا اور ساتھ ہی نہایت باحیا اور باعصمت تھی - باب کا شہرہ سُنکر اوّل اوّل قرۃ العین نے اس سے خط کتابت شروع کی اور پھر مُلاقات کے بعد اُس کی ایسی معتقد ہُوئی کہ بابی مذہب کو سب سے اچھا اور سچا مذہب سمجھتی تھی - آخرش یہاں تک نوبت پہنچی کہ اُس نے علانیہ بابی مذہب کی ترقی و اشاعت میں کوشش شروع کر دی - جہاں وہ جاتی اور جس مجمع میں اس کا گذر ہوتا وہاں وہ نہایت

آزادی کے ساتھ باب کے فضائل بیان کرتی - بابی مذہب کی سچائی کا یقین دلاتی اور اس کے لئے بڑے شدومد کے ساتھ عقلی ونقلی دلائل پیش کرتی - اِسی غرض کے لئے اُس نے کربلائے معلےٰ کا سفر اختیار کیا - یہاں کے اہل علم اُس کے عالمانہ اوصاف سے پہلے سے واقف تھے اور اب اسکا پُراثر وعظ سُننے کے لئے ہزاروں آدمیوں کا مجمع ہونے لگا اور شہر کے بہت سے آدمی اُسکی جادو بیانی کی بدولت بابی ہوگئے - جب یہ حالت ہُوئی تو عُلماء کی شکائت پر گورنر نے اُس کی گرفتاری کا حکم دیا لیکن اس کو پہلے خبر ہوگئی تھی اِس لئے وُہ یہاں سے بغداد کو چلدی - بغداد میں بھی اُس نے وُہی طریقہ اختیار کیا اور گورنمنٹ عثمانیہ کے حکم کے موافق یہاں سے بھی نکلنے پر مجبور ہُوئی - تاہم اُس نے بغداد سے کرمان شاہ اور ہمدان تک پہنچتے پہنچتے چند مشہور عُلماء وعمائدِ دین کو بابی کرلیا - ہمدان سے اپنے وطن قزوین میں آکر اُس نے ایک ایسا قصد ظاہر کیا جس سے سُننے والوں کو اُس کے جوش پر تعجب ہوتا تھا - وُہ یہ تھا کہ محمد شاہ بادشاہ ایران کو بابی بنایا جاوے - یہ ارادہ کر کے وُہ طہران کی طرف روانہ ہُوئی مگر وقت پر اس کے باپ کو معلوم ہوگیا - چنانچہ اُس نے ڈر کے مارے چند عزیز بھیجکر قرۃ العین کو واپس قزوین بُلا لیا -

قرۃ العین کی شادی اُس کے چچا کے بیٹے مُلّا محمد سے ہُوئی تھی جو بابی مذہب کا دشمن تھا - اِس وجہ سے ہر وقت آپس میں نارضامندی رہتی تھی - آخرش مُلّا محمد نے قرۃ العین کو طلاق دینے کے سوائے کوئی چارہ نہیں دیکھا اور اب قرۃ العین کو باب کی تائید کے لئے کامل آزادی مِل گئی جس کی وُہ نہائت خواہشمند تھی - مگر قزوین میں اس کے مخالفوں کی تعداد بہت زیادہ ہوگئی تھی - جو ہر وقت اس کی جان کے درپے رہتے تھے - اِس لئے وُہ قزوین سے نکل کر طہران اور طہران کے بعد خراسان گئی - خراسان سے رشت پہنچی جہاں بابیوں کی ایک جماعت موجود تھی - رشت سے وُہ اشاعتِ مذہب کے لئے مازندران گئی اور یہاں ایک بہت بڑی مجلس میں نہایت عُمدہ تقریر کی - اثنائے تقریر میں اُس کا نقاب چہرے سے ہٹ گیا تو تمام حضارِ مجلس اُس کی نُورانی صُورت اور خداداد حُسن دیکھ کر حیرت زدہ ہوگئے - مگر یہاں بھی

وُہ چین سے نہ رہ سکی اور بیچاری کو جنگل جنگل پھرنا پڑا۔ اس عرصے میں مانندراں کے بابیوں اور بادشاہی فوج سے تکرار ہو گئی اور ایک بڑا ہنگامہ برپا ہو گیا جس میں ایک ہزار بابی قتل کیئے گئے۔ اب قرۃ العین نور پہنچی اور یہاں کے حاکم نے اسکو حراست میں طہران روانہ کیا۔ اب محمد شاہ بادشاہ کا انتقال ہو گیا تھا اور شاہ ناصر الدین قاچار تخت پر تھے۔ جب ہز مجسٹی کے سامنے قرۃ العین پابزنجیر لائی گئی۔ تو شاہ کو اس کے حُسن و جادو بیانی اور علم و فضل کا بہت خیال ہوا اور آپ نے حکم دیا کہ ایسی عورت کا مرنا بہت افسوسناک ہوگا۔ اِس لئے اُسکو چھوڑ دیا جائے۔ مگر وُہ کوتوالِ شہر کی نگرانی میں رہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہُوا۔ مگر وُہ یہاں بھی برابر اشاعتِ مذہب میں کوشش کرتی رہی۔ زنانہ مجلسوں میں جاکر تقریریں کیں اور طہران کے بعض معزز خاندانوں کو بابی بنالیا۔

المختصر قرۃ العین اپنی ساری قوت اس مذہب کے پھیلانے میں صرف کرتی تھی اور اسکی اور خود مرزا علی محمد باب کی کوشش سے اس مذہب کے ماننے والے روز بروز بڑھتے جاتے تھے اور عجب نہیں کہ ایک روز تمام سلطنت کا مذہب بابی ہو جاتا مگر ایک ایسا واقعہ پیش آگیا جس نے بابیوں کی حالت کو بہت ہی خراب کر دیا۔ یعنی ۱۵۔ اگست سنہ ۱۸۵۲ء کو شاہ ناصر الدین کوہ البرز کے دامن میں گھوڑے پر ہَوا خوری کو نکلے۔ ایک مقام پر تین شخص شاہ کے سامنے آئے جنکی نسبت اُنہوں نے خیال کیا کہ کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں۔ جب وُہ پاس پہنچے تو ایک شخص نے پستول نکالکر بادشاہ کی طرف فائر کیا مگر نشانہ خطا ہُوا۔ پھر ایک دُوسرے شخص نے بادشاہ کو گھوڑے سے گھسیٹ کر زمین پر گرادیا اور سر کاٹنا چاہتا ہی تھا کہ ایک شاہی فراش نے نہایت چستی سے خود اُسی کا سر اُڑا دیا۔ یہ دیکھ کر اُس کے اور دو ساتھی فرار ہو گئے اور بادشاہ کی جان بچ گئی مگر اُس روز سے بابی سلطنت کے بدخواہ خیال کیئے گئے اور بابی ہونا ایک سخت جرم ہو گیا۔ تمام سلطنت میں تفتیش کی گئی اور ہزاروں بابی گرفتار ہوئے اور نہایت بیرحمی سے قتل کیئے گئے۔ بہت سے آدمیوں نے ہر طرح کی تکلیف و اذیت اُٹھائی مگر بابی مذہب سے منحرف نہیں ہوئے۔ اِس کے بعد بھی بارہا کثیر التعداد بابیوں کو قتل کیا گیا مگر یہ گروہ اب تک موجُود ہے۔

بعض صاحبوں کا خیال ہے کہ میرزا علی محمد اس واقعہ سے چند روز پہلے قتل کیا گیا تھا اور بعض کا خیال ہے کہ وہ بھی ان لوگوں میں تھا جو اس حملے کے بعد گرفتار ہوئے اور نہ صرف وہ بلکہ قرۃ العین اور بہت سے نامور بابی لیڈر بھی۔ اور سب قیدی تو بہت سی تکلیفوں کے بعد قتل کر دیے گئے مگر قرۃ العین شاہ کے سامنے پیش کی گئی۔ اس موقعہ پر اکثر وزرا و افسران فوج موجود تھے اور ہر ایک چاہتا تھا کہ کسی طرح اس عورت کی جان بچ جائے۔ اس لئے اُس سے ایسے سوال کئے گئے کہ وہ باب کی تائید اور اس کے مذہب کی طرفداری سے انکار کرے اور یہ بھی کہدیا گیا کہ اگر انکار نہ ہوگا تو قتل لازمی ہے۔ مگر اُس نے باب ہی کا کلمہ پڑھا اور اُس کو پیغمبر یا امام برحق سمجھا بلکہ صاف یہ کہدیا کہ "میری موت تم کو میری صداقت کا یقین دلائیگی"۔ آخرش قتل کا حکم دیا گیا اور اسکو پھانسی دیکر نعش ایک اندھے کنوئیں میں ڈالدی۔ مگر بعض انگریز سیاحوں کا بیان ہے کہ وہ جلائی گئی۔ اس طرح اس علم و فضل کی تصویر کا خاتمہ ہوا جس نے بڑے بڑے علما و مجتہدین سے عرصے تک بحثیں کیں۔ اُن کے اعتراضات کے دنداں شکن جواب دیئے اور اپنے دعویٰ کو قرآن۔ حدیث اور مذہبی دلائل سے ثابت کیا۔ جس نے ہزاروں آدمیوں کے مجمعوں میں پرزور تقریریں کیں اور ہزاروں کو اپنا گرویدہ بنالیا۔

قرۃ العین نے نظم و نثر دونوں میں بہت لکھا اور چند کتابیں بھی تصنیف کیں مگر یہ تمام سرمایہ تلف ہوگیا۔ وہ طاہرہ تخلص کرتی تھی اور یہی وہ لقب تھا جو باب نے عصمت و پاکدامنی کی وجہ سے اُسکو عطا کیا تھا۔ اب اُس کی مفصلۂ ذیل دو غزلیں مصنفوں کو بہت تلاش سے دستیاب ہوئی ہیں:

(۱)

جذباتُ شوقِكَ الجمتَ بسلاسلِ غمٍ والبلا — ہمہ عاشقانِ شکستہ دل کہ دہند جاں برہ بلا
اگر آں صنم زسرِ ستم پےِ کشتنِ من بے گنہ — لَقَدِ استقامَ بسیفِہ فَلَقد رضیتُ بما رضا
سحر آں نگارِ ستمگرم قدمے نہادہ بہ بسترم — وَاِذا رأیتُ جمالَہ طلعَ الصَّباحُ کأنّما
نہ چو زلفِ غالیہ بارِ او نہ چو چشمِ فتنہ شعارِ او — شدہ نافۂ بہمہ ختن شدہ کافرے بہمہ خطا

تو کہ غافل از مئے و شاہدی پئے مرد عابد زاہدی — چہ کنم کہ کافر جاہدی ز خلوص نیت اصفیا

بمراد زلف معلقے پئے اسپ و زین مغرقے — ہمہ عمر منکر مطلقے ز فقیر فارغ بے نوا

تو و ملک و جاہ سکندری من و رسم و راہِ قلندری — اگر آں خوش ست تو درخوری وگر ایں بدست مرا سزا

بگذر ز منزلِ ما و من بگزیں بملکِ فنا وطن — فَاِذَا فعلتَ بمثل ذا فلقد بلغتَ بما تشا

(۲)

لمعات وَجھكَ اشرقَتْ وشُعاع طلعتكَ اعتلا — زچہ رو اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ نہ زنی بزن کہ بلے بلے

بجواب طبلِ الست تو ز ولا چہ کوس بلے زدند — ہمہ خیمہ زد بدر دلم سپہ غم و حشم بلا

من و عشقِ آں مہ خوبرو کہ چو زد صدائے بلا برو — بنشاط و قہقہہ شد فرو کہ انا الشہید بکربلا

چو شنید نالۂ مرگ من پے ساز من شد و برگ من — فمشٰی اِلَیَّ مُھَرْوِلاً وَبکٰی عَلَیَّ مجلجلا

چہ شدہ کہ آتش حیرتے ز نسیم لعلہ طورِ دل — فلکتہٗ و دککتہٗ متدککا متزلزلا

پئے خوان دعوت عشق او ہمہ شب ز خیل کروبیاں — رسد ایں صفیر مہیمنے کہ گرو، غمزدہ الصلا

تو چہ فلس ماہیِ حیرتی چہ زنی زبحر وجود دم — بنشیں چو طاہرہ دمبدم بشنو خروشِ نہنگِ لا

اِس قدر حالات معلوم کرنے کے بعد ناظرین کو وہ اصول دریافت کرنے کا انتظار ہوگا جن پر بابی مذہب قائم ہوا اور خود باب اور قرۃ العین جنکی تعلیم دیتے تھے۔ لہٰذا وہ مختصر طور پر بیان کئے جاتے ہیں:۔

(۱) مخلوق خالق کو نہیں پہچان سکتی اس لئے مشیتِ اولی نے انسان کی صورت میں حلول کیا۔

(۲) خدا نے جن صورتوں میں حلول کیا انکو پیغمبر کہتے ہیں۔

(۳) پیغمبر بے شمار ہو چکے ہیں اور آیندہ بھی اسی طرح ہوتے رہینگے۔

(۴) مشیت اولی اب باب کے ذریعے سے بولتی ہے۔

(۵) اگر قرآن حضرت محمد صلعم کی رسالت کی دلیل ہے تو "بیان" باب کی صداقت کے لئے کافی ہے۔

(۹) قرآن کے لفظوں میں لاثانی فصاحت و بلاغت نہیں ہے بلکہ جو اثر اُن میں پیدا کیا گیا وُہ لاثانی ہے۔

(۱۰) حضرت باب اللہ ہی مہدی موعود ہیں۔

یہ وُہ اصُول ہیں جن کی تعلیم و تلقین میں قرۃ العین نے تمام عمر صرف کردی اور جن کے پھیلانے میں وُہ خود اپنے آپ کو اور تمام دُنیا کو بھولی ہُوئی تھی۔ اُسکو کسی ذاتی یا دنیاوی معاملے سے کچھ سروکار نہ تھا اور صرف ایک مقصد تھا کہ لوگوں کو بابی مذہب کی سچائی کا یقین دلایا جاوے اور جنکو یقین ہو جاتا تھا وہ بابی ہو جاتے تھے۔ اس مقصد کے حاصل کرنے میں اُسکو کسی بات کا حتّٰی کہ اپنی جان تک کا بھی خوف نہ تھا۔ اور اگر ہوتا تو وُہ بابی مذہب سے انکار کر کے اپنی جان بچا سکتی تھی۔ مگر اُس کے دل نے کسی طرح گوارا نہیں کیا کہ وُہ مرنے کے خوف سے ایک سچّی بات سے انکار کرے ٭

نیاز احمد (از میرٹھ)



اَے مہِ عید بے حجاب ہے تو — حُسنِ خورشید کا جواب ہے تو
اَے گریبانِ جامۂ شبِ عید — شاہدِ عیش کا شباب ہے تو
اے نشانِ رکوعِ سورۂ نُور — نقطۂ کلکِ انتخاب ہے تو
اَے جوابِ خطِ رکوعِ نیاز — طاعتِ صوم کا ثواب ہے تو
ہائے اے حلقۂ پرِ طاؤس — قابلِ ذٰلک الکتاب ہے تو
چشمِ طفلی نے جب تجھے دیکھا — کہہ دیا خواب کو کہ خواب ہے تو
طوفِ منزلگہِ زمیں کے لئے — ہمہ تن پائے در رکاب ہے تو
یہ اُبھرتے ہی آنکھ سے چھپنا — روشنی کا مگر حباب ہے تو

توکمندِ غزالِ شادی ہے
لذت افزائے شورِ طفلی ہے

(سید نذیر حسین بی اے — وزیرآباد)

کرشن جی

وُہ سبزہ زار جو دریائے جمنا کے کنارے پر واقع ہیں - باوجُود سبز قدم فحتمندوں کے پیروں کے نیچے پےدرپے روندے جانے کے بھی - اب تک اپنی رعنائی اور دلفریبی سے ہر ایک سیاح کے دل کو مسخر کر لیتے ہیں - کوسوں تک زمین نے سبز لباس پہن لیا ہے - اور مولسری - اور تمال کے خوشنما درخت عجب آن بان سے قطار در قطار کھڑے ہیں - اور اُن کے سائے نے اس سرزمین پر سحر کا سا اثر ڈال رکھا ہے - پانی کی بھی یہاں کمی نہیں - جگہ جگہ صاف شفاف پانی کے نیلگوں چشمے ہیں جنکے گرد ہر وقت چرند و پرند کا رمنا رہتا ہے - علاوہ قدرت کی گوناگون خوبصُورتی کے اس منظر کی دلچسپی کو ایک اَور خیال نے بھی بڑھا رکھا ہے - یہی مقام ہے جسے ہندو مذہب کا گہوارہ کہنا چاہئیے - اور یہیں سے علم و فضل کی وُہ ندی بھی نکلی جس سے اہلِ یونان اور دیگر اقوامِ قدیمہ سیراب ہوئیں - اِسی جگہ وُہ شہر (متھرا) واقع ہے - جو لاکھوں بندگانِ خدا کے لئے مودّبانہ توجہ کا مرکز اور مقدّس خیالات کا مرجع ہے -

یہیں وُہ شخص پیدا ہُوا جس نے انہیں نیکی اور محبت کے راستے پر چلنے کی تلقین کی اور یہی زمین تھی جس نے اس کے ان قدموں کو چُھوا جنکی برکت سے وُہ نجات اور مغفرت کی اُمّید رکھتے ہیں -

تاریخ سے ثابت ہر کہ متھرا کسی زمانے میں ایک نہایت عظیم الشان شہر تھا - یہاں کی عمارات مندر وغیرہ ہندوستان میں آپ ہی اپنی نظیر تھے - اور کیوں نہ ہوتا ایک دولتمند اور صاحبِ جاہ راجے کا پایۂ تخت تھا - مگر اب اس کی وُہ اگلی سی خوبصُورتی زمانے کی دستبُرد سے محفوظ نہیں رہی - مگر اب بھی ہندو مذہب کا جس قدر چرچا یہاں ہے وُہ شاید ہی کسی اَور جگہ ہو - ہر روز صبح کو بے شمار مندروں میں ناقوس اور گھنٹوں کی آواز سُنائی دیتی ہے - اور سینکڑوں زن و مرد جمنا میں اشنان

کر کے پُوجا پاٹ کے لئے جاتے ہیں۔ اِن سب مندروں میں زیادہ مشہور کیشب دیو کا مندر ہے جسے تعمیر ہوئے غالباً کچھ بہت عرصہ نہیں گذرا۔ اِس مندر کے قریب ایک کوٹھری ہے۔ جو اس مقام کا پتہ دیتی ہے۔ جہاں آج سے تقریباً چار ہزار برس پہلے دو حرمان نصیب میاں بی بی۔ جادون خاندان کے ایک ظالم راجے اور بے مہر رشتے دار کے حکم سے مقید تھے۔ ناز و نعمت میں پلے ہوئے شاہی خاندان کے نونہالوں کے لئے قید خانہ جہنّم سے بدتر تھا۔ اور زندگی بالکل تلخ ہوگئی تھی۔ جینے کا کچھ مزا نہ رہا تھا۔ بلکہ زیست موت سے بدتر تھی۔ طرح طرح کے ظلم و تعدی اور خصوصاً اولاد کی موت کے داغ سہتے سہتے کلیجہ چھلنی ہوگیا تھا۔ مگر ایک پیشین گوئی کے پُورا ہونے کی اُمّید انہیں کچھ سہارا دیئے ہوئے تھی۔ اور انکی زندگی کے گراں بوجھ کو ایک کمزور دھاگے سے لٹکائے ہوئے تھی۔ انکو ایک موہوم سا خیال تھا کہ کبھی نہ کبھی ہمارے بھی بُرے دِن پھرینگے اور کوئی نہ کوئی بے رحم راجہ کنس سے ہمارا بھی بدلہ لینے والا پیدا ہوگا۔

قریب ہے یار روزِ محشر چھپے گا کُشتوں کا خُون کیونکر
جو چُپ رہیگی زبانِ خنجر لہُو پکارے گا آستیں کا

یہ دل خوش کن خیال اس تنگ و تاریک محبس کے اندھیرے میں اور اس سے بڑھ کر انکی اپنی سیاہ بختی کی اندرونی ظلمت میں ایک روشنی کی شعاع ڈالدیتا تھا۔ اور اپنے انعکاس سے انکی زندگی کے ٹمٹماتے ہوئے چراغ کی لو کو بھی اکسا دیتا تھا۔

بی بی کو جسکا نام دیو کی تھا صبح و شام بچہ پیدا ہونے کی اُمّید تھی۔ مگر یہ خیال بجائے انکو خوش کرنے کے اَور بھی افسردہ خاطر بنائے دیتا تھا۔ پہلے سات بچّے اُن کے ہاں پیدا ہو چکے تھے۔ مگر انہیں کسی کو بھی آغوش میں لینا نصیب ہُوا تھا۔ ساتوں کے ساتوں راجہ کنس کے حکم سے پیدا ہوتے ہی مروا دیئے گئے۔ اور ان کے پاس سوائے حسرت و ارمان کے۔ اور کچھ باقی نہ رہا۔ آٹھویں بچّے کی پیدائش کا انہیں خصوصاً فکر تھا۔ کیونکہ یہی بچّہ تھا جسکی نسبت نجومیوں نے راجہ کنس کو خبر دی تھی کہ تیرے تخت و تاج کو تاراج کریگا۔ اور جس کا وبال پہلے ساتوں

کی بھی معصوم جان پر پڑا تھا۔ گو دیوکی کے شوہر واسدیو نے اسے خفیہ طور پر قید خانے سے غائب کر دینے کا انتظام کر لیا تھا۔ مگر پھر بھی دل میں طرح طرح کے خدشات اور وسواس پیدا ہوتے تھے۔ اور ایک عجیب امید و بیم کی کیفیت تھی۔

بھادوں کی آٹھویں تاریخ تھی۔ شب نے اپنی زلف کو پریشان کر رکھا تھا۔ اور سیاہ سیاہ بادلوں نے اُس کی ظلمت کو اور بھی زیادہ تاریک کر دیا تھا۔ آسمان کی ڈراؤنی صورت کسی اہم واقعہ کے وقوع پذیر ہونے کا پتہ دے رہی تھی۔ مینہہ موسلا دھار برس رہا تھا۔ گویا دیوکی اور واسدیو کی خستہ حالت پر زار و قطار آنسو بہا رہا تھا۔ اور چڑھے ہوئے دریا کی موجیں مُنہہ کھول کھول کر تمام شہر کو نگل لینے کی دھمکی دے رہی تھیں۔ شاید وُہ اپنی موج خیز طغیانی سے ان انقلابات کی اطّلاع دیتی تھیں جو سرزمین ہند میں طوفان بپا کرنے والے تھے۔ بجلی قرطاسِ فلک پر آتشیں حرفوں کی تحریر میں ایک روشن بخت کی آمد سے لوگوں کو خبردار کر رہی تھی۔ اور آسمان کا خوفناک آرگن رعد اپنی اُونچی سروں میں ایک عظیم الشان شخص کی خوش آمدید کا دل ہلا دینے والا راگ سُنا رہا تھا۔ پرندے گھونسلوں میں بیٹھے کانپ رہے تھے۔ اور آسمان کی یہ کیفیت دیکھ کر گردن بھی نہ اُٹھا سکتے تھے۔ تمام عناصر میں ایک ہل چل مچی ہوئی تھی۔ اور آسمان و زمین دونوں میں ایک عجیب شورش مچ رہی تھی۔ واسدیو اور دیوکی کے دلوں کی گھبراہٹ موسم کی اس تیزی سے اَور بھی دوبالا ہو گئی تھی اور انکی اندرونی دُنیا کی شورش۔ اس بیرونی دُنیا کی شورش سے کسی طرح کم وحشت خیز نہ تھی۔ مینہہ اور تاریکی کا یہی عالم تھا کہ یکایک مشرق میں زور سے بجلی کوندی۔ جس سے ایک لحظہ کے لئے تمام منظر منوّر ہو گیا۔ لیکن دُوسرے لحظے میں تاریکی پیشتر سے بھی زیادہ ہو گئی۔ ہاں اسی بجلی کے کوندنے کے ساتھ ایک رُوح عالم بالا سے عناصر میں اُتر آئی۔ یعنے کرشن پیدا ہُوا۔

اگر یہ راجکمار کسی اَور وقت اور حالت میں پیدا ہوتا تو خبر نہیں کتنے خوشی کے شادیانے بجتے۔ اور کیا کیا جشن منعقد ہوتے۔ مگر اُس وقت تو اُس کی جان کے لالے پڑے ہوئے

تھے۔ اور یہی کوشش تھی کہ کسی کے کان میں اُس کی بھنک تک بھی نہ پڑے۔ بدنصیب والدین نے اپنے لال کی پوری طرح شکل بھی نہ دیکھی اور واسدیو اُسے کپڑے میں لپیٹ کر قید خانے سے باہر پہنچا دینے کے ارادے سے چلا۔ محبس کے دروازے پر جگہ جگہ دربان بیٹھے تھے۔ جو آتے جاتے آدمی کا جائزہ لیتے تھے۔ مگر قسمت یا طوفان نے اسوقت اُنکی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا۔ اور واسدیو اپنے قیمتی خزانے سمیت ان سب کی آنکھ بچا کر نکل گیا۔ اور شہر سے کچھ دُور جنگل میں جا نکلا۔ یہاں ان دنوں ایک خانہ بدوش فرقے کے لوگ ٹھہرے ہوئے تھے جو گوپوں کے نام سے موسوم تھے۔ اس فرقے کے سردار نند سے واسدیو نے پہلے ہی فیصلہ کر لیا تھا۔ چنانچہ حسب قرار داد کرشن جی نند اور اسکی بیوی جسودھا کے حوالے کئے گئے۔ اور نند نے کمال بہادری اور انسانی ہمدردی سے اپنی نوزائیدہ لڑکی واسدیو کو دیدی۔ جنہوں نے اُسے لاکر دیوکی کے پہلو میں لٹا دیا۔ دُوسرے دن ظالم کنس کو خبر ملی کہ دیوکی کے ہاں کوئی لڑکا بالا پیدا ہوا ہے۔ وُہ سنگدل جلاد فوراً قید خانے پہنچا۔ اور آتے ہی اس ننھی سی جان کا قید خانے کے سنگین فرش کے ساتھ خاتمہ کر دیا۔

یہاں پر راوی ایک حکائت بیان کرتے ہیں کہ وُہ لڑکی فرش پر گرتے ہی آسمان کی طرف اُڑ گئی۔ جس سے راجہ کنس کو بہت کچھ خوف وہراس پیدا ہوا۔ لیکن یہ حکایت قابلِ تسلیم نہیں۔ ہاں یہ بات ضرور ہوگی۔ کہ راجہ کنس کے نفسِ توامہ نے اس خونی فعل پر اسے ملامت کی ہوگی۔ اور اس کی آئندہ بربادی اور پاداشِ جرائم کا نقشہ اُس کے سامنے کھینچ دیا ہوگا۔

ادھر کی تو یہ کیفیت رہی۔ اُدھر کرشن جی جسودھا اور نند کے سایہ عاطفت میں پرورش پانے لگے۔ چُونکہ گوپوں کی قوم ایک جگہ مقیم رہنے کی عادی نہ تھی۔ اس لئے تھوڑے دن متھرا میں قیام کرکے نند نے گوکل کی طرف کُوچ کر دیا۔ اور اسی مقام میں کرشن جی کا زمانہ طفولیت بسر ہوا۔

وُہ حکائتیں جو اُنکی اوائل عمر کی نسبت ناعاقبت اندیش عقیدت کیشوں کی افترا پردازی کی بدولت مشہور ہیں۔ سب اسی زمانے اور اسی جگہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ لیکن اگر ان حکائیتوں کو ایک مورخ کی غائر نظر سے دیکھا جائے تو سوائے ایک نوعمر لڑکے کی طفلانہ شوخی کے اَور کوئی بات اِن کی تہ میں نہیں

معلوم ہوتی۔ خصوصاً جب ہم یہ خیال کرتے ہیں کہ اس وقت کرشن جی کی عُمر پندرہ سولہ برس سے بھی کم تھی۔ تو ہمیں ان لوگوں کی کور باطنی پر نہ صرف افسوس ہوتا ہے۔ بلکہ اُنکی کم عقلی پر ہنسی بھی آتی ہے۔ جنہوں نے ایسی بے بُنیاد روائتیں بلا کسی ثبوت کے ایک نوعُمر لڑکے کی طرف منسوب کردی ہیں۔ مگر اس میں شُبہہ نہیں کہ کرشن جی کو بچپن میں طفلانہ کھیلوں میں بہت انہماک رہتا تھا۔ اور اپنی شوخی اور چلبلے پن کی وجہ سے گوپوں کے تمام طایفہ میں ہر دلعزیز ہو گئے تھے۔ اُنکی رضاعی ماں جسودھا خصُوصًا ان سے محبّت کرتی تھی۔ اور یہ لقب کا ہن یا کنھیا جس سے وُہ عوام میں مشہور ہیں اسی کا دیا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

گوپوں کے تمام لڑکے لڑکیاں کرشن جی کے حکم کی متابعت کرتی تھیں۔ اور اُنہوں نے اپنے ہمجولیوں کا خاصہ ایک لشکر بنا لیا تھا۔ جس کے سرگروہ خود بدولت تھے۔ کرشن جی کا گروہ گوکل کے میدانوں میں سارا دن رنگ رلیاں منایا کرتا تھا۔ اور انکے قہقہوں اور چہل سے جنگل میں منگل ہو جاتا تھا۔

چاندنی رات میں خوب لُطف رہتے تھے۔ کرشن جی کی بانسری سے تمام جنگل گُونج اُٹھتا تھا۔ اور صحرائی جانور بھی محو ہو جاتے تھے۔ گوپوں کے لڑکے اور لڑکیاں ہاتھ میں ہاتھ دیکر ایک حلقے میں ناچا کرتے تھے۔ اور اپنے ناچ رنگ سے جنگل کو راجہ اندر کا اکھاڑا بنا دیتے تھے۔ گوپیوں[۱] کا لباس نہایت سادہ ہوتا تھا۔ مگر اس سادگی میں دلفریبی کا ایک عالم نکلتا تھا۔ انکی زیبائش زیادہ تر قدرتی پھُول تھے۔ جو پیشانی پر اور کانوں کے پیچھے باندھے جاتے تھے۔ اور جن کی چاندنی میں اس قدر بہار ہوتی تھی۔ کہ خود چاند بھی انکے معصُوم چہروں کی آب و تاب دیکھنے کو۔ درختوں کی شاخوں میں سے جھانکا کرتا تھا۔ اور اپنی ہلکی ہلکی روشنی انپر رحمت کے سائے کی طرح ڈالدیتا تھا۔

سلہ گوپیوں یعنی گوپوں کی لڑکیوں کے لباس اور آرائش کی نسبت یہ کنایات ایک مصوّر ڈاکٹر گنگولی کی ایک تصویر سے اخذ کئے گئے ہیں۔ راقم

کرشن جی نے قدرت سے شاعرانہ طبیعت پائی تھی۔ برج کے میدان ان کے لئے مشاغل اور تفریحات کی ایک کان تھے۔ پتے پتے میں انہیں معرفتِ حق کا ایک دفتر نظر آتا تھا۔ اور جدھر نظر اُٹھتی تھی۔ اُدھر ایسا قدرتِ کاملہ کا ظہور پاتے تھے۔ کہ طبیعت میں خواہ مخواہ عجیب رُوحانی جذبات پیدا ہوتے تھے۔ تناور درخت اپنی لمبی لمبی شاخوں کو ہاتھوں کی طرح پھیلاتے تھے اور اس قدرت کے شیدائی کو اپنی آغوش میں بلاتے تھے۔ چشمے اپنی لُطف خیز روانی میں وُہ درد بھرا راگ سناتے تھے۔ جسے سوائے درد بھرے دل کے اور کوئی نہیں سنتا۔ کرشن جی اپنے وقت کا بیشتر حصہ جنگلوں کی سیر ہی میں گذارا کرتے تھے۔ کبھی کسی چشمے کے کنارے بیٹھ گئے۔ کبھی کسی درخت پر چڑھ گئے اور اُس کی چوٹی پر بیٹھ کر بانسری بجانے لگے۔ بانسری بجانے میں انہیں خاص کمال تھا۔ ان کے ہاتھ میں یہ بیجان چیز بالکل گویا ہو جاتی تھی۔ اور ایسی آوازیں نکالتی تھی۔ گویا اس کی رُوح پر صدمہ پہنچا ہے۔ نالۂ نے کرشن جی کی بانسری پر ہی صادق آتا تھا۔ وُہ تمام جذبات جو انکی اپنی بیچین طبیعت میں جوش مار رہے تھے۔ بانسری کے چاک سینے میں منتقل ہو جاتے تھے۔ اور وہاں سے ان دردناک صداؤں کے پیرائے میں نکلتے تھے۔ جن کے سُننے سے ہر ایک شخص کا دل موم ہو جاتا تھا۔ انہیں اس کمال کا ہونا کچھ تعجب خیز بات نہ تھی۔ کیونکہ ان کے کان اس موسیقی سے آشنا ہو گئے تھے جو تمام کائنات کی تہ میں ہے۔

مگر یہ سب باتیں خواب وخیال کی طرح گذر گئیں۔ ابھی کرشن جی کی عمر پُورے پندرہ سال کی بھی نہ ہوئی تھی۔ کہ راجہ کنس کو اس بات کی خبر لگ گئی۔ کہ دیوکی اور واسدیو کا فرزند زندہ سلامت ہے۔ اور گوکل میں پرورش پا رہا ہے۔ کنس کے مظالم کی وجہ سے اس کی رعایا سخت ناراض تھی۔ اس لئے اُسکا یہ توحوصلہ نہ ہُوا۔ کہ کھلم کھلا کرشن جی کی موت کا حکم دیدے۔ مگر دل میں یہ ٹھان لی کہ متھرا بلوا کے دھوکے سے مروا ڈالے۔ لیکن خدا کو کچھ اور منظور تھا۔ کرشن جی متھرا آئے۔ لیکن کنس اُنکا بال بھی بیکا نہ کرسکا۔ اُلٹا اُنکے ہاتھ سے خود قتل ہُوا۔ اور تمام ملک ومال انکے ہاتھ میں آگیا۔ مگر اب دُنیاوی جاہ ومرتبہ کی انہیں آرزو نہ تھی۔ گوکل ہی میں انکے خیالات روحانیت

کی طرف راغب ہو گئے تھے۔ اوہام پرستی اور اعتقادات باطلہ سے تو انہیں ابتدا سے نفرت تھی۔ جادون کے تخت پر کنس کے معمر باپ اُگرسین کو بٹھا کر آپ تعلیم و تعلّم میں مشغول ہو گئے۔ اور راج پاٹ چھوڑ کر جنگل میں رہنا اور رشیوں کی صحبت اختیار کر لی۔ اس طرزِ زندگی کو اُنہوں نے صرف دو مرتبہ ترک کیا۔ ایک تو جب راجہ جسانده نے متھرا پر چڑھائی کی تو انہیں چار ناچار اس کی سرکوبی کے لئے جانا پڑا اور دوسرے پانڈوں کے ساتھ ہو کر کوروں اور پانڈوں کی عظیم الشان جنگ میں حصہ لیا۔

اگرچہ ہندو مورخ لکھتے ہیں۔ کہ مہابھارت کی لڑائی میں کرشن جی کسی کی طرف سے ہو کر عملاً نہیں لڑے۔ لیکن اس میں شبہ نہیں کہ انکو پانڈوں سے ہمدردی تھی اور پانڈوں کی فتح زیادہ تر انہیں کی مناسب وقت صلاح اور عمدہ مشورے کی بدولت تھی۔

پانڈوں کی لڑائی سے فارغ ہو کر کرشن جی نے ارادہ کر لیا۔ کہ اب باقیماندہ حصۂ عمر رہبانیت کی زندگی ہی میں گذارینگے۔ اور اس لئے سب خویش و اقارب اہل و عیال کو الوداع کہہ کر جنگل میں نکل گئے۔ مگر اب ان کے اس منزلِ ہستی سے کُوچ کرنے کا وقت آگیا تھا۔ ایک دن ایک درخت کے نیچے سو رہے تھے۔ کہ ایک شکاری کا تیر اتّفاقیہ ان کے پاؤں میں آ لگا۔ شکاری جب اپنی غلطی سے متنبّہ ہوا تو بہت کچھ عذر معذرت کرنے لگا۔ اور دوا درمن کی تدبیر میں مشغول ہوا۔ مگر کرشن جی نے اس کی تشفّی کی اور کہا کہ دوا سے اب کچھ فائدہ نہیں۔ قسمت میں یہ بات یونہی لکھی تھی۔ اس میں تمہارا بھی کچھ قصور نہیں۔ اسی قسم کی باتیں کرتے ہوئے جہانِ فانی سے سدھار گئے۔ اور اپنے پیچھے ایک ایسا نام چھوڑ گئے۔ جو باوجود افترا پردازیوں سے زنگ آلود ہو جانے کے بھی ہمیشہ تک کندن کی طرح چمکتا رہیگا۔

کرشن جی کی تعلیم زیادہ تر بھاگوت گیتا میں شامل ہے۔ اور یہ وہ نصیحت آمیز نظم ہے جو کرشن جی نے ارجن کو میدانِ جنگ میں سُنائی تھی۔ اس نظم کا فلسفہ بدھ مذہب کے فلسفے سے بہت کچھ ملتا جلتا ہے اور اس لئے اس کا سمجھنا کچھ آسان کام نہیں۔ مگر علاوہ فلسفے کے اس میں بہت سے کارآمد نصائح اور بھی ہیں۔ چونکہ فی الحال ہمارا مقصد روحانیت کے جھگڑوں میں پڑنے کا نہیں اس لئے کرشن جی کی تعلیم

سے قطع نظر کرتے ہیں -

ہاں ایک بات اس میں ضرور ہمارے لئے دلچسپی کا موجب ہے - وُہ یہ کہ اس کا میلان وحدانیت کی طرف بہت زیادہ ہے -

بہرحال کرشن جی کی تعلیم کی نسبت جو جس کا جی چاہے رائے رکھے مگر اس بات کے ماننے میں تو شاید کسی منصف مزاج شخص کو تامل نہ ہوگا - کہ وُہ دنیا کے برگزیدہ آدمیوں میں سے ایک تھے وُہ صفات جو ان میں پائی جاتی تھیں - ہر ایک بشر کے حصے میں نہیں آتیں - بلکہ خدا کی طرف سے خاص خاص لوگوں ہی کو عطا ہوتی ہیں - ؎ ایں شجاعت بزورِ بازو نیست + تا نہ بخشد خدائے بخشندہ +

اختر دہلوی

جو تصویر آج ناظرینِ مخزن رسالے کے شروع میں دیکھتے ہیں - وُہ کئی لحاظ سے دلچسپ ہے - یہ ایک مجمعِ احباب ہے - سوائے شیخ عبد العزیز صاحب بی - اے ایڈیٹر اخبار آبزرور لاہور کے اس مجمع کے سب ارکان ایسے ہیں جن کے نام اور مضامین مخزن کے صفحات میں ناظرینِ مخزن نے بارہا پڑھے ہیں - میر نیرنگ صاحب بی - اے کا حسنِ بیان اُنکے کلام کی پختگی اور ان کا فلسفیانہ تخیل اکثر دلوں کے لئے تنہائی میں باعثِ تسکین ہوا ہے - زندگی کے بعض مسائل پر جو روشنی انکی شمعِ فکر نے ڈالی ہے اور جو افسردگی آمیز مسرت اُنکے اشعار پڑھنے سے پیدا ہوتی ہے - انکی خصوصیت انداز کی کافی شہادت ہے - مرزا اعجاز حسین صاحب اعجاز بی - اے وکیل انبالہ کی نظمیں اپنی شیرینی اور تاثیر سے پڑھنے والوں کے دلوں کو متاثر کر چکی ہیں - میاں عبد العزیز صاحب ایم - اے اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر پنجاب کے مضامینِ نثر ہمیشہ نتیجہ خیز اور خوبیٔ عبارت اور بندشِ فقرات کے لحاظ سے قابلِ غور اور لائقِ تقلید ہوتے ہیں - مولوی عبد الرشید چشتی بی - اے (مرحوم) کے مضامین مرحوم کی زندگی ہی میں مقبول ہو چکے تھے - اور اُن کی وفات کے بعد اُن کے مسوداتِ نظم و نثر ان اوراق میں حسرت و ارمان کے ساتھ شائع کئے گئے - یہ ایک غنچہ تھا کہ بن کھلے مُرجھا گیا - یہ مرقع ہم کو اتفاق سے مل گیا ہے - چونکہ یہ سب صاحب آپس میں رشتۂ محبت و صداقت سے وابستہ ہیں - اس لئے عین مناسب ہے کہ ان کی تصویر یکجا چھاپی جائے - دُوسری بات اس تصویر میں یہ ہے کہ سب کے سب دوست دوستانہ بے تکلفی کی بنا پر اس تصویر میں بڑی سادگی کی حالت میں ہیں +

زندگی کی محبّت

جُوں جُوں عمر گذرتی ہے اگرچہ اُس کے ساتھ ساتھ ہی ہماری زندگی کے مقسُومہ حظائظ کم ہوتے جاتے ہیں مگر زندہ رہنے کی خواہش بڑھتی رہتی ہے۔ وُہ خطرات جنہیں جوانی میں ہم حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے اب بڑھاپے میں نئی خوفناک صُورتیں بنا کر ہمارے سامنے آتے ہیں۔ عمر کے ساتھ ساتھ ہی دُور بینی بھی بڑھتی جاتی ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہمارا دِل خوف کا دائمی مسکن ہو جاتا ہے۔ اور عمر کا باقی حصّہ ایسی بیکار کوششوں میں صرف ہوتا ہے جن سے ہمارا مقصُود یا تو انجامِ حیات (موت) سے بچنا یا حیاتِ ابدی کا حصُول ہوتا ہے۔

ہماری فطرت میں عجیب تناقض واقع ہوا ہے جس سے عُقلا بھی مستثنےٰ نہیں۔ اگر ہم اپنی آئندہ زندگی کا مقابلہ اپنی گذشتہ زندگی سے کریں تو منظر نہایت ہیبت ناک دکھائی دیتا ہے۔ تجربہ بتلاتا ہے کہ گذشتہ حظائظ سے ہمیں کوئی سچی خوشی حاصل نہیں ہوئی۔ اور احساس یقین دلاتا ہو کہ گذشتہ حظائظ آئیندہ کی لذتوں سے زیادہ مزیدار تھے۔ مگر تجربے اور احساس دونو کا عمل بے سُود ہوتا ہو۔ اُمید جو اِن دونوں سے زیادہ قوی ہے مستقبل کے منظر کو خیالی خوبصُورتی سے منوّر کرتی ہو اَور کوئی نہ کوئی خوشی اِس وسیع میدان میں ایسی نظر آجاتی ہے جو ہمیں دُور سے اشارہ کرتی ہو کہ "اِدھر میری طرف چلے آؤ"۔ پس ایک قمار باز کی طرح جتنا ہم ہارتے جاتے ہیں۔ ہماری ہر ایک ناکامیابی ہمیں اَور زیادہ شوق دلاتی ہے کہ ہم اِس قمار کو جاری رکھیں۔

تو پھر میرے عزیز! یہ روز افزوں (زندہ رہنے کی) خواہش کس طرح پیدا ہوتی ہے۔ جو ہماری عمر کے ساتھ ساتھ بڑھتی رہتی ہے؟ یہ بات کیسے ہوتی ہے کہ ہم اپنے وجُود کے قائم رکھنے کی زیادہ کوشش کرتے ہیں اور پھر اس وقت جب اس کا ہونا نہ ہونا برابر ہوتا ہے (بڑھاپے میں)؟ کیا یہ ہماری فطرت ہے جو بقائے نسلِ انسان کے لئے ہمارے زندہ رہنے

کی خواہش کو زیادہ۔ اور ہمارے حظائظِ زندگی کو کم۔ کرتی رہتی ہے۔ چونکہ یہ فطرت حواس کو ہر ایک خوشی سے محروم کر دیتی ہے۔ "قوتِ متخیلہ کو اس محرومی میں بلند پروازی کا خاصا سامان مل جاتا ہے۔ ایک ضعیف العمر کے لئے جو صدہا قسم کی کمزوریوں کے بوجھ میں دبا ہوا ہو زندگی وبالِ جان ہو جاتی ہے۔ اگر وہ موت سے صرف اتنا ہی خائف ہو جتنا جوانی میں تھا۔ گھٹتی ہوئی طاقت کے بیشمار مصائب اور اُن خوشیوں کا مزا جو گذر چکی ہیں دفعتہً اس کو آمادہ کر دیگا۔ کہ اس مصیبت کی زندگی کا اپنے ہی ہاتھوں سے خاتمہ کر دے۔ مگر خوش اتفاقی سے اس کی موت سے، لاپروائی اُس کا ساتھ چھوڑ دیتی ہے۔ اور اس وقت جبکہ یہ نہایت نقصان رساں ثابت ہوتی۔ اور زندگی اُسی نسبت سے جب اسکی اصلی قیمت کچھ نہیں رہتی ایک خیالی قیمت حاصل کر لیتی ہے۔

ہمارے گرد کی ہر ایک شے سے ہمارا تعلق جوں جوں ہم اُن سے زیادہ اور زیادہ آشنا ہوتے جاتے ہیں بڑھتا جاتا ہے۔ ایک فرانسیسی حکیم کا قول ہے کہ "مجھے ہرگز گوارا نہیں ہے کہ مَیں ایک ایسے کھمبے کو جس سے مَیں ایک عرصہ سے آشنا ہوں اُکھڑا ہوا دیکھوں"۔ پس دل جب مختلف چیزوں سے مانوس ہو جاتا ہے تو وُہ خود بخود ان کے دیکھنے کا مشتاق ہوتا ہے۔ اُن سے مِلتا تو ہے عادتاً۔ مگر جُدا ہوتا ہے طوعاً و کرہاً اِسی وجہ سے ضعیف العمر اکثر ہر ایک قسم کی ملکیت کے حریص ہوتے ہیں۔ انہیں دُنیا سے اور کُل مخلوق سے محبت ہوتی ہے۔ انہیں زندگی سے اور اس کے تمام منافع سے محبّت ہوتی ہے۔ اِس لئے نہیں کہ وُہ اِس سے حظ اُٹھاتے ہیں بلکہ صرف اِس لئے کہ وُہ اِس سے مانوس اور دیر سے آشنا ہوتے ہیں۔

شنتوانگ جو معصوم کے نام سے مشہور ہے جب چین کے تخت پر بیٹھا تو اُس نے حکم دیا کہ تمام قیدی جو سابقہ بادشاہوں کے عہد میں بے انصافی سے قید خانے میں اسیر ہیں فوراً رہا کر دیے جائیں۔ اِس آزاد کردہ تعداد میں سے جو بادشاہ کے شکریئے کے لئے آئے ایک بوڑھا بھی تھا۔ جو بادشاہ کے قدموں پر گر پڑا اور کہنے لگا۔ "اَے چین کے بڑے مالک مجھ کمبخت کی طرف دیکھ! جس کی عمر اس وقت پچاسی برس کی ہے اور میں بائیس برس کی عمر میں جیلخانے میں قید کیا گیا تھا۔

مجھ بیگناہ کو بغیر اس کے کہ میرے الزام لگانے والے میرے سامنے بھی لائے جاتے۔ قید خانے میں بھیجدیا گیا۔ مَیں پچّاس برس سے زیادہ تنہائی اور اندھیرے میں رہا ہُوں اور اس مصیبت سے مانُوس ہو گیا ہُوں۔ اب اس سُورج کی چمک سے جس کا دیدار تیری بدولت مجھے نصیب ہُوا میری آنکھیں چُندھیاتی ہیں۔ مَیں بازاروں میں اِدھر اُدھر پھرتا رہا۔ کہ شاید کوئی دوست ملجائے۔ جو میری مدد کرے مجھے تکلیف سے بچائے اور مجھے پہچانے۔ لیکن میرے دوست اور میرا خاندان سب کے سب مر گئے اور میرا کوئی بھی شناسا نہ رہا۔ اَے شنوانگ مجھے اجازت دے کہ مَیں اپنی بقیہ مصیبت کی زندگی بھی اسی قید خانے میں گزاروں۔ میری اندھیری کوٹھری کی دیواریں مجھے اِن شان وشوکت کے محلوں سے زیادہ پیاری معلوم ہوتی ہیں۔ میری زندگی کے دن اب تھوڑے ہی سے باقی رہ گئے ہیں۔ اور میں نہایت ناخوش اور رنجیدہ رہونگا اگر مَیں اسی قید خانے میں جس سے تو نے رہا کیا ہے اور جس میں اپنی جوانی کے دن مَیں نے گذارے ہیں واپس نہ بھیجدیا جاؤں"۔

جیسا کہ یہ ضعیف العمر قید کا شائق تھا اسی طرح ہم بھی زندگی کے ہیں۔ ہم اس قید خانے (دُنیا) سے مانوس ہو گئے ہیں۔ اگرچہ ہم چاروں طرف ناراضگی سے نظر کرتے ہیں اور اس مسکن سے بیزار ہیں مگر ہماری قید کی طوالت ہماری اس قید خانے کی اُلفت کو بڑھاتی ہے۔ جن درختوں کو ہم نے لگایا ہو۔ جن مکانوں کو ہم نے بنایا ہے اور وُہ اولاد جن کو ہم نے جنا ہے۔ سب کے سب ہماری دُنیا سے بندش کو تنگ کرتے ہیں۔ اور اِن سے علیحدگی تلخ معلوم ہوتی ہے۔ زندگی نوعمروں کو ایک نئے آشنا کی طرح لُبھاتی ہے۔ کیونکہ وُہ آشنا جسکی صُحبت سے سیری نہ ہوئی ہو ہمیشہ پیارا اور بھلا معلوم ہوتا ہے۔ پس زندگی مثل ایک نئے حبیب کی صُحبت کے دلکش معلوم ہوتی ہے۔ اگرچہ اس کی پروا اِس صُورت میں بھی کم کیجاتی ہے۔ ہمیں جو بُوڑھے ہو گئے ہیں زندگی مثل ایک دیرینہ دوست کے معلوم ہوتی ہے جس کی خوش مذاقیوں کا لُطف ہم پچھلی صُحبتوں میں اُٹھا چکے ہیں۔ پس کوئی نئی بات ایسی پیش نہیں آتی جو تعجب انگیز ہو۔ تاہم ہمیں زندگی سے محبّت ہوتی ہے۔ اگرچہ ہم ہر ایک لذّت سے محروم ہوں لیکن ہماری اس کے ساتھ محبّت بدستُور رہتی ہو۔ ضائع ہونے والے سرمائے کی حفاظت ہم روز افزوں احتیاط

اور کفایت شعاری سے کرتے ہیں اور اس کی مہلک جُدائی کے سبب تمام صدمات کی تکلیفیں جھیلتے ہیں۔

سر فلپ مورڈانٹ ایک نوجوان۔ خوبصورت۔ دلیر اور سچّا انگریز تھا اوّل تو اُس کی اپنی ہی ذاتی جائداد بہتیری کچھ تھی اور پھر اس پر بادشاہ کا منظورِ نظر ہو گیا تھا۔ جو امر بذاتہٖ ایک دولتِ عظمیٰ سے کم نہ تھا۔ زندگی نے اپنے تمام (خوشیوں کے) خزانے اس کے سامنے کھولدیئے۔ اور آئندہ خوشیوں کے ایک غیر متناہی سلسلے کا یقین دلایا۔ اُس نے آگران لذائذ کا مزا چکھا اور فوراً اُن سے متنفّر ہو گیا۔ زندگی سے اُسے نفرت ہو گئی۔ اُسی دائرے کے اندر بار بار پھرنا اُسے بارِ خاطر گذرا۔ اُس نے ہر لذّت کا مزا چکھا اور دیکھا کہ دُوسری دفعہ اس میں وُہ مزا ہی نہیں رہتا۔ اُس نے اپنے دِل سے چلّاکر کہا "جب جوانی میں ہی زندگی ایسی بدمزہ ہے تو بڑھاپے میں کیا حالت ہوگی؟ جب اِس وقت اس میں کچھ لُطف نہیں تو اُس وقت تو یقیناً وبالِ جان ہو جائیگی"۔ اس خیال نے اُس کے افکار کو تلخ بنا دیا۔ یہانتک کہ اُس نے اپنی گمراہ عقل کی ہدائت سے اس جھگڑے کا فیصلہ پستول سے کر دیا۔ اگر اس اپنی ذات پر دھوکہ کھانے والے شخص کو یہ معلوم ہوتا۔ کہ عُمر کے بڑھنے ہی سے ہماری زندگی کی مُحبّت زیادہ ہوتی جاتی ہے تو وُہ شاید بڑھاپے کا استقبال بلاخوف کرتا۔ وُہ زندہ رہنے کی جُرأت کرتا۔ اور اپنی آئندہ محنت سے اِس سوسائٹی کی خدمت کرتا جس کو اُس نے تنگدلی سے خیرباد کہہ کر نقصان پہنچایا۔

(ترجمہ از گولڈ سمتھ)

لطیف احمد (از پانی پت)

ایک مُسکراہٹ۔ ایک مسکراہٹ کی قیمت کون بتا سکتا ہے؟ دینے والے کا اس میں کچھ خرچ نہیں ہوتا۔ لیکن پژمردہ خاطر۔ گنہگار۔ افسردہ دل اور بیکس کے حق میں یہ انمول ثابت ہوتی ہے۔ اس سے کینے کی آگ بُجھ جاتی ہے۔ بدمزاج رام ہو جاتے ہیں۔ نفرت محبت سے۔ انتقام مہربانی سے بدل جاتا ہے۔ اور تنگ و تاریک راستے۔ جواہرات کی روشنی سے جگمگا اُٹھتے ہیں۔ خندہ پیشانی۔ نیک دل انسان۔ جانی دوست۔ محبت کرنیوالے بھائی۔ تابعدار بیٹے اور مہربان شوہر کی نشانی ہے۔ اس سے حُسن دوبالا ہو جاتا ہے۔ بدصُورتی پر پردہ پڑ جاتا ہے۔ اور حسین عورت بہشتی فرشتوں سے مشابہ ہو جاتی ہے۔

اہلِ قلم کی اپیل

(اہلِ رسالہ کی خدمت میں)

آج کل چشمِ بدوُور رسالوں کی پلٹنوں کی پلٹنیں کھڑی ہو گئی ہیں اور ہم غریب اہل قلم پر وُہ دھواں دھار چاند ماری ہو رہی ہے کہ الامان والحفیظ - ناچار تابِ مقاومت نہ لا کر ہم مخزن کی آڑ میں پناہ لیتے ہیں اور اس رسالے کے کمان افسر کی خدمت میں بہ ادب عرض کرتے ہیں کہ ع اَے صبا ایں ہمہ آوردۂ تست - رسالوں کی تعداد میں یہ روز افزوں ترقی ایک لحاظ سے تو فال نیک ہے اور اس سے ادب اُردو کی ترقی کی توقع ہوتی ہے مگر ایامِ غدر کی سی بیقاعدہ فوج سے قلعہ کشائی کی اُمید رکھنا کوئی عقلمندی کی بات نہیں - بندوق میں گولی نہیں جھولے میں روٹی نہیں - قواعد پریٹ کی فرشتوں کو خبر نہیں اور چلے میرے جنگی کشور کشائی کو ع ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند -

شیخ جہانیاں جہاں گشت نے جب پہلے پہل مخزن نکالا تو خُلق سے مُروّت سے حیلے سے فریب سے راز و نیاز سے ساز و باز سے ہم سب سادہ لوح اہل قلم کے مچلکے لکھوا لیئے اور عہد و پیمان کی زنجیروں سے ایسا جکڑا کہ کسی میں جُنبش کی سکت باقی نہ رہی - اِدھر شیخ کی چرب زبانی اُدھر مخزن کی ہولستائی غرض کچھ ایسے اسباب جمع ہو گئے کہ کلکتے سے پشاور اور کشمیر سے حیدر آباد دکن تک سب اہلِ قلم شیخ کے مسخر ہو گئے - حضرت تو اپنا جادو منتر چلا کر چلتے بنے اور ساتوں سمندر سے پار ہو گئے مگر منتر اپنا کام کر رہا ہے اور کرتا رہیگا -

مخزن کے دیکھا دیکھی درجنوں رسالے نکل آئے - اور کوڑیوں نکلتے چلے آتے ہیں - جو نیا رسالہ نکلتا ہے اس کی ایک کاپی بڑے لمبے چوڑے اشتیاقیہ خط کے ساتھ ہمارے پاس بھیجی جاتی ہے اور قلمی اور جیبی امداد کا تقاضا کیا جاتا ہے - سچ پُوچھو تو ہم کچھ ایسے بڑے لکھنے والے بھی نہیں - ہماری بندشیں ڈھیلی قافیے غلط اور نیم انگریزی نیم فارسی سٹایل آدھا تیتر آدھا بٹیر کا مصداق پایا جاتا ہے -

مگر ہمارے قدردان ہیں کہ لٹو ہوئے جاتے ہیں ہم اہلِ قلم کی آمدنی عموماً سات سے ستر روپیہ ماہوار تک ہوتی ہے اس سے جس کی زیادہ آمدنی ہو وُہ اہلِ دولت ہے اہلِ قلم نہیں۔ اور جس دماغ میں نشۂ دولت ہو وہاں سے ذوقِ علمی اپنا بستر اُٹھا لیا کرتا ہے۔ اور اہلِ دولت کی تصنیفات میں وُہی مزہ آتا ہے جو .... صاحب کی غزلوں میں۔ حاصل کلام یہ ہے کہ ہم لوگ دولتمند نہیں اور جب دولتمند نہیں تو ایک کوڑی رسالے جو ہمارے تخمینہ میں پانچ کوڑی کے بھی نہیں کیونکر خریدیں۔ اور اس کے ساتھ ہی اگر ہم قلمی امداد بھی ان سب کی کریں تو دُنیا کے اَور کاروبار کس وقت کریں اور کاروبار چھوڑ دیں تو کھائیں کہاں سے۔ آپ کے اشتہار سے معلوم ہوتا ہے کہ دُنیا و مافیہا کی اصلاح کا بارِ امانت آپ نے اُٹھا لیا ہے مگر سچ فرمائیے کہ اس رسالے کی فتوحات سے آپ اپنا پیٹ نہیں پالتے۔ کیا یہ انصاف ہے کہ آپ کی ضیافتِ طبع اور ضیافتِ شکم کے لئے ہم خونِ جگر بہائیں اور اس کا کچھ معاوضہ نہ ہو آج کل رسالوں کی کثرت کی وجہ سے ہمارے وقت کا ایک معتدبہ حصّہ انکاری خطوط میں ضائع ہوتا ہے مگر صاحبِ رسالہ اور صاحبِ اخبار اس انکار کو تسلیم نہیں کرتے اور مکرّر سہ کرر لکھتے ہیں جس میں کچھ نرمی ہوتی ہے کچھ گرمی کچھ دھمکی کچھ تھپکی۔ یہ بھی شکایت کی جاتی ہے کہ "مخزن کے لئے تو آپ کے پاس وقت ہے مگر ہمارے لئے نہیں ہم بھی تو آپ کے پُرانے نیازمندوں میں ہیں"۔ یہ آپ کا فرمانا بالکل بجا ہے اور آپ کی خدمت میں ہم کو بھی نیازمندی کا دعویٰ ہے۔ مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ مخزن یا کسی اور پرچے کے ساتھ جو ہمارا سابقہ معاہدہ ہے اسکو اس وجہ سے فسخ کر دیں کہ آپ نے بھی ایک رسالہ نکالا ہے جس کی قلمی امداد کی ہمیں فرصت نہیں اور جس کا پڑھنا شاید مُفت میں بھی ہم کو گوارا نہیں۔

بندہ نوازا! اگر پولٹیکل اکانومی کے اصُولِ تقسیم محنت کو آپ ملاحظہ فرمائینگے تو آپ کو تسلیم کرنا پڑیگا کہ ہم غریب اہلِ قلم پر آپ بیجا سختی کر رہے ہیں۔ اگر آپ خریداری کے لئے ہم کو لکھتے ہیں تو صاف صاف لکھئے اور قلمی امداد کا معاملہ علیحدہ رکھئے۔ اگر ہمارے پاس کافی ٹکے ہونگے اور ہم آپ کے رسالے یا اخبار کو اس قابل سمجھیں گے کہ کچھ ٹکے اسپر خرچ کئے جائیں تو آپ کی

خدمت میں خریداری کی درخواست بھیجدینگے۔ ورنہ ہرگز آپ اپنا قیمتی رسالہ نہ بھیجیں۔ اور اگر آپ قلمی امداد چاہتے ہیں تو اس کا اقل معاوضہ یہ ہے کہ آپ پرچہ مُفت بھیجیں۔ آپ کے پرچے کی سالانہ قیمت دو تین روپئے ہے اور اگر ہمارے ریختہ قلم کی اتنی بھی قیمت نہیں تو تُف ہے ہماری قلم رانی پر اور حیف ہے آپ کی قدردانی پر۔ یہ دُوسری بات ہے کہ کوئی اہل قلم اپنی رضامندی سے کسی پرچے کی قیمت ادا کرتا رہے مگر ویلیو پے ایبل پارسل بھیجنا اور قلمی امداد کے لئے اصرار کرنا سخت بے انصافی ہے۔ ممکن ہے کہ بعض اہل قلم جن میں ایک بندۂ درگاہ بھی ہے قلمی امداد کے معاوضے میں مُفت پرچہ لینا بھی پسند نہ کریں اِس لئے اس بات کا بھی شروع میں تصفیہ ہو جانا چاہئے۔ اور جب کوئی بھلا مانس کسی مجبوری کی وجہ سے اِنکار کر دے تو اس کو قبول فرما لیا کریں اور خط وکتابت کو طول دیکر بیچارے قلم زن کو کج خلقی یا سکوت پر مجبور نہ کیا جائے۔ یہ اعلان عام اس غرض سے شائع کیا جاتا ہے کہ اہل رسائل و اہل اخبار اہل قلم کے حقوق سے واقف ہوں اور یک طرفہ ڈگری اُن پر نہ کیا کریں *

راقم بندہ قلم باز خانؔ

مُطالعۂ تواریخ

مُطالعۂ تواریخ مذہب کے بعد انسان کی اصلاح کے واسطے کوئی شَے علم سے بڑھ کر نہیں۔ اگر فلسفے کی خاردار جھاڑیوں کو ہاتھ لگاتے ہُوئے ڈرتے ہو تو مطالعہ تواریخ میں تو کوئی اندیشہ نہیں۔ اِس سے بڑھکر آسان کام کیا ہوگا۔ جس میں تفریح اور فائدہ دونوں موجُود ہیں۔ ایسے شخص کو دیکھ کر ہمیں کیسا افسوس ہوتا ہے جسکی گردن اکڑ گئی ہو اور پیچھے مُڑ کر نہ دیکھ سکے۔ لیکن وُہ شخص جو گذشتہ کارہائے نمایاں سے بے خبر ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر قابل رحم ہے۔ تواریخ نوجوان کو بغیر جھریوں اور سفید بالوں کے بُڈھا بنا دیتی ہے۔ اس سے بڑھاپے کا تجربہ بغیر بڑھاپے کی تکلیفوں کے حاصل ہو جاتا ہے۔ یہ صرف ماضی کو حال ہی نہیں بنا دیتی۔ بلکہ آئندہ کی بھی خبر دیتی ہے۔ کیونکہ اس دُنیا میں کوئی بالکل نیا واقعہ نہیں پیش آتا۔ ہر ایک چیز ایسی ہی نئی ہوتی ہے جیسے کہ نیا چاند۔ جو اصل میں محض پُرانا چاند بدلی ہُوئی صورت میں ہوتا ہے۔ اسی طرح پُرانے واقعات بھی بار بار نئی نئی اور مختلف صُورتوں میں ظاہر ہوتے رہتے ہیں۔

ریویو

معین الآثار۔ المعروف بہ تاریخ آگرہ ۔ موسومۃ الصدر کتاب کے مصنف محمد معین الدین صاحب اکبرآبادی جنرل سپرنٹنڈنٹ کلکٹری متھرا ہیں ۔ اس سرتاجِ عمارات روضۂ تاج محل اور آگرے کی دیگر مشہور قدیم عمارات کا تاریخی حال وکیفیت نہایت شرح وبسط کے ساتھ رقم کی گئی ہے ۔ مصنف نے حالات اور واقعات کے فراہم کرنے میں بہت کچھ کوشش کی ہے اور متعدد انگریزی فارسی اُردو کتب سے مدد لی ہے علاوہ معنوی خوبیوں کے ظاہری حیثیت بھی دلکش ہے۔ ہاف ٹون تصاویر کی خوبصورتی ونفاست خصوصاً قابلِ تعریف ہے۔ یہ کتاب بہ قیمت **عہ** مصنف (یا محمد فخرالدین صاحب ساکن کچہری گھاٹ آگرہ) سے مل سکتی ہے

قند پارسی ۔ محمد احسن اللہ خاں صاحب ثاقب رئیس آگرہ نے ملک میں زبانِ فارسی کا مذاق پھیلانے کے لئے علیگڈھ سے یہ ماہوار رسالہ شائع کرنا شروع کیا ہے ہمیں کامل امید ہے کہ جناب ثاقب اس رسالے کو کامیاب بنانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرینگے ۔ پہلا نمبر خاصہ دلچسپ ہے۔ گر مضامین کے اسلوب و طرزِ تحریر میں قدیم رنگ کی جھلک پائی جاتی ہے ۔ اگر ایران کی موجودہ زبان کے بھی کچھ نمونے ہوں تو یقین ہے کہ رسالے کی دلچسپی دوبالا ہوجائیگی ۔ حجم سولہ صفحے علاوہ سرورق اور لکھائی چھپائی عمدہ ۔ چندہ سالانہ **عہر** ۔ درخواست بنام ایڈیٹر رسالہ "قند پارسی" علیگڈھ ہو ۔

جنگِ روس و جاپان ۔ اس نام کی ایک کتاب مطبع مطلع العلوم مراد آباد سے شائع ہوئی ہے جسے سید محمد ابراہیم صاحب عجمی نے ترتیب دیا ہے ۔ چونکہ ہر ایک تعلیم یافتہ شخص کو اس جنگ سے دلچسپی ہے اس لئے اس کتاب کا مطالعہ پبلک کے لئے خالی از مفاد نہ ہوگا ۔ جنگ کے اسوقت تک کے حالات خوب وضاحت سے لکھے ہیں ۔ اور علاوہ ازیں یہ کتاب جنگ کے متعلق ہر قسم کی واقفیت مہیا کرتی ہے ۔ قیمت **۸ر** ۔ درخواست بنام ایڈیٹر صاحب اخبار نیر اعظم مراد آباد ہونی چاہیئے

جُگنو

جگنو کی روشنی ہے کاشانۂ چمن میں — یا شمع جل رہی ہے پھولوں کی انجمن میں
آیا ہے آسماں سے اُڑ کر کوئی ستارہ — یا جان پڑ گئی ہے مہتاب کی کرن میں
یا شب کی سلطنت میں دن کا سفیر آیا — غربت میں آ کے چمکا گمنام تھا وطن میں
تُکمہ کوئی گرا ہے مہتاب کی قبا کا — ذرہ ہے یا نمایاں سورج کے پیرہن میں
حُسنِ قدیم کی یہ پوشیدہ اِک جھلک تھی — لے آئی جس کو قدرت خلوت سے انجمن میں
چھوٹے سے چاند میں ہے ظلمت بھی روشنی بھی — نکلا کبھی گہن سے آیا کبھی گہن میں

پروانہ اک پتنگا جُگنو بھی اِک پتنگا
وُہ روشنی کا جویا یہ روشنی سراپا

ہر چیز کو جہاں میں قدرت نے دلبری دی — پروانے کو تپش دی جُگنو کو روشنی دی
رنگیں نوا بنایا مُرغانِ بے زباں کو — گل کو زبان دیکر تعلیمِ خامشی دی
نظارہ شفق کی خوبی زوال میں تھی — چمکا کے اس پری کو تھوڑی سی زندگی دی
رنگیں کیا سحر کو بانکی دلہن کی صورت — پہنا کے لال جوڑا شبنم کی آرسی دی
سایۂ دیا شجر کو پرواز دی ہوا کو — پانی کو دی روانی موجوں کو بیکلی دی
اِک مُشتِ گل میں رکھا احساس کا شرارہ — اِنساں کو آگہی کیا ظلمت کو چاندنی دی

یہ امتیاز لیکن اک بات ہے ہماری
جُگنو کا دن وُہی ہے جو رات ہے ہماری

حُسنِ ازل کی پیدا ہر چیز میں جھلک ہے — انساں میں وُہ سخن ہے غنچے میں وُہ چٹک ہے
یہ چاند آسماں کا شاعر کا دِل ہے گویا — واں چاندنی ہے جو کچھ یاں درد کی کسک ہے

انداز گفتگو نے دھوکے دیئے ہیں ورنہ ۔ نغمہ ہے بوئے بلبل بو پھول کی چہک ہے
کثرت میں ہو گیا ہے وحدت کا راز مخفی ۔ جگنو میں جو چمک ہے وہ پھول میں مہک ہے

یہ اختلاف پھر کیوں ہنگاموں کا محل ہو
ہر شے میں جبکہ پنہاں خاموشیٔ ازل ہو

اقبال

صُبح کا سِتارہ

لطفِ ہمسائیگیٔ شمس و قمر کو چھوڑوں ۔ اور اس خدمتِ پیغامِ سحر کو چھوڑوں
عارضی حسن ہے دشمن ہے مرا نورِ سحر ۔ یہ ملا خسروِ خاور کا پیامی بن کر
میرے حق میں تو نہیں تاروں کی بستی اچھی ۔ اس بلندی سے زمیں والوں کی پستی اچھی
آسماں کیا عدم آباد وطن ہے میرا ۔ صبح کا دامنِ صدچاک کفن ہے میرا
میری قسمت میں ہے ہر روز کا مرنا جینا ۔ ساقیٔ موت کے ہاتھوں سے صبوحی پینا
نہ یہ خدمت نہ یہ عزت نہ یہ رفعت اچھی ۔ اِس گھڑی بھر کے چمکنے سے تو ظلمت اچھی

میری قدرت میں جو ہوتا تو نہ اختر بنتا
قعرِ دریا میں چمکتا ہوا گوہر بنتا

واں بھی موجوں کی کشاکش سے جو دل گھبراتا ۔ چھوڑ کر بحر کہیں زیبِ گلو ہو جاتا
ہے چمکنے میں مزہ حسن کا زیور ہو کر ۔ زینتِ تاجِ سرِ بانوئے قیصر ہو کر
ایک پتھر کے جو ٹکڑے کا نصیبہ جاگا ۔ خاتمِ دستِ سلیماں کا نگیں بن کے رہا
ایسی چیزوں کا مگر دہر میں ہے کام شکست ۔ ہے گہرہائے گرانمایہ کا انجام شکست
زندگی وہ ہے کہ جو ہو نہ شناسائے اجل ۔ کیا وہ جینا ہے کہ ہو جس میں تقاضائے اجل

ہے یہ انجام اگر زینتِ عالم ہو کر
کیوں نہ گر جاؤں کسی پھول پہ شبنم ہو کر

کسی پیشانی کے افشاں کے ستاروں میں ہوں
کسی مظلوم کی آہوں کے شراروں میں ہوں
اشک بن کر سرِ مژگاں سے اٹک جاؤں میں
کیوں نہ اس بیوی کی آنکھوں سے ٹپک جاؤں میں
جس کا شوہر ہو رواں ہو کے زرہ میں مستور
سوئے میدان وغا حبِّ وطن سے مجبور
یاس و اُمید کا نظارہ جو دکھلاتی ہو
جس کی خاموشی سے تقریر بھی شرماتی ہو
جس کو شوہر کی رضا تابِ شکیبائی دے
اور نگاہوں کو حیا طاقتِ گویائی دے
زرد رخصت کی گھڑی عارضِ گلگوں ہو جائے
کششِ حُسن غمِ ہجر سے افزوں ہو جائے
لاکھ وہ ضبط کرے پر میں ٹپک ہی جاؤں
دل سے مانندِ مئے تند چھلک ہی جاؤں
صبر کا خون نکل آیا ہو رل کر مجھ میں
ایک طوفان ہو افکار کا مضمر مجھ میں

خاک میں مل کے حیاتِ ابدی پا جاؤں
عشق کا سوز زمانے کو دکھاتا جاؤں

اقبال

وجد و سماع

وجد میں ہے پیکرِ خاکی کہ ہو عرش آشیاں
شہپرِ پروانہ ہے کھولے ہوئے شہبازِ جاں
بند آنکھیں ہیں کمیں گاہیں پئے عنقا شکار
رقصِ صوفی آہوئے رم خوردہ ہے ضیغم سوار
جو کشش بیتابی ہے - موجِ عالم آشوبی نہیں
ہاں - لگدکوبِ علائق ہے یہ پاکوبی نہیں

بیقراری ہے دلِ بیتاب کی منزل رساں — دستِ بالا کشتیِ دل کے لئے ہے بادباں

مجلسِ وجد و سماعِ جاں فشاناں بوتہ وار — قلب سے کرتی ہے نقدِ قلب کو کامل عیار

یہ وہ آتش ہے کہ اپنی آپ جاتی ہے سُلگ — یہ وہ آتش ہے کہ اس سے صاف الگ تلچھٹ الگ

یہ وہ آتش ہے دلِ دریا میں بھی ہے اس کا گھر — شاہدِ رقصِ روانی موجِ دریا سر بسر

ہے اِسی شُعلے سے روشن رقصِ فانوسِ فلک — پردۂ رقصِ صنوبر میں ہے رقصاں خاک تک

اُشتر و آہو و گاؤ و اژدہا و مار و مور — دم بخود ہیں وادی و کہسار و دشت و خاکِ گور

چہچہے ہیں طائرانِ باغ کے اس پر گواہ — وجد و حال و کیف سے لبریز ہے یہ خانقاہ

خامشی در پردہ ہے سازِ نوائے بیخودی — بیخودانہ ہے یہاں جو ہے صدائے بیخودی

بے بجائے آپ بجتا ہے یہ سر آہنگ ساز — چھیڑتی ہے دل نفیرِ نَے یہاں بے نَے نواز

بے مَے و ساقی سرورِ بزم نوشا نوش ہے — بے نَے و مطرب سرود پردہائے گوش ہے

نغمہ پرواز ہوائے شوق ہے دمسازِ سیل — تارِ جاں پر زخمۂ مضراب ہے آوازِ سیل

یعنی پابندِ صدائے ساز یہ مستی نہیں — بے سر مستی مگر ہنگامۂ ہستی نہیں

قطرہ تا دریا ہے سرگرداں اسی سر جوش سے — ذرّہ تا خورشید ہے رقصاں اسی سر جوش سے

ہے گلِ یک جلوہ برقِ خرمنِ صد شمعِ طُور — اِک تبسّم ہے بہارِ صد گلستانِ ظہور

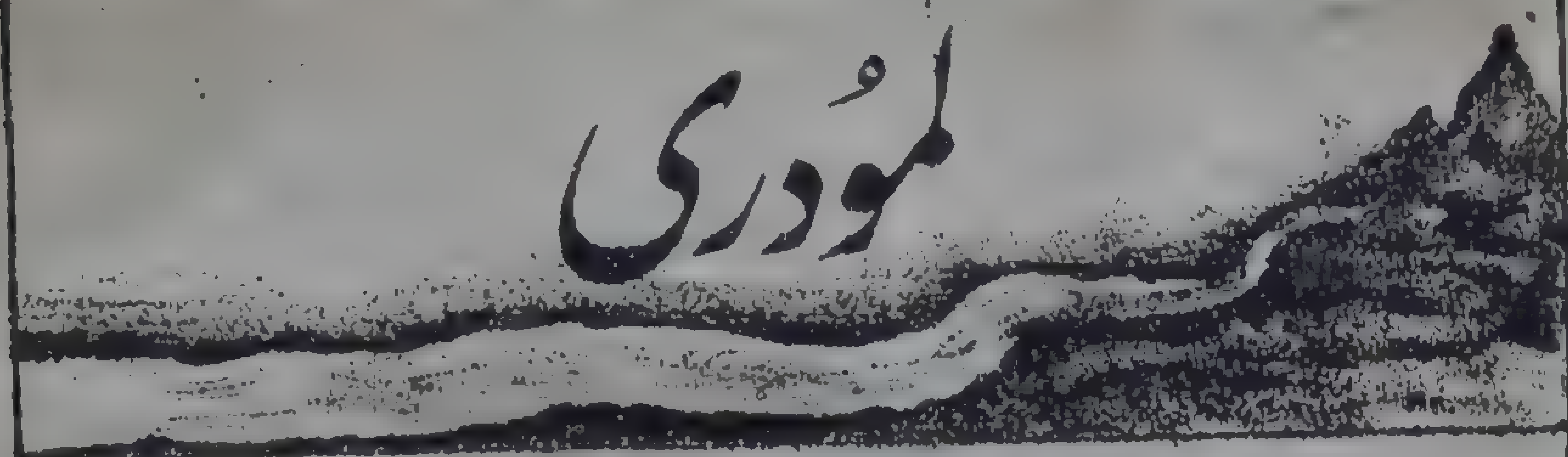
ایک اشارہ ہے صد آہنگِ نویدِ کامِ دل — اِک نگاہِ شوق ہے صد دفترِ پیغامِ دِل

عقدۂ سربستۂ دِل ہے مگر بابِ فتوح — بستۂ خار و خسِ وادی یہاں طُوفانِ نوح

جلوۂ گلزارِ ابراہیم اس آتش سے ہے — سرکشی ہاؤ ہُو اس شعلۂ سرکش سے ہے

اِس سے خالی آتش و آب و ہوا و گِل نہیں
دل جو ہو بے کیف کم از مشتِ گِل ہے دل نہیں

حافظ سید فضل حق آزاد



لمودری

ذیل کی مستانہ اور مستی انگیز نظم حضرت ناظر کی نوا سنجیوں کا ایک تازہ نمونہ ہے۔ کیوں نہ ہو جو بلبل کشمیر جنت نظیر جیسے چمن میں بسیرا کرے۔ اگر وہ ایسی رنگین نوائی نہ کرے تو اور کون کرے۔ نہر لمودری وادی لدر میں نگاہ نظارہ جو کے لئے ایک کانِ حسن ہے۔ حضرت ناظر لکھتے ہیں "نہر لمودری کا سلسلۂ نسب کوہ ہمالیہ سے ملتا ہے اور وہ شیشرم ناگ کے بطن سے پیدا ہو کر برف کے پنگوڑے اور مخمل کے بچھونے پر لوٹ لگاتی ہنستی کھیلتی وادی کشمیر کی طرف چلی آتی ہے۔ لمودری کے چاہنے والے زیادہ تر یورپین سیاح ہیں.... .... پہل گام سے عیش مقام تک لمودری کا گذرگاہ نہایت دلکش منظر ہے اور ناظرین کے دلوں میں عجب ولولہ پیدا کرتا ہے .... ایسی فضا دیکھ کر اگر ایک شاعر .... گنگنانے لگ جائے تو قابل معذوری ہے۔ پہلے بند میں شاعر لمودری کا سراپا بیان کر کے مجاز سے حقیقت کو پہنچ جاتا ہے۔ اور گہرا غوطہ لگاتا ہے"۔ ہم بلا تمہید مزید اس نظم کو ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں:-

کیا آب و تاب تجھ میں نہرِ لمودری ہے
پربت کی تو ہی دیبی یا قاف کی پری ہے
آبِ حیات ہے تو روحِ نبات ہے تو
تو جان و دل کی ٹھنڈک اور آنکھ کی تری ہے
تو کھیلتی ہے بن میں اور لوٹتی چمن میں
نسرین و نسترن میں تیری مصوری ہے
گنہار وہ رنگیلی شالی وہ پیلی پیلی
ریحاں وہ نیلی نیلی کیا صنعِ داوری ہے

رخشندہ سنگ پارے ہیں چاند یا ستارے
تیری جو کنکری ہے الماس سے کھری ہے
لعل و گہر کے معدن ہیں تیرے جیب و دامن
اور موتیوں سے ہردم جھولی تری بھری ہے
چشمے ترے مقطّر ہیں جامِ جم سے بڑھکر
چیلوں کی فوج سر پر سدِ سکندری ہے
برف آب سے لبالب ہردم ہے تیرا ساغر
ساقیٔ بزم تیرا خورشیدِ خاوری ہے
حُسن و جمال تیرا غنج و دلال تیرا
ہر خط و خال تیرا طغرائے دلبری ہے
ہے تیری دُھن نرالی کیا دِل لُبھانے والی
جنگل میں کوئی جوگن محوِ نوا گری ہے
ناظرؔ کی ہیں نظر میں تیری ادائیں پیاری
کچھ مجھ سے ملتی جُلتی ہے داستاں تمہاری

ہم دونو جادہ پیما صبح و مسا رہے ہیں
بے راہبر رہے ہیں بے رہنما رہے ہیں
آفاق گرد دونو صحرا نورد دونو
ٹیلوں میں جنگلوں میں چکّر لگا رہے ہیں
اپنی الاپ پر ہیں ہم دونو مست و شیدا
سر دُھن رہے ہیں خود ہی اور خود ہی گا رہے ہیں
سنے کوئی ہمزباں ہے سنے کوئی رازداں ہے

پربت کی چوٹیوں کو ٹھکرا رہے ہیں

بانگِ جرس ہیں خود ہی اور خود ہی کارواں ہیں
ہم کوچ کا نقارا ہر دم بجا رہے ہیں

یہ بیخودی و مستی وہی ہے اور الستی
روزِ ازل کے کیفی سرخوش سدا رہے ہیں

ہم گل کے ہم نفس ہیں بادِ صبا کے ہمدم
مرغانِ خوش نوا کے ہم ہم نوا رہے ہیں

اے اہل شہر تم سے مل کر ہوئے مکدّر
صحرا نوردیوں میں ہم باصفا رہے ہیں

گردن کشوں سے دونو ہم کوسوں بھاگتے ہیں
جانب فروتنوں کی خود کھنچتے جا رہے ہیں

قدرت کے شاہدوں کے فوٹو اُتارتے ہیں
جو صورتیں ہیں دیکھی سب کو دکھا رہے ہیں

آئینہ وار بردل نقش و نگار داریم
ہم شورہ بوم داریم ہم لالہ زار داریم

ہم کو بکو پھرے ہیں اور جابجا رہے ہیں
تحت الثّرٰے رہے ہیں فوق السّما رہے ہیں

اونچی تھی اپنی بستی لیکن یہ غولِ ہستی
سوئے حضیض پستی ہم کو گرا رہے ہیں

آفت کا سامنا ہے یاں سیدھی راہ چلنا
منہ آ کے پتھروں پر ہم منہ کی کھا رہے ہیں

ہیں گرم رہ نوردی گو اس سے بے خبر ہیں
آئے تھے کس طرف سے کس سمت جا رہے ہیں

دل جس جگہ لگانا واں لوٹ کر نہ آنا
کیا داغ حسرتوں کے ہم دل پہ کھا رہے ہیں

جو دلکشا نظارے نظروں سے چھپ چلے ہیں
حسرت بھری نگاہیں اُن پر اٹھا رہے ہیں

ہے آب و تاب اپنی اہلِ جہاں پہ ظاہر
پر زخمِ اندروں کو سب سے چھپا رہے ہیں

وُہ مانے یا نہ مانے لیکن جبیں کو اپنی
ہم سنگ در پہ اس کے ہر دم گھسا رہے ہیں

اِک بحرِ بیکراں میں اپنا نشاں کریں گم
گرتے اُچھلتے پڑتے اِس دُھن میں جا رہے ہیں

اَے موجِ یمِ خدارا تیور پہ بل نہ لانا
ہم سر کے بل تمہارے قدموں میں آرہے ہیں

ناظر ز منزلِ دوست نام و نشاں ندانیم
در شوق راہ پیما دُنبالِ کارواں ایم

وُہی عاقل ہے جو نیکی کا نہ جادہ چھوڑے مال مصرف سے کفن کے نہ زیادہ چھوڑے
نفسِ امّارۂ بد خو کا ارادہ چھوڑے ورقِ دفترِ اعمال نہ سادہ چھوڑے

کھالے کچھ۔ گور کے پھر منہہ کا نوالہ ہوگا
قبر میں فوج نہ ہوگی نہ رسالہ ہوگا

(منشی لوہی علی بی اے) منسب حیدر

بارہ دری

(پٹیالہ)

چشم بد دُور مناظرِ قدرت اور عجائباتِ عالم پر غائر نظر ڈالنے والے حقائقِ اشیا کی تحقیق میں بہت ترقی کر رہے ہیں۔ جنہوں نے معمولی سے معمولی اور چھوٹی سے چھوٹی چیز کو دیدۂ حقیقت بین سے غور کے ساتھ دیکھا بھالا اور جسکو مناسب سمجھا سلکِ تحریر میں منسلک کیا۔ چنانچہ "ندی" اور "بہتے" کے راگ لکھے "ہل" کی سرگذشت بیان کی "پرانی دیوار" سے ناصحِ مشفق کا کام لیا۔ "بلبلِ شیدا" سے ناز و نیاز کی باتیں کیں۔ "روانیٔ آب" پر بحرِ مواج طبیعت کا زور دکھایا "خار" کو رشکِ گلزار پُر بہار ثابت کر دکھایا۔ یہاں تک کہ "سوتا مڑہ" اور "بی کانگڑی" خانم بھی حضیضِ گمنامی سے نکل کر سطحِ علمی پر جلوہ افروز ہوئی۔

چونکہ خاکِ پٹیالہ میں بھی کئی گوہر آبدار پنہاں ہیں۔ اس لئے راقم ہمیشہ اس بات کا متمنی اور آرزو مند رہا۔ کہ کوئی پرزور قلم۔ عالی دماغ۔ اور کہنہ مشق ہاتھ اس نامور ریاست کے قابلِ ذکر مصنوعاتِ انسانی کا مرقع کھینچکر اربابِ نظر کے پیش کرے مگر افسوس میری یہ آرزو بر نہ آئی۔ آخر ان عجائبات پر توجہ نہ کرنا اپنی حق ناشناسی اور انکی حق تلفی سمجھ کر اس اہم فرضِ خدمت کا مہتم بالشان حصہ اضطراراً مجھے اپنے ذمے لینا پڑا۔ بہر حال میں ریاست کے عجائبات کو معرضِ تحریر میں لانے کی داغ بیل ڈالتا ہوں۔ وَکَفٰی بِہٖ فخراً۔ (حسین)

مجھ سے بیدل کو کیا محوِ تماشائے چمن — بل بے پٹیالہ تری بارہ دری کا جوبن
حبذا شان زہے حسنِ فضائے گلشن — واہ یہ تازگی و رونق و نزہت یہ پھبن
بارک اللہ یہ منظر یہ مقامِ دلکش — چشم بد دُور یہ گل بوٹے یہ سبزہ یہ چمن
لوحش اللہ یہ نقشہ یہ سوادِ مینو — واہ یہ پٹریاں صاف۔ اور یہ سڑکیں روشن
دیکھ پائے اگر اس باغِ بہار افزا کو — حسنِ پیرس ہو فدا اور فضائے لندن
روشیں صاف ہیں یا تختۂ بلور سمجھے — کیاریاں ہیں کہ بھرے رکھے ہیں پھولوں سے لگن

غیرتِ باغ ہے گملوں میں بہارِ تازہ ، اَور گُل دانوں میں گلدستے ہیں رشکِ گلشن
واہ رے فیضِ ہوا نرگسِ اعمیٰ ہو بصیر ، گر لگا لے وُہ کبھی خاک کا اس کی اَنجن
بن گیا ہے وُہ سویدائے دِلِ لالہ - یہاں ، آج تک کہتے رہے داغ جسے اہلِ سخن
بیدِ مجنوں ہے اگر سر کو جُھکائے بہ ادب ، سرو نند - سرو کھڑا ہے پئے تعظیمِ چمن
چشم بر راہ اگر رہتی ہے نرگس ہر دم ، ہر گھڑی گوش بر آواز ہیں نسرین و سمن
بل بے خودداری کبھی سیب زمیں پر نہ گرے ، کششِ نقل یہاں گر تو دے ثابت نیوٹن
نرم شاخیں ہیں نسیمِ سحری سے ہلتی ، نشّے میں جُھومتا ہے یا کہ کوئی نازک تن
چھونے سے گویا چھوئی مُوئی مری جاتی ہو ، سر جُھکا بیٹھتی ہے شرم سے جس طرح دلہن
لاکلام اس کا ہر اک نخل ہے سرو و شمشاد ، اس کے ہر برگ پہ لاریب فدا سو سوسن
اس گلستاں کا ہر اک گل ہے بسانِ گلزار ، اس چمن زار کا ہر برگ ہے مانندِ چمن
اِس حدیقے کی ہر اک شاخ میں ہے سو خوبی ، اِس کے ہر غنچہ و گل میں ہے بھری لاکھ پھبن
کمپنی باغ تو کیا ہیچ ہے باغِ لارنس ، شالامار اس کے مقابل میں نظر آتا ہے بَن
مشرقی رنگ میں نیرنگیِ مغرب شامل ، گر ہے یہ پارک تو پٹیالہ سراسر لندن
آسٹریا و اٹیلی کے شجر اس میں نہال ، گویا انگلینڈ کے پودوں کا یہ گلشن ہے وطن
اس میں یہ کوٹھی حضوری ہے کہ قصرِ ابیض ، ہوس آف لارڈز بھی شرمائے نہیں اس میں سخن
رَوِشیں سامنے اس کے جو بنی ہیں پُر لطف ۱ ہائے تحریر میں آسکتی نہیں وُہ رمن و عن
سادگی میں ہے تکلّف پے نظّارہ غضب ۲ لوٹ جاتی ہے نظر پڑتے ہی اس پر جوبن
پٹڑیاں سُرخ بنے دائرے جن میں ہیں سفید ۳ جس طرح ساعدِ گل گوں میں بلّوریں کنگن
سنگریزے ہیں سفید اور سیاہ دونو طرف ۴ کوڑیالی کوئی لہرا رہی ہے یا ناگن
اِک طرف کوہ بنایا ہے بلند و سرسبز ۱ کرنے اس باغ کا یا آیا ہمالہ درشن
ماشاءاللہ عجب صنعتِ انسانی ہے ۲ اصل اور نقل میں کچھ فرق نہیں ہے من و عن

گھاٹیاں وُہی - وہی کھوہیں سلسلہ بے ترتیب ۳ پتھروں سے وہی پانی کا نکلنا چھن چھن
سخت ویسی ہی زمیں وُہی درختوں کے ہیں جُھنڈ ۴ کہیں رُوئیدہ بنفشہ - کہیں سنبل - سوسن
آبشاروں سے صدا آتی ہے نغموں کی کہیں ۵ ہے ہوا گویا درختوں میں بجاتی ارگن
اپنی دُھن میں کہیں قمری ہے جھنجھوٹی گاتی ۶ اور تدرو اپنا کسی سمت دکھاتا ہے چلن
قُلّۂ کوہ پہ یہ گُنڈلی مارے ہے سانپ ۷ یا جٹا دھاری جی بیٹھے ہیں تجے تن من دھن
ہے تہِ کوہ رواں چشموں سے یہ نہر - کہ ہر ۸ مَوج زن نیچے ہمالہ کے یہ دریائے جمن
ہے کہیں شیر جُھکا پینے کو پانی اس میں ۹ گائے چرچگ کے کہیں بیٹھی ہے پتھر پہ مگن
منظرِ کوہ غرض یہ کہ عجب منظر ہے
شاد ہوتا ہے یہاں آ کے گرفتارِ محن
کیوں نہ ہو - فیض سے کس کے یہ ہوا ہی سرسبز
اس پہ ذی جُود رہا کون سا ہی سایہ فگن
بہارِ نَئی توجہ ہی کسِ کی اس پر
لُطفِ شاہانہ ہے کس کے یہ بنا ہی گلشن
کس کے ارشاد سے اس باغ کی اصلاح ہوئی
کون فردوس مکان تھا ہے یہ جس کا مسکن
راجہ اندر وُہ مہاراجہ راجندر سنگھ
جی - سی - ایس - آئی جگر گوشۂ عظمیٰ بریٹن
وہ سپاہی منش و شاد صفت بندہ نواز
دُھوم پٹیالے سے تھی جسکی مچی تا لندن
جس گلستاں کو نصیب ایسا چمن آرا ہو
کیوں نہ ہر طرح سے کہلاتے وُہ یکتائے زمن
اس کے اک قصر پہ سو قصرِ خورنق قرباں
اس کے ہر پھُول پہ ہوں لاکھ فدا باغِ عدن

سیّد علمدار حسین (ہنوڑی)

تلاشِ محبّت

(ایک بلی کے بچّے کو دیکھکر)

اس قدر بےچین کیوں پھرتی ہو اے ننھی سی جاں
شور سے سر پہ اُٹھا رکھا ہے کیوں سارا مکاں

دُودھ پی لے بھُوک نے تجھ کو ستایا ہے اگر
وُہ دھرا ہے دودھ چھوٹی سی پیالی میں اُدھر

دُودھ بھی پیتی نہیں تُو؟ خیر لے تیرے لئے
گوشت تھوڑا سا منگا رکھا ہے یہ بازار سے

گوشت کو بھی تو نہیں چھوتی؟ تو کوئی کیا کرے؟
ہاں! ستایا ہے کہیں سردی کی شدت نے تجھے

آ رضائی میں تجھے اپنی بٹھا لیتا ہُوں میں
آ تجھے سردی کے حملے سے بچا لیتا ہوں میں

پر یہاں بھی بیٹھ کر تجھ کو کہاں آرام ہے؟
تلملانے سے تڑپنے سے یہاں بھی کام ہے

بیٹھ کر گھٹنے پہ غُرغُر کرنے لگتی ہے کبھی
سر کو میرے پاؤں پر تو دھرنے لگتی ہے کبھی

پیار کرتا ہُوں تو اُس پر بھی نہیں تجھ کو قرار
ناشکیبائی ہے تیری حرکتوں سے آشکار

کس قدر اُلفت ٹپکتی ہے نگاہوں سے تری!
ہائے کیا حسرت ٹپکتی ہے نگاہوں سے تری!

ہائے اے نادان! اب سمجھا میں ترا مُدعا
تو تلاشِ مہر و اُلفت میں ہے آتش زیر پا

ڈھونڈھتی پھرتی ہے ہاں وُہ گوہرِ نایاب تو
جس کی ہر انساں کو ہم جنسوں میں ناحق جستجو

تجھ کو تو جس چیز کی ہے ابنِ آدم میں نہیں
بلکہ سچ پُوچھے تو موجوداتِ عالم میں نہیں

آئے گا تیری سمجھ میں کس طرح یہ فلسفا
ذوقِ راحت ہے تو پیدا کر دلِ بے مُدعا

ہے تمنائے محبت ایک نخلِ بے ثمر
آرزوئے مہر و اُلفت ایک شامِ بے سحر

بلبلِ شیدا ہوائے گُل میں صرفِ نالہ ہے
داغِ مہرِ گل سے دِل اُس کا برنگِ لالہ ہے

ہے دِلِ بلبل میں گل کی سرد مہری کی جلن
کیا خبر اُس کو کہ گل کے دل میں ہے کس کی لگن

کس کی فرقت میں گلِ تر اس قدر غمناک ہے
چشم پُرنم ہے جگر خُوں ہے گریباں چاک ہے

چاند پر ناحق فنا کرتا ہے جان اپنی چکور
چاند کب سُنتا ہے اس مہجور کے نالوں کا شور

مسکراہٹ چاند کی ہے اس کے نالوں کا جواب
اُس طرف اتنا سکوں اور اس طرف یہ اضطراب!

آتشِ اُلفت ہی برقِ خرمنِ پروانہ ہے
یہ پتنگا بھی ادائے شمع کا دیوانہ ہے

گرد پھر پھر کر طوافِ کعبۂ اُلفت کرے!
جان دے اور آتشِ ذوقِ فنا میں جل مرے!

شمع کو لیکن نہیں اس کی محبت کی خبر
وُہ ذرا اس پر نہیں کرتی عنایت کی نظر

کونسی دُھن میں خدا جانے وُہ ہو آتش بجاں — کِس لئے ہیں گرم آنسو اُس کی آنکھوں سے رواں
جب محبت کا یہ عالم ہے تو کیا اِس کی تلاش؟ — کیا تمنّائیں کہاں کی آرزو کس کی تلاش؟

عاشق از بے مہری یارِ جفا جُو شکوہ سنج
یار در فرطِ ہولئے دیگرے پامالِ رنج

نیرنگ

مُرغ و صیّاد

اَے نسیمِ صُبح ! اَے گہوارہ جنبانِ چمن — ہو اگر تیرا گذر سُوئے جوانانِ چمن
اُن سے کہنا میری جانب سے بصد اظہارِ شوق — ساتھ کے کھیلے ہُوئے ہیں جو یارانِ چمن
اِک گرفتارِ قفس نے ہے کہا تم کو سلام — اور پُوچھا ہے مزاجِ سرو و ریحانِ چمن
پھر یہ دینا میری جانب سے نویدِ جانفزا — سیرِ گلشن ہو مُبارک تم کو مُرغانِ چمن
خاک اُڑا کر پہلے چُپ ہو جائیو بادِ صبا — حال پُوچھیں کچھ جو میرا ہمصفیرانِ چمن
پھر یہ کہنا۔ کھینچکر سینے سے آہِ جاں گداز — ہے قفس میں قید وُہ مرغ خوش الحانِ چمن
اب نہ سیرِ لالہ و گل ہے نہ وُہ گلگشتِ باغ — حسرتِ پرواز ہے اب اَور ارمانِ چمن
اب نہ وُہ پھولوں کا تختہ ہے نہ کُنجِ خوشگوار — وُہ نہالانِ چمن ہیں اب نہ میدانِ چمن
تنکے چُنتا ہے پڑا کُنجِ قفس میں اب غریب — آشیاں کیسا! کہاں کی فکرِ سامانِ چمن

ٹوٹتا ہے خانۂ صیّاد میں دم ہائے ہائے
ہو رہا ہے بُلبلِ تصویر ماتم ہائے ہائے

چھیڑتی ہے کیا قفس میں ہم کو اَے موجِ نسیم — اِس چمن میں ہم بھی تھے پروردۂ نازِ قدیم

تھی ہماری بھی کبھی سرسبز کشتِ آرزو — ہمپہ بھی اَے ابرِ رحمت! تھا ترا لطفِ عمیم
لوٹتے تھے آہ دن کو سبزہ زاروں کے مزے — شب کو رہتے تھے تر و شاداب کُنجوں میں مقیم
یا چہکتے پھرتے تھے باغوں میں ہم اَے ہمصفیر — یا قفس میں تڑپتے ہیں آہ بے یار و ندیم
ہم کہاں کے خوشنوا تھے ہم کہاں کی بذلہ سنج — ہم پہ اَے صیّاد ٹوٹا جو ترا قہرِ عظیم
ہمصفیرانِ چمن سے کیا تغافل کا گلہ — جب قفس میں پھنس گئے۔ کیسی رہ و رسمِ قدیم
ذبح اَے صیّاد کر بھی چک کہ جھگڑا پاک ہو — ہم سے اب دیکھا نہیں جاتا ہے یہ حالِ سقیم
پھونکدے اَے سوزِ غمہائے نہانی! پھونکدے — بنکے او ظالم! بھڑک اُٹھ! شعلۂ نارِ جحیم
ہم ہیں پابندِ قفس۔ کیسا چمن کیسی بہار — کس کو مژدہ دینے آئی ہے تو اَے بادِ نسیم

دیدِ گل سے واسطہ کیا ہم اسیروں کے لئے
سیرِ گلشن ہو مُبارک ہمصفیروں کے لئے

لالہ و گل کی تھی قسمت میں فضا دو چار دن — ہم نے کھالی سبزہ زاروں کی ہوا دو چار دن
پھر سُنیگا ہائے کس کے زمزمے صیّاد تو — ہم قفس میں اَور ہیں نغمہ سرا دو چار دن
حسرتِ پرواز بھی جاتی رہیگی اَے اجل! — ہم سے اُڑ لیں اَور مرغانِ ہوا دو چار دن
پھر کہاں صیّاد ہم۔ اور پھر کہاں کُنجِ قفس — آب و دانہ ہے مقدّر میں ترا دو چار دن
گھُٹ کے اس زنداں میں جائیگا کبھی تو دم نکل — مانگتے ہیں اَے اجل! تری دُعا دو چار دن
ہاں اَے صیّاد! ہم کو بھی کرے گا تو کبھی — اَور تڑپالے قفس میں بیوفا دو چار دن
دیکھ کر خالی قفس کو جی بھر آئیگا ترا — پیٹ کر روئیگا سر۔ بعدِ فنا دو چار دن
کر رہے ہیں جس طرح ہم نالہائے دردناک — تو رہیگا یُونہی مصروفِ بُکا دو چار دن
یاد جب صیّاد آئینگے ہمارے زمزمے — گھر میں تنہا تیرا جی گھبرائیگا دو چار دن!

دستِ حسرت مل کے اَے صیّاد! پچھتائیگا تُو
ایسا لائیگا کہاں سے آہ مرغِ خوش گلُو

جب بنائیگا ہمارا آہ ! چھوٹا سا مزار — چپکے چپکے تو ہمارے غم میں ہوگا اشکبار
یاد رہ رہ کر جفائیں اپنی آئینگی تجھے — اور ہماری بیکسی پر روئے گا تو زار زار
لے کے خالی گھر کو جب گلشن سے لوٹیگا قفس — پیچھے پیچھے خاک اُڑاتی آئے گی بادِ بہار
سُننکے اَی صیاد ! تیرے نالہائے جانگداز — راستے میں لوگ پوچھینگے کہ کیوں ہے سوگوار
تو کہیگا مر گئی وُہ بلبلِ رنگیں نوا — وصلِ گل کے واسطے تھی جو قفس میں بیقرار
گل کھلینگے ۔ سبزۂ نورس اُگیگا قبر پر — ہم نہ ہونگے اور آئیگی گلستاں میں بہار
سوتے ہونگے تیرے گہوارے میں اَے کنجِ لحد — خوابِ راحت میں مخل ہوگی نہ گلبانگِ ہزار
اپنی مٹی ہو کہاں کی کیا خبر ۔ بادِ صبا ! — ہو پریشاں دیکھئے کس کس جگہ مُشتِ غبار
وُہ بھی آزادی کے دن تھے ہائے کتنے جانفزا — تیرے بندھن سے تھے جب اَے قیدِ ہستی رستگار

لوٹتے تھے اپنے گلشن میں بہاروں کے مزے
سبزہ زاروں کی تھیں سیریں ۔ جوئباروں کے مزے

ہم سرودِ طائرانِ قدس تھے ہم بھی صبا ! — قیدِ ہستی کی کشاکش میں نہ تھے یوں مبتلا
بولتے تھے اپنی دُھن میں پیاری پیاری بولیاں — ہائے وُہ دن ! شاخِ طوبیٰ پر تھے جب نغمہ سرا
لوٹتے تھے ہم بہاریں گلشنِ فردوس کی — تھی عجب دلکش ہمارے سبزہ زاروں کی فضا
کھل رہے تھے چارسو پھولوں کے کنج خوشگوار — تھیں رواں شیر و عسل کی اُن میں نہریں جابجا
اپنے پھولوں پر تو اتراتی ہے کیا اَی عندلیب ! — تُو نے دیکھی ہی نہیں ہے شاہدِ گل کی ادا
کر کے ہم کو تو اسیرِ حلقۂ دامِ فریب — کھینچکر کس وادیٔ پُرخار میں لائی ف
ہم نہ پھنستے کس طرح صیاد تیرے جال میں — آب و دانہ تھا مقدر میں ترے گھر کا لک
ہم قفس میں کب تلک بے بال و پر تڑپا کریں — ٹوٹ بھی جا ! اَے طلسمِ قیدِ ہست
تیرے مُرغِ دست پرور ہم ہیں صیادِ ازل ! — خواہ ہم کو ذبح کر تو ۔ خواہ ہ

من نہ آں مُرغم کہ نالم از جفائے تیغ تو
ذبح کُن صیّاد۔ قربانِ ادائے تیغ تو

(سرُور جہان آبادی)

مُرغانِ قفس

تضمین

جو تجھ پہ بیتے تو تُو جانے مُرغِ بُستانی
قفس میں کیسے تڑپتے ہیں آہ زندانی
تپش فزا ہے قیامت کا دردِ پنہانی
تُو اے کبوترِ بامِ حرم چہ میدانی
تپیدنِ دلِ مُرغانِ رشتہ برپارا

اسیرِ دام نہ ہو کوئی مُرغِ بُستانی
خدا کسی کو نہ دے حسرتِ پر افشانی
سمجھتا ہے مرے نالوں کو زمزمہ خوانی
تو اے کبوترِ بامِ حرم چہ میدانی
تپیدنِ دلِ مُرغانِ رشتہ برپارا

ہنسی نہ مجھ سے کر او محوِ زمزمہ خوانی
ہو کنگرے پہ مُبارک تجھے خوش الحانی
کرے خدا وہ دن نہ دکھائے کہ تو ہو زندانی
تو اے کبوترِ بامِ حرم چہ میدانی
تپیدنِ دلِ مُرغانِ رشتہ برپارا

سرور جہان آبادی

تازہ غزلیں

عید اور انتظارِ یار

کہتے ہیں عید ہے آج - اپنی بھی عید ہوتی
ہم کو اگر میسر جاناں کی دید ہوتی

قیمت میں دیدِ رُخ کی ہم نقدِ جاں لگاتے
بازارِ ناز لگتا دِل کی خرید ہوتی

کچھ اپنی بات کہتے کچھ میرا حال سُنتے
ناز و نیاز کی یوں گفت و شنید ہوتی

جلوے دکھاتے جاتے وُہ طرزِ دلبری کے
اور دِل ہیں یاں ہوائے ناز مزید ہوتی

تیغِ نظر سے دل پر وُہ وار کرتے جاتے
اور لب پہ یاں صدائے ھَل مِن مَزِید ہوتی

ابرو سے اُن کے غمزہ تیرِ ادا لگاتا
یہ دِل قتیل ہوتا یہ جاں شہید ہوتی

کچھ حوصلہ بڑھاتا اندازِ لُطفِ جاناں
کچھ دغدغہ سا ہوتا - کچھ کچھ اُمید ہوتی

لیکن یہاں تو حرماں ہے ثمرۂ تمنا
کیوں قفلِ آرزو کی پیدا کلید ہوتی؟

آنکھیں ترس رہی ہوں جب اُسکی اک جھلک کو
نیرنگِ منتظر کی کیا خاک عید ہوتی؟

(نیرنگ)

سختیاں کرتا ہُوں دِل پر غیر سے غافل ہُوں میں
ہائے کیا اچھّی کہی ظالم ہُوں میں جاہل ہُوں میں

مَیں جبھی تک تھا کہ تیری جلوہ پیرائی نہ تھی
جو نمودِ حق سے مٹ جاتا ہے وہ باطل ہُوں میں

اے تماشائی! مری پستی کا نظارہ تو دیکھ
اسفلِ عالی نظر ہُوں ناقص کاملاں میں

علم کے دریا سے نکلے غوطہ زن گوہر بدست
وائے محرومی! خذف چینِ لبِ ساحل ہُوں میں

تم نے تاکا دل کو لیکن اُف رے شوقِ تیرِ عشق
دِل سے کہتا ہے جگر تو دل نہیں ہر دل ہوں مَیں

ہے مری ذلت ہی کچھ میری شرافت کی دلیل
جسکی غفلت کو ملک روتے ہیں وہ غافل ہوں مَیں

تجھ میں پوشیدہ ہے یسلئے اَدرہی لیسلے کوئی
کہ رہا ہے دل ترا یسلئے نہیں محمل ہوں مَیں

کشتِ آزادی کی بجلی تھی مری تقلید ہی
پھونکڈالی اپنی کھیتی آہ ! کیا غافل ہوں مَیں

مَیں وہی ہوں کھو گیا تھا جس کا دِل صبحِ الست
اب نہ پہچانو تو تم جانو وہی بسمل ہوں مَیں

ہے عبث اَے برق تجھ کو میرے حاصل کی تلاش
مجھ پہ آکے گر کہ اپنا آپ ہی حاصل ہوں مَیں

بزمِ ہستی ! اپنی آرایش پہ تو نازاں نہ ہو
تُو تو اک تصویر ہے محفل کی اور محفل ہوں مَیں

تخم ریزی جسکی ہنگام صدائے کُن ہوئی
اُس پُرانی مزرعۂ زرخیز کا حاصل ہوں مَیں

جانتا ہوں جلوۂ بے پردہ ہے کاشانہ سوز
سادگی دیکھو کہ پھر دیدار کا سائل ہوں مَیں

ڈھونڈتا پھرتا ہوں اے اقبال اپنے آپ کو
آپ ہی گویا مسافر آپ ہی منزل ہوں مَیں

(اقبال)

یہاں سے جاتے ہیں اب جی کے ہارنے والے
کدھر چلے مرے گیسو سنوارنے والے

پلٹ کے دیکھ تو لیتا دیا تھا گر نہ جواب
حیا سے گڑ گئے تجھ کو پکارنے والے

کچھ ایک میں نہیں عشاق ہر طرح کے ہیں
سمجھ کے تیکھی نگاہوں سے مارنے والے

ہوا نہ ضبط سے بھی کوئی کام وا اسفا
پڑے ہیں خاک بسر جی کو مارنے والے

نہ خم نہ جام نہ میخوار بزم ہے سنسان
غرض سب ہار گئے سب ہارنے والے

کچھ ایک گل نہیں تری گلی میں اَے فیاض
ابھی بہت سے ہیں دامن پسارنے والے

کچھ اس طرح سے ستائے گئے گلی میں تری
پلٹ کے آئے نہ پھر جی کو مارنے والے

سمجھ کے تری گذرگاہ دربہ غیر سے کے ہیں
حیا بھی ہار گئے دل کے ہارنے والے

علم الاقتصاد

(یعنی سیاستِ مدن)

مصنّفہ شیخ محمد اقبال ایم۔اے اسسٹنٹ پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور

ہم ناظرینِ مخزن کو بڑی خوشی سے اطلاع دیتے ہیں کہ یہ قابلِ قدر کتاب جسکا ایک باب ہدیۂ ناظرین ہو چکا ہے چھپکر تیار ہو گئی ہے۔ جس عرق ریزی سے شیخ صاحب نے یہ کتاب لکھی ہے اور جس محنت سے اُنہوں نے علم الاقتصاد کے دقیق اصُول کو واضح کیا ہے اسکا اندازہ صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جنکو علمی کتابوں کے پڑھنے کا اتّفاق ہوتا رہتا ہے۔ توضیحِ اصُول کے ساتھ ساتھ مصنّف نے ہندوستان کے موجُودہ تمدّنی اخلاقی اور اقتصادی حالات کی طرف لطیف اشارات کئے ہیں جن سے پڑھنے والے کی نظر وسیع ہوتی ہے اور اسکو مسائلِ اقتصاد پر آزادانہ طور پر غور و فکر کرنے کی تحریک ہوتی ہے۔ زرِ نقد کی ماہیت پر جو کچھ لکھا ہے ایک خاص منطقیانہ دلچسپی رکھتا ہے جس سے ایک عقلی مسرّت حاصل ہونے کے علاوہ بعض اہم مسائل پر عجیب قسم کی روشنی پڑتی ہے۔ ہم اُمید کرتے ہیں کہ اُردو لٹریچر کا یہ قابلِ قدر اضافہ وقعت کی نگاہ سے دیکھا جائیگا اور اسکے مسائل پر کماحقّہٗ غور کیا جائیگا کیونکہ ہندوستان کی آئندہ قسمت کا دارومدار زیادہ تر اس ملک کے موجُودہ اقتصادی حالات پر منحصر ہے۔ اب وقت اس بات کا مقتضی ہے کہ پبلک کم وزنی لٹریچر سے دست بردار ہو کر ان کتابوں کی طرف توجہ کرے جنکا موضوع انسان کی عملی زندگی اور اس کے تمدّنی حالات پر غور کرنا ہے۔ اس کتاب کی قیمت صرف ایک روپیہ (عہ) ہے اور مصنّف سے مل سکتی ہے +

ایڈیٹر

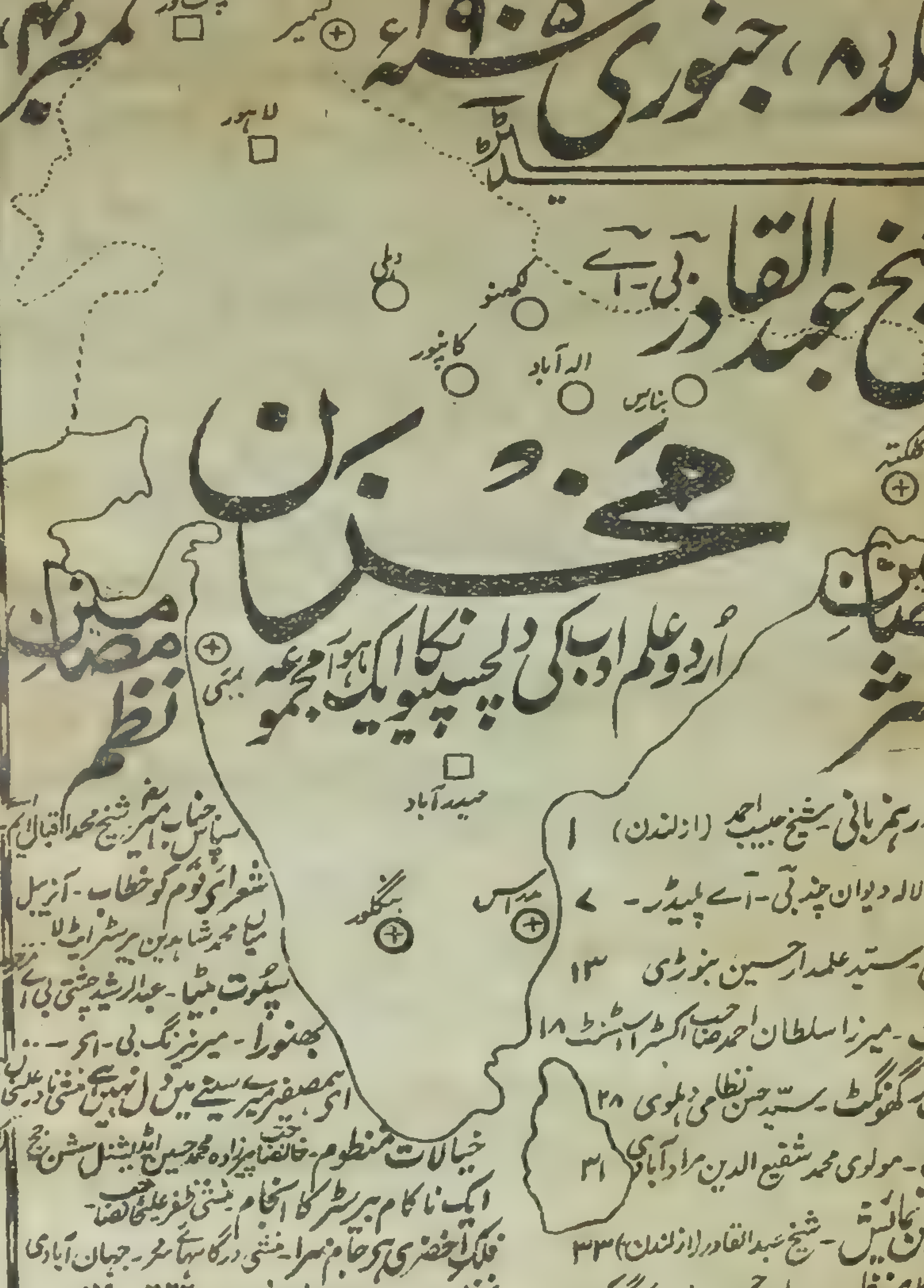
قیمت سالانہ معہ محصولڈاک قسم اوّل (۴ روپے) فی پرچہ ۴ؔ قسم دوم (۲/۸) فی پرچہ ۳ؔ

جلد ۸، جنوری ۱۹۰۵ء، نمبر (۴)

ایڈیٹر شیخ عبدالقادر بی۔ اے

مخزن

اُردو علم ادب کی دلچسپیوں کا ایک ماہوار مجموعہ



مضامینِ نثر

نیشن اور ہمزبانی ۔ شیخ حبیب احمد (از لندن) ۱
ڈالی ۔ لالہ دیوان چند بی ۔ اے پلیڈر ۔ ۷
موسیقی ۔ سید علمدار حسین بنوڑی ۱۳
وصیت ۔ میرزا سلطان احمد صاحب اکسٹرا اسسٹنٹ ۱۸
نقاب اور گھونگٹ ۔ سید حسن نظامی دہلوی ۲۸
موت ۔ مولوی محمد شفیع الدین مرادآبادی ۳۱
اطالین نمائش ۔ شیخ عبدالقادر (از لندن) ۳۳
چاند کا منظر ۔ سید احسن بی ۔ اے (گورکھپور) ۴۱

مضامینِ نظم

سپاس ۔ جناب ماسٹر شیخ محمد اقبال ایم ۔ اے
شعرا کی قوم کو خطاب ۔ آنریبل میاں محمد شاہدین بیرسٹرایٹ لا
سپوت بیٹا ۔ عبدالرشید چشتی بی ۔ اے متعلم
بھنورا ۔ میرنیرنگ بی ۔ اے ۔
ای ہمصفیر میرے سینے میں دل نہیں ہے ۔ منشی نادر علی خاں نادر (کاکوری) ۵۸
خیالات منظوم ۔ خان صاحب پیرزادہ محمد حسین ایڈیشنل سشن جج ۵۹
ایک ناکام بیرسٹر کا انجام ۔ منشی ظفر علیخاں صاحب ۔ ۶۰
فلک اخضری ہر جام نہرا ۔ منشی درگا سہائے سرور ۔ جہان آبادی
نخلستان ۔ علی محمد شیرانی (از لندن) ۶۲ تازہ غزلیں ۔ ۶۴

نو کروڑ ہندوستانی اُردو بولتے ہیں اور اسی قدر اور ہندوستانی اُردو سمجھتے ہیں

○ ان شہروں میں اُردو مادری زبان ہے۔ □ ان شہروں میں اُردو مروج ہے ⊕ ان شہروں میں اُردو سمجھی جاتی ہے۔

خادم التعلیم سٹیم پریس لاہور میں منشی عبدالعزیز مینیجر کے اہتمام سے چھپا
اور شیخ محمد اکرام اسسٹنٹ ایڈیٹر نے شایع کیا

خواہ وُہ کیسے ہی لائق اور قابل اور با اثر اور انکی کارروائیاں کیسی ہی باقاعدہ اور باترتیب ہوں - نہ ایک دو جماعتیں ہی کچھ کر سکتی ہیں اور نہ لاکھ دو لاکھ روپے سے کام نکل سکتا ہے - دُوسرے ملک والوں کی تائید سے بھی مطلب براری نہیں ہوتی - خواہ وُہ کیسے ہی با اقتدار ہوں حتیٰ کہ قوم فرماں روا کے افراد -

اس مہتم بالشان مقصد کے حاصل کرنے کے لئے اُس اتحادِ عام اور اتفاقِ کامل کی حاجت ہے جسکی تعریف کے لئے ایک عام فہم لفظ نیشن (قوم) کافی ہے - اوّل اس کے پیدا ہونے کی ضرورت ہے - اس امر کی تفصیل کی یہاں کوئی حاجت نہیں کہ ایک ملک کے رہنے والوں کا ایک بن جانا کن اُمور میں متحد اور متفق ہونے پر مبنی ہے - ہر ایک شخص اس سے کم و بیش واقف ہے - لیکن ان اُموُر میں اتفاق اور اتحاد پیدا نہیں ہو سکتا جب تک بعض لوگوں کے قلب میں ایسی حرارت اور حرکت پیدا نہ ہو جائے جیسی کسی عاشقِ صادق کے دِل میں ظاہر ہو کر اس کو سوائے اپنے معشوق کے ہر ایک شے سے مستغنیِ مطلق اور بے پروائے محض بنا دیتی ہے - صرف ایک ہی تصویر سامنے رہجاتی ہے - دوسری سب چیزیں اسی ایک ہستی میں غائب ہو جاتی ہیں - وُہ اسی ایک کی ذات میں محو و مستغرق ہو جاتا ہے - یہی برگزیدہ افراد ہیں - جن کو مبدءِ فیاضی سے وُہ مادۂ کامل عطا ہوتا ہے اور جس کی ذات میں وُہ صفات ودیعت کی جاتی ہیں جو اُن کے دُوسرے ہمعصروں میں نہ پائی جائیں یا اُن سے کم ہوں - اُنہیں کو سردارانِ قوم کہتے ہیں اور یہی قوم کے سچے عاشق کہلاتے ہیں - یہی گروہ نامدار ہے جسکی رائے کو تمام مُلک اپنا ہدایت نامہ بنا لیتا ہے اور ان کی پیروی جان و دل سے اختیار کر لیتا ہے - جب یہ کیفیت پیدا ہو جائے تو یقین کر لینا چاہئے کہ اس ملک کی تقدیر جاگنے کا زمانہ قریب آ گیا ہے - اور اس کی پُوری ترقّی کے سامان مہیّا ہو رہے ہیں - ہندوستان کی اسوقت ایسی ہی حالت ہے - علم و تہذیب میں روز افزوں ترقّی ہو رہی ہے اور ایک عرصے سے وُہ مبارک جماعتیں اور افراد جو واقعی قوم کے جان نثار ہُوا کرتے ہیں پیدا ہو گئے ہیں اور شب و روز مُلک کی بہبُودی کی فکر ہر طرح سے اپنی اپنی بساط کے موافق کر رہے ہیں - مگر افسوس کی

بات ہے کہ ان میں باہم وُہ اتفاق و اتحاد ابھی تک پیدا نہیں ہُوا - جس کو قوم کی رُوح کہ سکیں تاہم اس میں اُن کی بھی چنداں خطا نہیں - کچھ ایسے واقعات سدِ راہ ہو رہے ہیں جن کا رفع کرنا بڑا مشکل کام ہے - وُہی امور جن میں اتحاد ہونا چاہئے تھا اختلاف پیدا کر رہے ہیں - یعنی اختلافِ مذہب و زبان - حالانکہ اغراض عموماً مشترک ہیں -

مذہب بڑی چیز ہے اور اس سے زیادہ کوئی شے اہلِ ہند کو عزیز نہیں ہو سکتی - اِس کی نسبت تو گفتگو کرنا ہی محض فعل عبث اور تضیعِ اوقات ہے - اس کا فیصلہ تو اس سے بہتر اور کوئی نہیں ہو سکتا کہ ہم ایک دُوسرے کے عقائد کی عزت کریں اور کسی طرح ایک دُوسرے کے مذہبی خیالات کو قولاً یا فعلاً ہرگز ہرگز کوئی صدمہ نہ پہنچائیں بلکہ ادائے رسومِ مذہبی میں ایک دُوسرے کو ہر طرح مدد دیا کریں اور جہاں تک ہو سکے کوئی دقتیں یا پیچیدگیاں پیدا نہ ہونے دیں - نہ کسی کی دل آزاری ہو نہ دِل آزردگی - مگر دُوسری شئے - جو اتفاق و اتحاد کا جزو اعظم ہے وُہ زبان کا ایک ہونا ہے - اِس کے ذریعے سے ہم اپنے خیالات ایک دُوسرے پر اچھی طرح ظاہر کر سکتے ہیں - اِسی سے ہمدردی پیدا ہو سکتی ہے جو کسی وقت قومی اغراض و مقاصد کی تکمیل میں جان و رُوح کا کام دیگی - متفق ہو کر جو کام نکل سکتا ہے اس کی قدر سب کو معلوم ہے -

اِس وقت ہندوستان میں بہت سی مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں - پنجابی کی بات مدراسی نہیں سمجھ سکتا - بنگالی گفتگو کرے تو گجراتی مُنہ تکتا ہے - میانِ دوآب کا رہنے والا مرہٹی کا ایک لفظ نہیں جانتا - پھر بتائیے کہ اِن کے خیالات ایک دُوسرے کو کیونکر متاثر کر سکتے ہیں - ایک کے دِل کی بات دُوسرا کیونکر جان سکتا ہے - ہم زبان نہ ہونے کی وجہ سے باہم وہ میل جول نہیں ہو سکتا جو عاقبتاً قوم کے متفرق اجزا کو جمع کر دیتا ہے - پس ہم کو سب سے پہلے یہ فیصلہ کرنا چاہئے کہ کل ملک کے لئے ایک قومی زبان اختیار کریں - ہندوستان کی کل مروجہ زبانوں میں سے ایک کو یہ عزت دیں کہ جس پر کثرتِ رائے متفق ہو جائے - اسی کو قومی زبان مان لیں - اِس سے یہ لازم نہ آئیگا کہ ہم اپنے گھروں میں بھی وُہی زبان بولا کریں - ممالک برطانیہ اعظم میں آئرلینڈ والے کی اندرونی زبان

سکاٹ لینڈ کے باشندوں سے بالکل مختلف - ویلز والوں کے الفاظ اور محاورات انگریزی آئرش اور سکاچ سب سے علیحدہ - مگر قومی زبان سب کی ایک ہی یعنے انگریزی - اسی میں لکھتے پڑھتے ہیں - اسی میں علوم حاصل کرتے ہیں - یہی دفاتر کے کام میں آتی ہی - سرکاری ہوں یا تجارتی - اختلافِ مذاہب ان ملکوں میں بھی ویسا ہی ہی جیسا کہ ہندوستان میں ہی مگر زبان کے معاملے میں نہ کوئی تکرار ہی نہ فساد - قومی معاملات میں مذہب کا مطلق امتیاز نہیں - وہ معاملہ ہی دوسرا ہے - قومی فواید اور برکتوں سے ہر ایک یکساں مستفید و متمتع ہوتا ہی کیا آئرش اور کیا انگریز - کیا سکاٹ لینڈ کا رہنے والا کیا ویلز کا باشندہ - ہندوستان کے لئے بھی اسی طرح ایک عام قومی زبان قرار دی جائے اور اسی کے لحاظ سے ایک رسم خط بھی مقرر کرلیا جائے - اس کے قبول کرنے سے کسی کو کوئی مذہبی نقصان نہیں پہنچتا اور ایک بڑا مرحلہ طے ہو جاتا ہی - ہم یہاں کسی خاص مروجہ زبان یا رسمِ خط کی خصوصیت کرنا نہیں چاہتے - اس کو کثرت رائے سے طے کرانا چاہئے - ہندوستان میں دو ہی بڑے مذہب ہیں باقی انہیں کی شاخیں ہیں - عیسائی یا دیگر مذاہب کے پیروؤں کی تعداد بلحاظ قوم ہونے کے بہت ہی کم ہے اور وہ ایسے ہیں کہ ان کے عقائد پر کسی خاص زبان یا لغات کا کوئی اثر نہیں - جو کچھ دو بڑے گروہ یعنے ہندو و مسلمان مل کر باہم طے کرینگے اُن کو کوئی عذر نہ ہوگا - تاہم ان کی رائے کو بھی شریک کرلینا چاہئے - اس میں حرج ہی کیا ہی - انگریزوں میں باوجود اختلافِ مذاہب کے (عیسائی اور اُن کے بیشمار فرقے - یہودی - لامذہب - دہریئے - یونی ٹیرین یعنی موحدین وغیرہ) زبان کی نسبت کوئی جھگڑا نہیں کرتے - عبادت کے لئے عیسائی بالعموم انگریزی زبان سے کام لیتے ہیں مگر رومن کیتھلک فرقے میں اس غرض کے لئے لاطینی مروج ہی - اور یہودیوں میں عبرانی - مگر ملکی او قومی اغراض کے لئے صرف ایک زبان ہی - یعنی انگریزی اور اس ملک کے رہنے والے اس پر بلا لحاظِ ملت و مذہب فخر کرتے ہیں - کبھی انکو خیال تک بھی نہیں آتا کہ جو زبان گرجے میں بولی جاتی ہی وہی شراب خانوں اور رذیل ترین مقامات میں استعمال ہوتی ہی - اسی میں قانون کی کتابیں اور کلامِ الٰہی کی تفسیرات لکھی جاتی ہیں - اسی میں

مخالفینِ مذاہب کی حقیقت کے خلاف بحث اور اُن کی تردید میں کتابیں اور رسالے شائع کر دیں۔
غرضکہ ہم کوئی وجہ نہیں دیکھتے کہ ہندوستان میں ایک قومی زبان کل ملک کے مقرر کر لینے میں کسی کو کیوں عذر ہونا چاہئیے - کوئی نئی زبان اختراع کرنے کی ضرورت نہیں - اس وقت جو زبانیں رائج ہیں اُن میں سے ایک پر ہم کو متفق ہونا چاہئیے - وُہ اگر کسی قدر ناکافی سمجھی جائے تو اس میں دُوسری زبانوں سے مدد لے سکتے ہیں - رفتہ رفتہ ناقص ہونے کا عیب بھی نکل جائیگا - مگر ہم کو اس کے لئے آج ہی سے کوشش شروع کر دینی چاہئیے - تکمیل جب کبھی ہو - دُنیا میں یہی قاعدہ چلا آیا ہے -

انگریزی جو ہمارے فرماں روائے قوم کی زبان ہو وُہ کل ملک کی زبان تو دو سو برس میں بھی نہیں ہو سکتی مگر اس کے اثر سے بھی نہیں بچ سکتے اور نہ بچنے کی کوئی ضرورت ہو - اِس کے الفاظ کی آمیزش ہماری زبان میں اب بھی ہو گئی ہے اور آئیندہ بھی ہوتی رہیگی مگر بے ضرورت لفظوں کے لینے کی ضرورت نہیں - البتّہ اس کی احتیاط کرنی چاہئیے - جن الفاظ کے بغیر ہم اپنا مطلب ادا نہ کر سکیں یا جو زیادہ معنی خیز ہوں انکو شوق سے قبول کر لیں -

زبان کے ایک ہونے کی ضرورت کے تسلیم کرنے میں تو شاید کسی کو اختلاف نہ ہو مگر اس میں ضرور بحث ہوگی کہ کونسی زبان پر متفق ہونا چاہئیے - اِس مسئلہ پر غور کرنے کے وقت شاید یہ باتیں خیال کے قابل ہوں (اوّل) کونسی زبان ایسی ہو جو آسانی سے ہندوستان کے سب حصّوں میں پھیل سکتی ہو - کون سی زبان ہو جس میں ہر ایک حصّہ ملک کا حصّہ شامل کر لیا جائے تو اُس کی خوبی اور عام فہم ہونے میں فرق نہ آئے - ثقیل اور اجنبی بھی معلوم نہ ہو - جہاں تک ہو سکے سہل ہو اور اس کے لکھنے پڑھنے میں بھی ایسی ہی سہولت باقی رہے جیسی کہ اُس کے بولنے میں ہو - ابھی تک ہندوستان کی مروّجہ زبانوں کا دائرہ بہت ہی تنگ ہو - جہاں ذراسی آمیزش کسی دُوسرے حصّۂ ملک کی زبان کی ہوئی کہ اُسکو وُہ لوگ جو اپنے زعم میں اہل زبان ہیں فوراً مخلوط اور خلافِ محاورہ بتانے لگتے ہیں - کہہ دیتے ہیں کہ یہ خالص نہیں - اِس کے معنے گویا یہ

ہیں کہ ہم اپنی زبان کو محدود رکھیں - اس کو بڑھانا یا ترقی دینا گناہ ہے - مگر عاقبت اندیش اور ملک کی اصلاح اور فلاح چاہنے والے ان باتوں پر مطلق توجہ نہیں کیا کرتے - ہم کو اپنے محبوب کی آرائش و آسائش کے سامان جمع کرنے میں متفق ہونا چاہئے - یہی وہ محبت ہے جس میں رشک و رقابت کا پتہ نہیں - یہی وہ معشوق ہے جس کے حضور میں حریف شیر و شکر بنجاتے ہیں - جتنا کوئی اس کو پیار کرے اتنی ہی آپس میں محبت بڑھتی جاتی ہے بخلاف شخصی عشق و محبت کے جس میں حریف سے بڑھ کر دنیا میں کوئی دشمن ہی نہیں - غرض تو دونوں میں ہے مگر ایک کی غرض اپنی ذات تک محدود ہے - دوسرا قوم کے کل مجموعہ پر مفتون ہے - اور چاہتا ہے کہ ہر کوئی یکساں منتفع اور متمتع ہو - قومی فائدوں کے سامنے ذاتی منفعتیں معدوم ہو جاتی ہیں اور چھوٹے چھوٹے اختلافات اور ذاتی خواہشوں کو اس محبوب کے واسطے نثار کر دینا پڑتا ہے - زبان کے ایک بنانے اور اس کی اصلاحیں کرنے میں تو شاید بہت سی تکلیفیں برداشت کرنے کی نوبت بھی نہ آئے اور آئے بھی تو اُن بے انتہا فواید کے مقابلے میں جو ایک ملک کے رہنے والوں کو ایک قوم بن جانے سے حاصل ہوتے ہیں ان کی حقیقت ہی کیا ہے ہمت شرط ہے - آنکھ کھول کر دیکھ لیجئے کہ ہمزبان ہونے کا اثر پچھلی قوموں پر کیا ہوا ہے اور آج کیا ہو رہا ہے - اس معاملے میں جہاں تک غور و فکر کیا جاتا ہے سوائے اس کے اور نتیجہ نہیں نکلتا کہ ہمزبانی ہمقوم ہونے کی ترکیب میں جزو اعظم ہے +

حبیب احمد (از لنڈن)

ڈالی

(سلسلے کے لئے دسمبر ۱۹۰۴ء کا نمبر مُلاحظہ ہو)

ڈالی کے نام اور لباس میں تبدیلی کی ایک دو اَور باعث بھی ہوئے۔ شروع میں طاقت مُلکی ایک بادشاہ کے ہاتھ میں ہوتی تھی۔ جس کو تحفہ تحائف دیئے جاتے تھے۔ لیکن طاقت مُلکی کے وسیع ہو جانے پر جب یہ ناممکن ہو گیا کہ ایک واحد شخص جملہ طاقت کا اِستعمال خود کرے۔ تو اس بات کی ضرورت محسوس ہُوئی کہ ماتحتوں میں سے بعض سرکردہ اشخاص کو منتخب کر کے مختلف اختیارات و فرائض منصبی اُن کے تفویض کئے جائیں۔ اِس دستور نے ماتحت افسروں کے اختیارات کا دائرہ وسیع کر دیا اور چونکہ کسی پر مہربانی کرنا یا کسی کو کوئی خاص رعایت دیدینا اُن کے اختیار میں آگیا۔ اسواسطے لوگوں کو مثل بادشاہ کے حکّامِ ماتحت کی دلجوئی اور خاطر داری مطلوب ہُوئی۔ تحفہ تحائف علاوہ حاکم اعلیٰ کے حکّامِ ادنیٰ کو دیئے جانے جاری ہُوئے۔ خصوصاً جبکہ شروع میں حکّامِ ادنیٰ کی تنخواہ کارکردگی سرکار سے مقرر نہ تھی۔ اور رعایا کے تحفہ تحائف ہی وسیلۂ آمدنی تھے۔ جب طاقتِ مُلکی ماتحتوں پر منقسم ہُوئی۔ اسوقت بادشاہ کی طرف سے معاوضۂ خدمات ادا کرنے کی رسم نہ تھی۔ یہ ایک مابعد کا قصہ اور پیچھے کا خیال ہے۔ شروع میں بلکہ ماتحت سے بادشاہ کچھ بطور باج یا خراج کے لیتے تھے نہ بجائے اس کے کہ شاہی خزانے سے کچھ اسکو دیویں۔ گورنر یا صوبے کے حاکموں۔ یا ضلع داروں کے لئے اختیارات تفویض شدہ کا قبول کرنا باعثِ اعزاز و فخر سمجھا جاتا تھا۔ اور اظہارِ اطاعت کے ساتھ ہی وسیلہ آمدنی ذاتی تنخواہ کا کوئی ذکر نہ ہوتا تھا۔ برعکس اس کے ماتحت اِستعمال اختیارات عطا شدہ سے خود جو آمدنی پیدا کرتا تھا۔ اس کے ایک جُزو یا ایک رقم یعنی بطور خراج اعلیٰ حاکم کو دی جانی مقرر ہوتی تھی۔ اِس سے زیادہ جب خراج یا باج ایک فرض اور ذمّہ واری ہو گئی۔ تو بادشاہ کی خصوصیت سے رضاجوئی کے لئے علاوہ مقرّرہ خراج کے بیش قیمت تحفہ تحائفِ ہر قسم مثلاً ہاتھی۔ گھوڑے۔ سونے چاندی کے برتن

زیور وغیرہ بطور اظہار مطابعت بھی جاری ہو گئے۔ لیکن بادشاہ کی طرف سے اگرچہ بعض اوقات بطور اظہار خوشنودی کچھ عطیہ دیا جاتا تھا۔ مگر وُہ تنخواہ یا معاوضہ کارکردگی نہ ہوتا تھا مغلیہ بادشاہان کے وقت صوبہ بنگال و دیگر سرداران کی آجکل کے گورنر و لفٹننٹ گورنروں کی طرح تنخواہ ماہانہ یا سالانہ مقرر نہ تھی۔ حکامِ مقررہ شدہ کو آزادی تھی کہ اختیارات تفویض شدہ برتیں اور جن کے حق میں وُہ اختیارات استعمال ہوں۔ اُن سے آزادی کے ساتھ معاوضہ لیویں۔ دُوسرے الفاظ میں رشوت لوٹ کھسوٹ کے ذریعے سے خواہ کچھ پیدا کریں۔ بادشاہ کو حصہ آمدنی یعنی مقررہ خراج اور اس کے علاوہ وقتاً فوقتاً خاص تحائف دیدیویں۔ اطاعت و وفاداری کا اظہار اس طریق سے کریں گو اندرونی معاملات میں پُورے طور پر خود مختار رہیں۔

تمدن جب ترقی کر جاتا ہے تو یہ حالت تبدیل ہوجاتی ہو اور وُہ صورت پیدا ہو جاتی ہو۔ جو یورپ و دیگر ترقی شدہ مہذب ممالک میں دیکھی جاتی ہو۔ اور جس کا پھل ہم کو بھی بوجہ برکات سلطنتِ انگریزی حاصل ہو رہا ہے۔ یعنی جو حکام سرکاری طور پر ضرورتِ انتظامِ ملکی کی وجہ سے مقرر ہیں۔ ان کو سرکار خزانے سے معاوضہ اُن خدمات کا دیتی ہو۔ اور رعیت سے صرف مقررہ ٹیکس وغیرہ لے لیتی ہو۔ حاکموں اور افسروں کے لئے نج کے طور پر کوئی معاوضہ فرائض منصبی کے انجام دہی کا لینا۔ یا کچھ معاوضہ کسی قسم کا لیکر فرائضِ منصبی کی سرانجامی میں کسی کے ساتھ رعایت کرنا۔ رشوت کے نام سے موسوم ہو کر جرم قرار دیا جاتا ہو۔ اور جو شخص اس قسم کا معاوضہ دیوے اسکو بھی شریک جرم سمجھا جاتا ہو اس کے بعد اگر ڈالی رشوت کے طور پر قائم رہے اور لوگ منفعتِ ذاتی کے اغراض سے خفیہ طور پر نقدی یا مال حکام کو دیں۔ یا افسر ذاتی لالچ اور بے ایمانی سے ناجائز معاوضہ خدماتِ منصبی کا لیں تو بادشاہ کا قصور نہیں بلکہ رعایا کا یعنے رعایا کے ایک حصے کا جو رشوت دیتا ہو اور اس کے دوسرے حصے کا جو رشوت دیتا ہو۔ رشوت کی حالت چُونکہ سلسلے میں تنخواہ سے پہلے۔ اور تنخواہ کے مقرر ہونے کے بعد بھی موجود ہوتی ہو۔ اس لئے بعض لوگ جو اِس ارتقا پر پُورا غور نہیں کرتے۔ وُہ تنخواہ کی حالت کے بعد رشوت کو موجود دیکھ کر۔ اور پیشتر کی حالت سے ناواقف ہونے کی وجہ سے۔ رشوت کو اعلیٰ حالت سے تنزل

کی حالت بیان کرنے لگ جاتے ہیں - حالانکہ امر واقع یہ ہے کہ یہ تمدن کی ایک ادنیٰ حالت کا خاصہ ہے جو اعلیٰ حالت میں بھی موجود ہے - یہ تنزل کی علامت نہیں ہے - بلکہ اس کا وجود اس بات کا ثبوت ہے کہ ترقی کی حالت میں پرانی ناقص حالت کے نشانات ابھی کلی طور پر معدوم نہیں ہوئے -

آخر میں جب رشوت کا عیاں طور پر لیا جانا - یا دیا جانا داخلِ جرائم ہو جاتا ہے - تو ڈالی کی شکل میں بڑی بھاری تبدیلی واقع ہوتی ہے - اس میں علاوہ اپنے ذاتی حظ کے جس سے محض حصولِ خوشنودی مطلوب ہوتا ہے - فرضی یا نمائشی طور پر افعالِ محبت کا خاصہ بھی مختلف ہو جاتا ہے - موجودہ ضرورت کا خیال تو چنداں نہیں ہوتا - ہاں آیندہ ضروریات کا خیال کرکے اور یہ دیکھ کر کہ فلاں شخص کے اختیار میں میری نسبت کچھ احکام صادر کرنا ہے - بطورِ اظہار دوستی اطاعت یا نیاز کے کچھ تحفہ دیدیا جاتا ہے مدعا ڈالی کے صاف طور پر دو ہوتے ہیں - ایک تو لینے والے کی طبیعت خوش کی جاتی ہے - اور اس میں ایک دوستانہ خیال جو آیندہ مفید پڑتا ہے پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے - دوسرا چونکہ اس فعل سے مقصود رضاجوئی ہوتا ہے اور ساتھ ہی اظہارِ مطابعت - دوسرے کی طبیعت میں ایک قسم کی شفقت آمیز حکومت کا سرور پیدا کیا جاتا ہے - ڈالی لینے کے بعد نگاہوں کا عتاب باعثِ شفقت اور تلطف سے متبدل ہو جاتا ہے جس سے ڈالی دینے والے کو آیندہ فوائد کی اُمید بندھ جاتی ہے - چونکہ ڈالی سے تعلقاتِ دوستانہ کا اظہار مقصود ہوتا ہے - اور یہ کسی خاص غرض پر محمول نہیں ہوتی - اس لئے دوستانہ طور پر اسے قبول کیا جاتا ہے - اور قانونی گرفت کا بھی کوئی خیال نہیں ہوتا - موجودہ شکل میں یہ رسم پوری آزادی کے ساتھ قائم ہے - تاہم گورنمنٹ نے مصلحتاً دو طریق سے اسکو محدود کرنا مناسب سمجھا ہے - اوّل ماتحتوں سے ڈالی لینے کی ممانعت کردی ہے - دوم خاص قیمت سے زیادہ کی ڈالی روک دی ہے - لیکن ڈالی اس محدود شکل میں پورے طور پر مروج ہے - اور اسکو معیوب نہیں سمجھا جاتا - خوف ہے تو صرف یہ کہ کہیں جس طرح سے پہلے طریق حصول خوشنودی عام ہو کر غیر لازمی سے لازمی ہو گئے - اور رواج یا قانون بن گئے - یہ بھی ایک تمدنی قانون نہ بن جائے - اور جو شخص کسی افسر کو سلام کرتے وقت ڈالی پیش نہ کرے وہ موردِ عتاب نہ سمجھا جاوے -

اس بیان سے ا۔ "یہ پایا گیا کہ ڈالی نے وقتاً فوقتاً خاص خاص اسباب کے اثر سے خاص خاص صورتیں اختیار کی ہیں"۔ یعنی شخص غالب کے خوف سے اور مصلحتاً اسکو خوش کرنے کی نیت سے خود بخود تحفہ تحائف کا دیا جانا شروع ہوا۔ بعدازاں بادشاہ کے لئے تحفہ تحائف لازمی ہو گئے اور ٹیکس اور مالگذاری وغیرہ کی شکل میں بادشاہ کی مستقل آمدنی کا ذریعہ بنگئے۔ اس کے بعد خصوصیت سے بادشاہ کو راضی رکھنے کی غرض سے بوقت ملاقات نذر نذرانہ پیش کرنے کی رسم پیدا ہوئی۔ جس سے اصل مطلب ڈالی کا فوت ہو گیا۔ پھر خاص امداد شاہی کے حصول کی غرض سے خاص فیس۔ بعدازاں مقررہ فیس یعنی رسوم عدالت وغیرہ کا دیا جانا شروع ہوا۔ ادنیٰ حکام کی صورت میں بھی نذر نذرانہ کی رسم جاری ہو گئی جب ایک شخص مطلق العنان کے اختیارات دیگر افراد پر منقسم کئے گئے۔ اور چونکہ شروع میں تنخواہ ملازمان سرکاری ذمہ سرکار نہ ہوتی تھی۔ رشوت کا رواج تقویت پکڑ گیا۔ تنخواہ مقرر ہونے پر بھی ادنیٰ حالت کی رسم رشوت قائم رہی۔ اس کے بعد چونکہ بظاہر خود غرضانہ نیت سے تحفہ دینا جرم ہو گیا۔ اس لئے دوستانہ طور پر ڈالی دیا جانا مروج ہوا۔

ب۔ یہ بھی ثابت ہوا کہ حقوق شاہی مستقل طور پر قائم ہو جانے کے بعد بھی شروع میں کوئی قانون یا خاص حکم نہ تھا جس کی تعمیل میں بادشاہ کی مطابقت دکھلائی جاوے۔ صرف بادشاہ کے خوش کرنے میں اور خود بخود تحفہ دینے میں یعنی بیرونی علامت اطاعت متصور تھی۔ بادشاہ کی مطلق العنان وغیر معین خواہش ہوتی تھی جس کو پورا کرنا ہی داخل فرمانبرداری تھا۔ بعدازاں ترقی شدہ حالت میں قوانین بن گئے۔ ہر ایک کی ذات و جائداد محفوظ کی گئی۔ اور بادشاہ کی حکومت کے برخلاف کوئی فعل کرنا۔ یا کسی دوسرے شخص ماتحت کو ضرر یا نقصان پہنچانا جرم ہو گیا۔ بادشاہ کا حق صرف جزو جائداد رعایا پر قائم کیا گیا۔ اور اس طریق مطابعت کے علاوہ اگرچہ کوئی فرض یا ذمہ واری نہیں تھی کہ بادشاہ کو خوش کیا جاوے۔ تاہم آغاز رسومات کا ہو گیا۔ جن سے بیرونی علامت کے طور پر اظہار اطاعت مطلوب تھا۔ قانون نے اس قدر ترقی کی کہ خود بادشاہ تابع قانون ہوا۔ یہ سب سے اعلیٰ و آخری حالت ہے کہ سکرٹری آف سٹیٹ پہ نالش ہو سکے۔ یا ز در حکومت کو ترک کرکے ایک ماتحت سائل کی طرح

اصولِ انصاف و قانون کے مطابق اپنی عدالتوں سے سرکار خود استدعائے حق کرے - سکول ایبٹ آباد

کے متعلق سرکار کا خود مدعی بنکر رعایا پر دعویٰ کرنا - اور فیصلہ خلافِ سرکار ہونا - اور اس قسم کے بہت سے نظائر نہایت حیرت انگیز ہونگے - اُن اشخاص کے لئے جو اس خیال سے واقف نہ ہو گئے ہوں - لیکن گو اس ترقی شدہ حالت میں قانون کی پابندی - احکامِ شاہی کی تعمیل ہی اصل مطابعت سمجھی گئی اور مستقل طریقِ عمل قائم ہو گیا جس سے بادشاہ کی خوشنودی حاصل ہو سکے - تاہم سابقہ ادنیٰ حالت کی رسومات اور اُس زمانہ کے خیالات (کہ ڈالی اور تحفہ تحائف ہی سے حاکم کی خوشنودی ہو سکتی ہی) کو بھی ساتھ ہی چسپاں رکھا گیا - اگرچہ ضروری اور غیر ضروری مطابعت میں امتیاز ضرور کیا گیا - بعض اشخاص صرف ضروری مطابعت یعنی پابندی قانون کو ہی مدنظر رکھتے ہیں - زیادہ تر اشخاص غیر ضروری مطابعت یعنی فالتو رسومات ڈالی وغیرہ کو بھی ویسا ہی مقدم جانکر جاری رکھتے ہیں -

یہاں تک تو ہم نے ڈالی کی مختلف صورتوں یعنی ارتقار پر بحث کی ہر اب ہم یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ سوسائٹی کی ملکی حالت کی طرح مذہبی حالت میں بھی یہی اصُول ارتقار عمل کرتا رہا ہے جسکی وجہ سے بعض ابتدائی خیال تبدیل ہوتے ہوتے عقاید مذہبی بن گئے ہیں -

آغاز تمدن میں عام عقیدہ تھا کہ ہر ایک انسان میں ایک دوسرا مثنیٰ ہے جو بحالتِ زندگی موجود ہوتا ہی - اور بحالتِ موت نکل جاتا ہی یا علیحدہ ہو جاتا ہی - خواب کی لوگ اس طرح تعبیر کیا کرتے تھے کہ جب بیرونی جسم بے حس و حرکت ہو کر رات کو ایک جگہ پڑہ رہتا ہی مثنیٰ جسم سے نکل کر ہر ایک جگہ کی سیر کرتا پھرتا ہی اور مختلف نظارے دیکھ کر صبح اپنے صدر مقام یعنی جسمِ کثیف میں آ موجود ہوتا ہے -

اس مثنیٰ میں ہر قسم کی خواہش نفسانی کا وجود تسلیم کیا جاتا تھا - انسان قدیم کے نزدیک ان دونوں میں فرق صرف یہی تھا کہ انسان کا ظاہری بدن کثیف ہی - اور مثنیٰ کا بدن غیر مرئی ہے - جس طرح ہوا کی موجودگی ہوا کے چلنے اور طبعی دنیا میں اثر ڈالنے سے ثابت ہوتی ہی - اسی طرح سے زندہ اشخاص پر بیماری - تکلیف - خوشی وغیرہ مختلف آثار کے نمایاں ہونے سے علت -

اس غیر مرئی شئے کو قرار دیا جاتا تھا - خدا کا خیال یا دیوی یا دیوتا کا خیال انکی طاقتِ دماغی سے باہر تھا - وُہ ہر ایک رنج و راحت کو مردہ کے شئے سے متعلق کرتے تھے - یہ عقیدہ آجکل بھی بہت سی وحشی اقوام میں پایا جاتا ہے -

اس مردے کے شئے کی نسبت یقین تھا کہ نقصان و فواید زندہ انسانوں کو پہنچا سکتا ہے - اور ساتھ ہی اس میں انسانی جذبات اور خواہشیں موجود مانی جاتی تھیں - اِس لئے یہ عقیدہ تھا کہ مردے کے شئے کو بھوک - پیاس لگتی ہے - سردی گرمی محسوس کرتا ہے اور خوش اور ناراض مثل انسان کے ہو سکتا ہے - اِس عقیدے کی وجہ سے مردے کے شئے کی رضاجوئی شروع ہوئی - جس طرح کہ ملکی حالت میں شخص غالب کی رضاجوئی تحفہ تحائف سے شروع ہوئی تھی - اور اس کی علت غائی وُہی مصلحت تھی کہ پیشتر اِس کے کہ یہ ناراض ہوکر نقصانِ مال یا نقصانِ جان پہنچاوے - خود بخود جزو جائداد یا کچھ جاندار شئے دیکر اس کو راضی کر لیا جائے - سوسائٹی کی ادنیٰ حالتوں میں سے تحفہ دینا جرم خیال سے وُہ رسُوماتِ مرگ قائم ہوئیں - جن میں غذا اور لباس - شخص مردہ کے لئے مہیا کئے جاتے تھے - آجکل بعض حبشی اقوام افریقہ اور ہندوستان کے بھیلوں - سنتھالوں میں یہ رسُومات ہیں - اور اِنکی وجہ صاف طور پر مذکورہ بالا خیال معلوم ہوتا ہے - کیونکہ جن اقوام میں اب بھی یہ دستور باقی ہے - وُہ ساتھ ہی مُردہ کو غذا و لباس دیتے وقت اس طرح سے مخاطب ہوتی ہیں - کہ "اے مہربان بزرگ یہ غذا کھالو - پوشاک پہن لو - اور ہم پر نظرِ عنایت رکھو - جیسا کہ حالتِ زندگی میں رکھتے تھے" - ہمارے ہندوؤں میں پرانی قسم کے خیالات کے اشخاص میں یہ عقیدہ موجود ہے - رسُوم مذہبی مثلاً سرادھ - پنڈ - کریا - دھرم شالہ وغیرہ کا آغاز اس ابتدائی خیال سے ہوا - گو بعد میں ترقی شدہ حالت کے وقت - جب یہ خیال ابتدائی جاتا رہا - تو یہ رسُوم بطور افعالِ محبت قائم رہیں - مستورات سے اکثر سُننے میں آتا ہے کہ "ہے وڈ وڈیریو - ساڈی بھُل گھُت معاف کرو - (اے بزرگو! ہمارا کہا سُنا معاف کرو) جس سے صاف طور پر پایا جاتا ہے کہ بزرگوں کے مردے کے شئے کی بابت اُن کا عقیدہ ہے کہ زندہ انسانوں کے ساتھ تعلق باقی رکھتا ہے - اور کہ اُن میں ناراضی اور راضی ہونے کا مادہ موجود ہے -

(باقی آئندہ)

موسیقی

موسیقی اور حُسن دو ایسی دلپذیر چیزیں ہیں کہ اگر جادو کا فعل (فی الواقع) صرف اپنے معمول کو مسخر کرلینا ہی ہوتا ہے۔ تو یہ دونو بلاشک جادو اور چلتا ہُوا جادو ہیں۔

انسان جس طرح بالطبع حُسن پسند واقع ہوا ہے۔ موسیقی پسند بھی واقع ہوا ہے۔ اور ان دونوں کا طبیعتِ انسانی پر کم وبیش یکساں اثر ہوتا ہے۔ دونوں متحد الکیفیت ہیں۔ دونو دلگداز۔ دونوں رُوح پرور ہیں۔ دونوں جاں نواز۔ دونوں کی داہ میں شائبہ آہ موجود ہے۔ اور (قطع نظر بعض مستثنیات) دونوں دردانجام ہیں۔

بحسب ظاہر موسیقی اور حُسن میں کچھ مماثلت و تعلّق معلوم نہیں ہوتا۔ یعنی ایک کو مطلق سامعہ سے واسطہ ہے۔ دوسرے کو مطلق باصرہ سے۔ ایک غیر مرئی شے ہے۔ دُوسری مرئی ہے اور مرئی بھی کیسی؟ یہ نہ بتایا جائیگا!! لیکن اگر بغور دیکھا جائے۔ تو دونو میں باہمد گر معنوی توافق و تناسب موجود ہے۔ حُسن۔ خاموش موسیقی (رنگینی) لئے ہُوئے ہے۔ اور موسیقی۔ حُسنِ مستور۔ جسکو آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں۔ مگر کانوں کی راہ قلب پر وُہی کیفیت طاری ہوجاتی ہے۔ جو آنکھوں سے کسی حسین کو دیکھ کر۔

دونوں میں دِل گدازی کی وُہ اعلیٰ صفت مضمر ہے۔ جو آدمی کو انسان اور انسان کو فوق الانسان بناتی ہے۔ دِل۔ گداز ہو کر ہی لذّتِ درد کا مزہ چکھ سکتا ہے۔ جس سے قلبِ انسان میں۔ صوفی صافی منش۔ اہل اللہ۔ اور خلیفۃ اللہ وغیرہ کا پورا مصداق بننے کی اہلیت پیدا ہوجاتی ہے۔ لذّتِ درد کیا شَے ہے؟ اُس کی کیفیت کوئی کسی اہل دل سے پُوچھے۔

بس موسیقی اور حُسن وُہ نسخۂ اکسیر ہیں۔ جو بے واسطہ دل کو گداز کر کے اُس میں درد پیدا کرتا ہے۔ اور دلِ گداختہ ہی ہے۔ جو انسان کو مرتبۂ انسانیت سے بڑھا کر۔ ملکوتی صفات بنا سکتا ہے۔

جس طرح اطبا نے امزجۂ نباتات تشخیص کر کے اُن کے اثرات بالکیفیت والخاصیت علیحدہ علیحدہ بیان کئے ہیں۔ اسی طرح ماہرانِ موسیقی نے ہر راگ اور راگنی کی جداگانہ طبیعتیں بیان کی ہیں۔ اور ان کا مزاجِ انسانی پر ایک حدتک طبّی اثر پڑتا ہے۔ فوری خوشی۔ فوری جوش۔ فوری جُرأت۔ فوری اُمنگ۔ فوری ولولہ (اور بعض خاص صُورتوں میں) فوری درد پیدا ہونا۔ بلاشبہ طبی پہلو لئے ہُوئے ہے۔ جس طرح بعض ادویات اگر انہیں ترکیب اور مقدار معیّنہ سے باقاعدہ طور پر بے کم و کاست استعمال کیا جائے۔ معدہ مریض میں پہنچتے ہی اپنا فوری اثر ظاہر کرتی ہیں۔ اسی طرح اگر کوئی باخبر اور بااصُول گوّیا کوئی راگ یا راگنی اُس کے ہر ایک سُر پر نظر کر کے باقاعدہ اور صحیح طور سے گائے۔ تو ضرور اور فوراً اس کا اثر سامعین پر پڑیگا۔ اسی بنا پر میگھ کی چیزوں سے خودبخود ایسا محسوس ہوا کرتا ہے۔ کہ ان کو برسات سے کچھ مناسبت سی ہے۔ دیکھا گیا ہے کہ رات کے نو یا دس بجے کوئی رام کلی یا پرج گانے لگا۔ الاپ کے ساتھ ہی ایسا معلوم ہوا کہ گویا سپیدۂ سحری نمودار ہے اور مُرغانِ خوش الحان مصروفِ نواسنجی و زمزمہ پیرائی۔ درباری کا دن میں کبھی وُہ لطف نہ آیا۔ جو رات کے وقت۔ وَقِس علےٰ ھٰذا۔ اسی کا نام ہے خاصیتِ مزاجی۔ اِس سے میری مراد یہ نہیں کہ رات کی چیزیں دن میں اور دن کی رات کو کام نہیں دیسکتیں۔ نہیں لطف دیجاتی ہیں۔ مگر کیسا؟ جیسا بے فصل کا میوہ!!

بعضوں کا خیال ہے کہ جو لوگ فنِ موسیقی میں علم تامہ رکھتے ہیں۔ انہی کو صبح کی راگنی سے رات کو صبح کا سماں۔ اور میگھ کی چیزوں کو برسات سے مناسبت اور تعلّق سا محسوس ہو سکتا ہے۔ ناواقفوں کو نہیں۔ اگر ناواقفوں سے اُنکی مراد حیوان ناطق ہے۔ یعنی جنہیں اچّھی بُری چیز کا احساس و تمیز نہیں تو بیشک انکا خیال صحیح ہو سکتا ہے۔ ورنہ معلومات کو تاثرات میں کچھ دخل نہیں۔ ہم عطر کا بکس ایک بھرے مجمع میں کھولتے ہیں۔ عطر کی خوشبو سے ہر شخص کا دماغ طبلۂ عطّار بن جاتا ہے۔ جو لوگ حنا۔ جوہی۔ کیوڑے۔ گلاب وغیرہ میں تمیز کر سکتے ہیں۔ لُطفِ خوشبو اُنکو بھی اسی قدر حاصل ہوتا ہے۔ جتنا دوسروں کو۔ فرق صرف اس قدر کہ وُہ اس پہیلی کو بوجھ لیتے ہیں۔ اور یہ محظوظ ہوتے ہیں۔ مگر جس طرح گونگا گڑ کھا کر شیریں کام ہوتا ہے۔ مگر بیان نہیں کر سکتا۔ اسی طرح یہ اُن کیفیات کو تو بتا سکتے ہیں۔ مگر راگنی کا نام نہیں بتا سکتے

ایسا ہی عطرِ خس جاڑے میں اور حنا برسات میں بے موسمی سے معلوم ہوا کرتے ہیں - مگر انکی طبیعت اور مزاج میں کچھ فرق نہیں آتا - بعض حضرات موسیقی کو علیٰ حدِ ذاتہ موثّر نہیں مانتے اور فرماتے ہیں کہ جس چیز سے دل متاثر ہوتا ہے - اُسکا نام نازک آوازی اور خوش گلوئی ہے " بے شک نازک آوازی بھی قابلِ قدر چیز ہے - مگر بلا موسیقیت - جسدِ بے روح - نری آ آ سے خاک اثر نہیں ہو سکتا - مثالاً موسیقی کے لئے نازک آوازی کو سونے پر سہاگہ کہہ سکتے ہیں - مگر نازک آوازی محتاجِ موسیقی ہے اور موسیقی محتاجِ نازک آوازی نہیں -

اِنسان تو بھلا اشرف المخلوقات ٹھہرا - ہر اچھے بُرے کو بخوبی سوچ سمجھ سکتا ہے - موسیقی کے بذاتہ موثّر ہونیکا اس سے بڑھکر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے - کہ حیوانات تک کو مسخر کر لیتی ہے - ذرا اُونٹ کے بے ڈھنگے پن اور تن و توش پر نظر ڈالئے - اور ذرا سے بوجھ سے بلبلا اُٹھنے پر - عرب کے حدی خوان - معمول سے منوں زیادہ بوجھ لادکر - حدی خوانی شروع کرتے ہیں - اور ماشاءاللہ آپ (اونٹ) عالمِ محویت میں بے تکان - چپ چپاتے منزلیں کی منزلیں طے کر جاتے ہیں - آہوئے وحشی کو رام کرنے کی ایک تدبیر یہ بھی ہے کہ اُس پر بانسری کے ذریعے سے اثرِ موسیقی ڈال کر - از خود رفتہ اور محو کر کے گرفتار کرتے ہیں - سانپ جیسا موذی جانور کہ انسان کے سائے سے بھاگے اور قابو پائے تو فنا کر ڈالے - ابھی بانبی میں کُنڈلی مارے دُنیا و مافیہا سے بے خبر گوشۂ تنہائی کے مزے لُوٹ رہا تھا - جوں ہی سپیرے نے آکر بین بجائی - حضرت لہراتے ہُوئے رونق افروزِ سطحِ زمین ہُوئے - کون کھینچ لایا؟ حسنِ موسیقی - بچے کو دیکھئے بے چارہ پنگھوڑے یا کھٹولے پر پڑا - کیسا بلک بلک کر رو رہا تھا - ابھی ماں نے ذرا تھپک کر اپنی لَے میں لوری دینا شروع کی کہ سو گیا - غرض یہ کہ موسیقی بذاتہ موثّر اور بجائے خود عملِ تسخیر ہے -

موسیقی کو محض کھیل تماشا اور صرف وجہ تفریح قرار دے لینا سخت ناحق شناسی اور ناقدردانی ہے - ہمیں اس سے بہت سے علمی و قوائی فوائد حاصل ہوتے ہیں - غور کی عادت - تفتیش کی قابلیت تحصیل میں رسائی - حافظے میں تیزی - دماغ میں مشقِ نکتہ رسی ممیزہ و مدرکہ میں قوتِ تمیز و ادراک پیدا

ہوتی اور بڑھتی ہے اور انسان بال کی کھال نکالنے لگتا ہے۔ روح تازہ ہوتی ہے۔ طبیعت کی ماندگی اور کسل دُور ہوتی ہے۔ قلب میں فرحت اور مزاج میں شگفتگی آتی جاتی ہے۔ یکسوئی حاصل کرنے کا بہت اچھا آلہ ہے۔ جن مذاہب میں گانا داخلِ طریقِ عبادت ہے۔ اس کی فلاسفی کیا ہے؟ یہی۔ علم مسمریزم میں جو اسکو داخلِ اصول کیا گیا ہے۔ کیوں؟ اِس لئے کہ اس سے یکسوئی بھی حاصل ہوتی ہے۔ بہرحال موسیقی ایک بکارآمد اور مفید شئے ہے۔ جسے علمِ ریاضی کا ایک شعبہ کہہ سکتے ہیں۔ جس چیز میں اتنی خوبیاں ہوں بلاشبہ قابلِ قدر ہے۔ مگر دیکھنا یہ ہے۔ کہ اس کی کہاں تک قدر ہوئی۔ ہمیں زمانۂ گذشتہ کی (اسلامی یا غیراسلامی دُنیا) سے استدلال کرنے کی یہاں ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ کیونکہ اگر اس وقت بھی اس کی یہی گت ہوتی۔ جیسا کہ اب حالت کس مپرسی میں ہے۔ تو آج ہمیں لفظِ "موسیقی" کتابوں میں بھی بڑی تلاش سے ملتا۔

اِس میں کچھ شک نہیں کہ یہ فن بڑا لطیف اور بہت شریف فن تھا۔ حکماء کے گھر میں پیدا ہوا۔ اُنہی کی گود میں پرورش پائی۔ بڑھا۔ صلحا بھی محبت کی نظر سے دیکھنے لگے (اگرچہ زیادہ مُنہہ نہ لگایا) علماء میں بھی بے وقعت نہ رہا۔ ترقی کی۔ اور دربارِ اُمراؔ و خلفاء تک رسائی ہوئی۔ سُوءِ اتفاق سے ایک ایسی نااہل قوم کے پلے بندھا۔ جو مُلک میں بلحاظ تمدّن و معاشرت ادنیٰ ترین و ذلیل سمجھی جاتی تھی۔ اُن کمینوں نے اسے اپنا وجہ معاش قرار دیکر اور صرف اپنی جائداد سمجھ کر خاص اپنی قوم میں محدود کر لیا۔ اور اس کی اشاعت میں اس قدر بُخل روا رکھا کہ شاید کاشی جی کے پنڈتوں نے تعلیم علم سنسکرت میں بھی اسقدر کنجوسی نہ برتی ہوگی۔ گویا طوطی را بازاغ در قفس کردند۔ جوں جوں زمانہ گذرتا گیا۔ ووں ووں یہ اعلیٰ سوسائٹی سے دُور ہوتا گیا۔ شرفاء سنجبا۔ بنظرِ حقارت دیکھنے لگے۔ اور کمینوں سے اس کی خصوصیت و اتحاد بڑھتا گیا۔ "صحبتِ صالح ترا صالح کند" کی ذیل میں آگیا۔ ان کمینوں کی نسبت سے لوگ اِسے بھی کمینہ سمجھنے لگے۔ اور اُن نالائقوں نے اُسے ایسی بد ذوقی اور بے احتیاطی سے استعمال کیا۔ کہ لحن داؤدی کی سی نایاب شئے بھی ممنوعات شرعی میں داخل ہو گئی۔ ایسی حالت میں یہ فن کیوں نہ نیچا دیکھتا۔ نیچا دیکھا اور ایسا۔ کہ آج اس قوم میں بھی فی صدی ایک آدھ شخص ہی ایسا مل سکتا ہے۔ جو اس کے اصول و قواعد سے کماحقہ باخبر ہو!!!

(باقی آیندہ)

خوشی کی بات ہو کہ آج کل اعلیٰ طبقے کے لوگوں اور مہذب جلسوں میں باجوں گاجوں کے توسّل اور معرفت سے اسکی آؤ بھگت ہونے لگی ہو۔ اگر اب بھی اس کی حفاظت نہ ہُوئی اور اس پر توجہ نہ کی گئی تو وُہ زمانہ دُور نہیں کہ بعض قوموں کی طرح روئے زمین پر اس کا بھی نشان نہ ملیگا +

سیّد علمدار حسین

اِس دفعہ جو دُو تصویریں ہدیۂ ناظرین کی جاتی ہیں وُہ دو ایسے مشاہیر کی ہیں جو اپنے اپنے طبقے میں نہایت ممتاز ہیں :-

خان بہادر مولانا سیّد علی محمّد صاحب رئیسِ عظیم آباد مدّ ظلہ العالی کی زیارت کے ناظرین بیتابی کے ساتھ منتظر ہونگے۔ آج ہم اس تصویر کو شائع کر کے اُن کے دیدۂ مشتاق کو نورانی کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ آیئے دیکھئے یہ ہیں وُہ بزرگ جن کے کلام کو پڑھ پڑھ کر آپ سر دُھنتے رہے ہیں جن کے مضامین کی پاکیزگی خیالات کی نفاست زبان کی سلاست بیان کی متانت بندشوں کے بیساختہ پن اور اُستادانہ قادرالکلامی کے آپ قائل ہو چکے ہیں۔ آیئے اور اُنکی زیارت کیجئے۔ ع صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے +

منشی محبُوب عالم صاحب ایڈیٹر و مالک پیسہ اخبار لاہور کے مضامین سے مخزن کے صفحات ایک آدھ دفعہ زینت حاصل کر چکے ہیں اُردو اخبار نویسی کی جو خدمات ان کے قلم اور دماغ نے کی ہیں اُن کو اب ابنائے زمانہ نے تسلیم کر لیا ہے۔ اُردو اخبارات کے دیکھنے والوں کے معلومات کو وسیع کرنے اور مفید اور دلچسپ خبریں اور مضامین بہم پہنچانے میں پیسہ اخبار لاہور خاص امتیاز رکھتا ہے۔ اور یہ سب کچھ اُن کے فہم رسا اور تجربے کا نتیجہ ہے +

قومیّت

ازصراط المستقیم قوم پا بیروں منہ
چوں گسست از رشتہ سوزن ز خود را گم کند

دُنیا کی قوموں میں خواہ کتنا ہی بُعد اور ما بہ الامتیاز ہو اور خواہ کتنے ہی اختلافات اور تضاد پائے جائیں۔ یہ کہنا ہی پڑیگا کہ اُن سب کا شروع یا منبع ایک ہی ہی یا کسی وقت میں ایک ہی تھا گو بعض محققین نے قوموں کی تحقیقات کرتے یہ بحث بھی کی ہی کہ بعض قومیں بعض قوموں سے کوئی بھی قریبی نسبت نہیں رکھتی ہیں۔ مگر اخیر پر ایسے محققین کی آرا کا میلان بھی ادھر ہی ہُوا ہی کہ ان سب کا مخرج یا ابتدا ایک ہی ہونا[ف۱] چاہئیے۔

جو قومیں دوسری قوموں سے بعید فاصلے پر نظر آتی ہیں اُن میں بھی باوجود اس بعدِ اختلاف یا تباین عظیم کے چند ایسی نسبتیں پائی جاتی ہیں جو اِس بات کا استقرائی ثبوت ہیں کہ ان سب کا ابتدائی سلسلہ ایک ہی تھا۔

یہ ایک دلچسپ بحث ہی کہ اِس قدر اختلاف قوموں میں کیوں ہو گیا اور اُن میں ایسا بُعدِ عظیم اور تباین کیوں پایا جاتا ہی جب یہ فرض کر لیا گیا ہی کہ شروع ان سب کا ایک ہی شعبہ اور مرکز سے ہوا ہی تو پھر ان ما بہ الامتیازات کی اصل وجہ کیا ہی۔ گو ہم یہ بحث نہیں کرنا چاہتے کہ ان اختلافات اور اس تباین کی وجوہ کیا کیا ہیں۔ لیکن یہ کہنے کے بغیر نہیں رہ سکتے کہ موجودہ تباین کا بہت سا

ف۱ انسان کا شروع چاہے حضرت آدم علیہ السلام سے مانا جاوے اور چاہے برہما سے۔ چاہے پہلی تحقیقات کے مطابق ڈارون کی تھیوری ہی مسلّم اور مقدم رکھی جاوے۔ ضرور ہے کہ اس سلسلے کا شروع ایک ہی ہو ۱۲

حصہ فروعات میں ہے۔ اصول [۵۱] میں کوئی اختلاف نہیں ہے اور یہ فروعی اختلاف بوجہ اختلافِ آب وہوا اور مساکن یا طرزِ معاشرت کے ہوا ہے۔ اختلافِ آب وہوا کا یہ لازمی نتیجہ تھا کہ فروعی امور میں ایسے اختلافات ناشی ہوں۔ اختلافِ آب وہوا سے صرف اجسام ہی متاثر نہیں ہوتے۔ اسکا بیماری اثر اخلاقی اور سوشیل اعتبارات سے طبائع اور دماغ پر بھی پڑتا ہے۔ جب ہم ایک گندی یا غلیظ ہوا سے ایک عمدہ اور صاف ہوا میں جاتے ہیں تو طبیعت کی اُمنگ اور جوش کسی اَور ہی پیمانے پر ہوتا ہے۔ دماغ میں ایک قسم کی بشاشت اور طبیعت میں سرور پایا جاتا ہے۔ دِل میں ایک فرحت اور ایک تازگی پیدا ہوتی جاتی ہے۔ رنگت اور ظاہری حالت میں ہی نمایاں فرق نہیں ہوتا بلکہ خیالات اور قیاس میں بھی ایک جودت اور فراست محسوس ہونے لگتی [۵۲] ہے۔

گرم ملکوں کے رہنے والے کچھ اَور ہی طبیعت رکھتے ہیں اُن کی دماغی طاقتوں اور ذہنی فراستوں کا مقیاس کچھ اَور ہی ہوتا ہے۔ خلاف اس کے جو قومیں سرد ملکوں یا سرد آب وہوا میں بود وباش رکھتی ہیں اُن کی طبیعت اور اُن کے دماغ کی کچھ اَور ہی کیفیت ہوگی جس طرح آب وہوا اور زمین کے اختلاف سے نباتات [۵۳] میں باعتبار رنگت۔ ذائقہ۔ خاصیت کے ایک

---

۵۱ اصولی خصوصیتوں سے وہ خصوصیتیں مراد ہیں جو سب قوموں اور سب قبائل کو شامل ہیں اور جن کے بغیر کوئی قوم موجود نہیں ہے اور نہ ہی موجود رہ سکتی ہے اگر کسی قوم کو اُن سے فرضاً بھی معرا تسلیم کر لیا جاوے تو گویا اُسے دائرہ انسانیت سے گرا دینا ہے ۱۲

۵۲ بعض حکیموں کا یہ خیال ہے کہ آب وہوا کی عمدگی ہی اچھے خیالات کی موجد یا باعث ہے۔ عمدہ آب وہوا سے ہر دماغ تر وتازہ ہو کر اُن علمی مراتب تک پہنچتے ہیں جو انسانی ترقی کے اقصار خیال کیے جا سکتے ہیں ۱۲

۵۳ علمِ نباتات کے محققین نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ ایک ہی جنس کی نباتات میں باعتبار آب وہوا کے بیّن تباین ہوتا ہے۔ حالانکہ اُن کا شروع ایک ہی وقت کے متعلق ہے صرف آب وہوا کے اختلاف سے موجودہ فرق پڑ گیا ہے۔ چا۔ اور آلو اپنی اپنی جنس میں ایک ہی ہیں۔ لیکن امریکہ کے آلو۔ اور ہندوستان کے آلو میں فرق ہے ۱۲۔

نمایاں اور قابلِ لحاظ فرق ہوتا ہے اِسی طرح انسانی طبائع میں بھی مقابلتًا تباین موجود ہو۔

حتّٰی کہ دماغ اور جن کی طبیعتیں زیادہ تر صحیح الحالت ہیں اُن کے خیالات اور قیاسات بہ نسبت اُن لوگوں کے زیادہ تر مجلّٰی اور صاف ہوتے ہیں جو کثیف الکیفیت ہیں۔

آب وہوا کے علاوہ ضروریات نے بھی قوتوں میں تفریق کی ہو۔ ضروریات کی وسعت اور اختلاف کا بہت سا حصہ بھی آب و ہوا پر موقوف ہو۔ جو قومیں یا جو قبائل سرد آب و ہوا میں رہتے ہیں اُن کی ضرورتیں ان قوموں سے مغائر ہیں جو گرم ملکوں میں بود و باش رکھتی ہیں۔ جو قومیں میدانی خطوں میں رہتی ہیں۔ ان کی ضرورتیں پہاڑی قوموں سے مختلف فیہ ہیں[1]۔

---

[1] بعض محققین نے یہاں تک وسعت دی ہو کہ انکے نزدیک زبانوں کا اختلاف بھی آب و ہوا ہی کے اختلاف کی وجہ سے ہو۔ اسی طرح ان کے خیال میں لباسوں کا مختلف ہونا بھی آب و ہوا اور ضروریات کے تباین کا ہی نتیجہ ہو۔ لباس کے اختراع میں بے شک ہر قوم کے مذاق کو بھی دخل ہو۔ لیکن ضرورت نے بھی اس میں بہت کچھ حصّہ لیا یا دخل دیا ہو۔ جس طرح قوموں میں ایک نسبت ابتدائی پائی جاتی ہو اِسی طرح لباس میں بھی ایک ابتدائی نسبت موجود ہو۔ انسان کا پہلا لباس برہنگی ہو اس سے آگے ستر کا سوال پیدا ہوا۔ ستر کے خیال سے انسان نے پہلے پہل ہاتھوں سے کام لیا پھر پتوں سے۔ پھر رفتہ رفتہ لباس کی تراش خراش کی گئی۔ اگر دنیا کی سب قوموں کے لباس جمع کر کے دیکھے جاویں تو بادنیٰ غور یہ نتیجہ نکل سکتا ہو کہ قوموں کے شروع کی طرح لباس کی بنیاد بھی ایک ہی سلسلے سے پڑی ہو۔ ہر قوم کا موجودہ لباس یہ پتہ یا یہ شہادت دیتا ہو کہ میں کسی اور قوم کے لباس سے نکلا ہوں۔ برہنگی اور معمولی ستر کے مقابلہ میں شاید سب سے اوّل لنگوٹی کو شرف لباس ملا۔ رفتہ رفتہ لنگوٹی اصلاح پاتی پاتی جھوٹے اور بڑے تہبند کی صورت میں آگئی۔ پھر چادر کا فیشن چلا اور چادر سے دھوتی بنگئی اور دھوتی سے پاجامہ کا وجود نکلا اور پاجامہ سے کسی نہ کسی وقت پتلون بنگئی۔ اِسی طرح ٹوپی اور پگڑی یا عمامہ کی ہستی ظہور میں آئی۔ اور اسی طرح واسکٹ یا صدری سے کرتوں اور قمیصوں کی نوبت آگئی اور دن بدن ان میں بھی طرح طرح کی اختراعیں اور ایجادیں ہوتی گئیں۔ انسان پہلے ننگے پاؤں پھرتے تھے۔ ضرورت نے سمجھایا کہ پاؤں کے نیچے بھی کچھ رکھنا چاہیے غالبًا پہلے پہل چپلی کی صورت میں کوئی جوتا اختراع کیا گیا ہوگا اسی سے ہوتے ہوتے مختلف اقسام کے جوتے اور بوٹ شو بنتے گئے۔ لباس کا شروع شروع میں ایک شکل یا ایک ہیئت اور وضع سے ترقی پاتے جانا اس امر کی دلیل ہو کہ ان سب قوموں کا شروع بھی ایک ہی تھا۔ اگر ایک شروع نہ مانا جاوے تو ساری دنیا کے لباس میں یگانگت اور اتحادی نسبت کا موجود ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ یہ اتحادی نسبت صریحًا اس امر کا ثبوت ہو کہ ان سب کا شروع ایک تھا +

جیسے جیسے قومیں ضرورت کی وجہ سے نقل مکان کر کے اِدھر اُدھر پھرتی پھراتی رہیں - ایسے ہی وقتاً فوقتاً اُن کے فروعی اجتہاد میں بھی تبدیلی آتی رہی - یہانتک کہ ان تبدیلیوں سے ایک قوم بمقابلہ دوسری قوم کے چند خصوصیات کی وجہ سے تمیز کی گئی - پہلے پہل شخصیت کی بنیاد رکھی گئی - زاں بعد خاندان بنتے گئے اور خاندانوں سے قومیں بننی شروع ہو گئیں اور قوموں کی تفریق سے مستقل طور پر مقام وار تمیز قائم ہو گئی -

جب یہاں تک تفریق ہو گئی تو اُن کے تفاوت یا تحدید کے واسطے بمصداق وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اُن کے درمیان باعتبار عادات اور شعائر کے ایک حدِ فاصل قائم ہوتی گئی - یہ وُہی حدِ فاصل ہے جو ایک قوم کو دوسری قوم سے خصوصیت اور تمیز دیتی ہے - اور جس سے ہر فرد کے دل میں یہ خیال متمکن ہے کہ مَیں فلاں قوم میں سے ہوں اور فلاں فلاں قوم میں سے مجھے فلاں قوم میں شامل ہونے کا حق جُدی حاصل ہے اور فلاں کو فلاں میں اُن قومی خصوصیتوں میں یہانتک استحکام ہوتا گیا کہ اُن کے خلاف چلنا اُس قوم میں سے نکلنے کے برابر ہو گیا انہیں لوگوں یا انہیں افراد کو اس قوم میں سے ہونے کا شرف بخشا گیا - جن میں وُہ خصوصیتیں پائی جاتی رہیں جو اُن سے معرّا تھے وُہ دُوسری قوم میں شمار ہونے لگے - اور انہیں شعائر اور خصوصیتوں کو ان قوموں کا شعائر سمجھا گیا -

جس طرح ایک علم یا ایک فن دوسرے علم یا دوسرے فن کی بنیاد ہے اور ایک شاخ دُوسری شاخ کی ابجد - اسی طرح ایک قوم دُوسری قوم کی شعبہ یا شاخ ہے جس طرح باوجود اس ترتب اور اس نسبت کے علوم اور فنون کے آثار اور مختصات جداگانہ ہیں اور اسی حالت میں ایک علم یا ایک فن اپنی حد میں قائم اور محدود رہ سکتا ہے کہ اُس کے مختصات اور آثار سے اُسے تمیز دی جاوے اسی طرح کوئی قوم اُس وقت تک قوم کہلانے کا حق نہیں رکھتی جب تک اُس میں اُس شاخ کی خصوصیتیں اور قومیت نہ پائی جائے - گو منطق اور فلسفے میں گو یہ نسبت ہے لیکن جب تک منطق باعتبار اصُول منطق تمیز نہ دیا جاوے منطق نہیں ہے جو اصُولِ موضوعہ

منطق اور فلسفے کے مابین عملی تفریق کرتے ہیں۔ اُن کا وجود بہرحال ضروری اور لابدی ہے۔

اس بحث سے یہ نتیجہ نکلا کہ۔

الف - اس وقت تک کوئی قوم قوم کہلانے کا استحقاق نہیں رکھتی ہے۔ جب تک اُس میں قومیت کی خصوصیتیں نہ پائی جاویں۔

(ب) جس قوم میں قومی خصوصیتیں نہ پائی جاویں وُہ قوم نہیں ہے۔ بلکہ ایک مجموعہ افراد ہے جس طرح دُنیا میں اَور افراد پائے جاتے ہیں۔

(ج) ایک قوم سے چند افرادِ انسانی کا مجموعہ مراد ہے۔ جب اُس مجموعے میں قومیت کی خصوصیتیں پائی جاویں جس سے اُنکو تمیز دیا جا سکے تو کہا جاویگا کہ اُن افراد میں قومیت[ف۱] موجود ہے۔

قوم ایک ڈھانچ یا ایک جسم ہے اور قومیت ایک رُوح یا جان کوئی ڈھانچ یا کوئی جسم رُوح اور جان کے بغیر زندہ نہیں کہا جا سکتا۔ اسی طرح کوئی قوم بغیر جوش قومیت کے زندہ قوم نہیں کہی جا سکتی۔ جو خصوصیتیں ایک قوم سے دُوسری قوم کو تمیز دیتی ہیں وہ دو حال سے خالی نہیں ہیں۔

(۱) یا تو وُہ ایسی خصوصیتیں ہیں جن سے ایک قوم دوسری قوم کے مقابلے میں محض بلحاظ عوارض تمیز دی جاتی ہے۔

(۲) یا ایسی خصوصیتیں ہیں جن سے ایک قوم دوسری قوم کے مقابلے میں باعتبار ملزومات تمیز دی گئی ہے۔

عارضی خصوصیتوں کے اندر ضرورتاً تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ اور ایسی عارضی تبدیلی سے صلیت یا حقیقت الامر میں کوئی فرق یا کوئی انقلاب نہیں آتا ہے لیکن ملزومات کی تبدیلی سے اس خاصے میں

[ف۱] ہر انسان عرفاً انسان ہے لیکن ہر انسان شجیع اور فصیح نہیں ہو سکتا۔ شجاعت اور فصاحت دو جداگانہ خاصے ہیں یہ خاصے کچھ تو طبعی ہوتے ہیں اور کچھ انہیں ترقی بھی دی جاتی ہے۔ اسی طرح ہر شخص ایک قوم میں داخل ہے لیکن جب تک اس میں جوشِ قومیت نہ ہوگا۔ تب تک اس کی نسبت یہ نہیں کہا جاویگا کہ اس میں مادۂ قومیت یا جوشِ قومیت بھی موجود ہے اور اُسے اُس سے بھی کوئی نسبت نہیں ہے ۱۲

ضعف یا تبدیلی کرنے کا اندیشہ ہو۔ جسے دُوسرے الفاظ میں۔ قومیت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جب یہ کہا جاتا ہو کہ فلاں قوم پر ادبار پڑ گیا یا فلاں قوم بگڑ گئی۔ تو اُس کا ہمیشہ یہ مفہوم نہیں ہوتا کہ وُہ قوم دنیا کے طبقے سے ہی اُٹھ گئی ہو۔ یا اُس کا کوئی فرد بھی باقی نہیں رہا ہے بلکہ یہ مطلب ہوتا ہے کہ بدقسمتی سے اُس قوم کے اندر مادہ قومیّت کا نہیں رہا ہے۔ یعنی وُہ جوش قومیت نہیں رہا ہے جس سے قومیت کی بنیاد پڑتی ہو اور جس سے ایک قوم بمقابلہ دُوسری قوم کے تمیز دی جاتی ہو۔ قومیں کب بگڑتی ہیں اور اُن کے عروج میں کب فرق آتا ہو جب اُن میں مادہ یا جوش قومیت نہیں رہتا ہو یا اُس میں ضُعف آ جاتا ہے۔

یہ کہنا کہ جو قوم بگڑتی ہو وُہ پھر کبھی نہیں بنتی۔ تاریخ کے خلاف جاتا ہو اور نیز قدرتی قوانین سے اِنحراف کرنا تاریخیں شاہد ہیں اور قانون قدرت گواہ۔ قومیں بنتی بھی ہیں۔ اور بگڑتی بھی ہیں اور بگڑنے کے بعد بن بھی جاتی ہیں۔

تنزّل اقوام کے بواعث مختلف ہوتے ہیں۔ محققوں نے قوموں کے اسبابِ تنزل پر دلچسپ بحثیں کی ہیں۔ ان سب کا خلاصہ یہ ہو کہ جو قوم قومیت چھوڑ دیتی ہو یا اس سے دُو جا پڑتی ہے وُہ مُردہ ہو جاتی ہو اُس میں سے وُہ جوش نکل جاتا ہو جسے دُوسرے الفاظ میں قومی غیرت کہا جاتا ہے۔ غیرت سے وُہ طریقہ یا وُہ طریقِ عمل مراد ہو جس سے ایک خصوصیّت[۵۱] کے قائم رکھنے کی کوشش کی جاتی ہو جو ایک طاقت یا ایک شاخ کو دُوسری طاقت یا شاخ سے تمیز دیتی ہو۔ جو قوم

---

۵۱ بعض قوموں نے بجائے جوش قومیت کے قوم کو ذات کے مفہوم میں منتقل کر کے قومی تفریق سے اَور بھی نقصان اُٹھایا ہو قومی تمیز باعتبار قومیت کے مقابلتاً لازمی ہو لیکن قومی تمیز ذات کے معنوں میں سخت نقصان رساں ہو۔ بیشک ایک فرد قوم یا ایک خاندان اور ایک قبیلہ قوم باعتبار شرفِ ذاتی یا علو عمل کے ممتاز سمجھا جا سکتا ہو۔ لیکن اُسے ایک اصُول نہیں قرار دیا جا سکتا من حیث الافراد یہ لکھنا کہ شرف و فضیلت اینجا است بعض حالات میں دُرست ہو بہ معنے عام درست نہیں ہو۔ من حیث المجموعہ قومیت کا ترک کر دینا اور جوش قومیت سے انحراف کرنا اپنے ہاتھوں اپنی قوم اور اپنے اعزاز قومی کو برباد دینا ہو۔ فتخار ذاتی اَور شے ہو اور افتخار قومیت شے دیگر ۱۲

متنزل ہو اُس پر لازم ہو کہ دُوسری ترقی یافتہ قوم کے نقش قدم پر چلکر ضروریات زمانہ کے مطابق ترقی کرے اور وُہ وسائل اور ذرائع فراخ دلی سے اختیار کئے جاویں جو موجبات ترقی ہیں۔ لیکن اُس کے ساتھ قومیت یا جوش قومیت اور خصائل قومیت سے دست بردار ہوتے جانا ایک ایسے گڑھے میں اپنے تئیں گرانا ہو جو اپنے عمق میں پہلے ہی صدہا قوموں کو ڈبو چکا ہے۔

جب کبھی زمانہ اصلاح کا جوش پھیلاتا ہو تو ہر کہ ومہ کی طبیعت میں ریفارمیشن کی اُمنگیں پیدا ہوتی ہیں اور ہر شخص اپنی بساط کے موافق اس میں حصہ لیتا ہو تعلیم یافتوں اور سمجھ داروں میں ہی یہ امنگ یا یہ جوش نہیں ہوتا۔ جاہلوں اور ناتعلیم یافتوں میں بھی اس کا اثر پایا جاتا ہو۔ فرق صرف یہ ہوتا ہے کہ نئے لوگ نئی تجویزات کے مطابق کام کرتے ہیں اور پُرانے دیرینہ اصُولوں پر جو لوگ دیرینہ اصُولوں کے معاون یا دلدادہ ہیں دراصل وُہ بھی اپنی رائے کے مطابق ایک اصلاح کرتے ہیں۔ ان دونوں حالتوں میں وہی غلطی اور وہی لغزش زیادہ تر گرفت کے قابل ہو جسے قومیت کی غلطی یا اس کا بُرا استعمال کہا جاتا ہے۔

طبیعتیں کبھی کبھی اصلاح کے جوش میں اُن راہوں سے نکل جاتی ہیں۔ جن میں قومیت یا جوش قومیت کے آثار قریبًا معدوم دکھائی دیتے ہیں۔ گو ایسی طبیعتیں اور ایسے لوگ بعض ترقیات کے مالک ہو جاتے ہوں لیکن چونکہ ان میں قومی جوش یا قومی خصوصیت مفقود ہوتی ہے۔ اور محض ایک نمائشی سماں ہوتا ہو۔ اِس لئے اُن کا وُہ جزوی عروج یا ترقی بجائے سودمند ہونے کے مضر پڑتا ہو۔ کوئی قوم دُوسری ترقی یافتہ قوم میں مِل جانے سے یا اُن کے آثار اور خصوصیتوں کے قبول کرنے سے قوم نہیں بن سکتی۔ یا اپنی قومیت عزت کے ساتھ قایم نہیں رکھ سکتی۔ جب تک کہ اس میں اپنی قومیت کی خصوصیتیں اور آثار نہ پائے جائیں[1]۔

یوروپ کی قومیں اس زمانہ میں بیشک عروج ترقی پر ہیں لیکن انتہائی قومیں اُن کی

[1] ہم ان خصوصیتوں اور آثار کا کسی دوسرے موقعہ پر ذکر کرینگے۔ جنہیں کسی ایک قوم کے مقابلے میں قومی آثار یا قومی خصوصیتیں کہا جا سکتا ہے ۱۲

قومیت اور خصوصیات قومیت میں محو اور ممتزج ہو کر ایک قوم نہیں کہلا سکتی ہیں۔ ترقی یافتہ قوموں کے خیالات اور فضائل کا مکتسب ہونا اچھی عادت اور اچھا طریقہ ہے۔ لیکن اپنی قومیت یا جوشِ قومیت سے معرا اور خالی ہو جانا اپنی قوم کا خون[1] کر دینا ہے۔ پہلی قومیت صرف دو جہت سے ٹوٹ جاتی ہے۔

(الف) بذریعۂ انتقال خون۔

(ب) بذریعۂ تبدیلِ مذہب۔

دوسری قوم میں جا کر یا شامل ہو کر شادی۔ نکاح رشتہ داری پیدا کر کے اُن میں ہمیشہ کے واسطے مل جانا کسی نہ کسی وقت پہلی قومیت کو توڑ دیتا ہے۔ مگر یہ حالت بھی افراد سے خاص ہے نہ کہ مجموعۂ افراد سے اور اس حالت میں بھی مدتوں تک پہلا داغ نہیں مٹتا جب کبھی تحقیق ہوتی ہے پہلی قومیت جھلک دے ہی جاتی ہے۔

تبدیلِ مذہب سے بھی پہلی قومیت ٹوٹ جاتی ہے۔ مذہب بھی ایک ایسی طاقت ہے جو خاصۃً قومیت پر بالخصوص غالب آتی ہے اور اُس کے کل اجزا میں حلول کر کے اُسے اپنے رنگ پر لے آتی ہے۔ قومیں قوموں سے صدیوں لڑتی بھڑتی رہیں لیکن جب ایک قوم یا دوسری قوم کا مذہب قبول کر لیا تو اُن میں سے ایک قوم کی قومیت زائل[2] ہو گی۔ یا نسبتاً ایک نئی قوم بن گئی۔

[1] جو لوگ یہ کوشش کرتے ہیں کہ دُوسری قومیت میں مل کر اپنی قوم یا اپنی شاخ کو ترقی دیں وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے کیونکہ ہر ترقی یافتہ قوم تنزل افراد کے لئے سے اپنی قومیت سے دور نہیں رہ سکتی۔ اُس میں طاقت تو ہے کہ ایسے چند افراد کو اپنے آپ میں شامل کرے لیکن یہ ہونا مشکل ہے کہ ان افراد کی خاطر وہ دوسری قوم کی قومیت ہو جاوے ۱۲ [2] باوجود اس کے کہ مذہبی طاقت بسا اوقات قومیت یا جوشِ قومیت پر غالب آتی ہے۔ پھر بھی تاریخی واقعات شاہد ہیں کہ قومیت کا رنگ بعض اوقات دور ہونے میں نہیں آیا۔ ساری یورپین قومیں ایک ہی مذہب رکھتی ہیں مگر پھر بھی ان میں قومیت کے جوہر جداگانہ چمک دمک مارتے ہیں یورشن مذہب کے اعتبار سے اور جیسی دین کی جہت سے جدید عہد نامے کے معتقد اور نام لیوا ہیں اور دیگر یورپین عیسائیوں کے ہم نوا لیکن دیکھو تو ان میں بھی تفریق قومیت کا جلوہ یا سماں کسی نہ کسی رنگ میں موجود ہی ہے پھر کس طرح لکھا جا سکتا ہے کہ دوسری غیر مذہب قومیں ان اقوام کی قومیت کی وارث بن جاوینگی۔ یہ نظیریں اس امر کا بدیہی ثبوت ہیں کہ قومیت بہت مشکل سے دُور ہوتی ہے ہاں جب فی تمام کل قومی کو ترک کیا جاوے تو فرق ضرور آجاتا ہے ۱۲

جن قوموں نے تنزل میں ہو کر ترقی پائی اور عروج حاصل کیا ہی اور جنہیں ریفارمیشن کی ضرورت پیش آئی ہی اُن کا ہمیشہ یہ اصول رہا ہی کہ باوجود سب قسم کی فتوحات اور اکتساب کے اپنی قومی خصوصیتوں اور قومیّت کو نہ چھوڑا جاوے۔ یہی اصول اور یہی معاہدہ تھا جو ان قوموں کی مستقل حرمت و عزّت کا باعث ہوا ہے۔ ہر طاقت یا ہر وجود میں ایک ایسی خواہش موجود ہی جسے آن کہا جاتا ہے اُس آن سے ہی اُس طاقت یا وجود کی وقعت اور حرمت ہوتی ہے۔ قومی خصوصیتوں اور قومیّت کو قائم رکھنا دراصل اس آن کو قائم کرنا ہے جو ریفارمر یا جو مصلح یا مجدد احتیاجاتِ قومیّت سے گریز کرتا اور اس سے متعرض ہی وہ اپنے تئیں کیا دیگر افراد کو بھی ایک تہلکہ میں ڈالتا ہے۔

اگر یہ خواہش اور یہ آرزو ہی کہ ایک قوم کو دُوسری قوم کے مقابلے میں عزّت دی جاوے تو قومیّت سے انحراف یا اعراض ایک گناہ کبیرہ سمجھا جاوے۔

اس بات کا فیصلہ کہ کسی قوم کی قومی خصوصیتیں کیا ہیں اور قومیّت کیا یا کیا ہونی چاہئیں۔ مخفی اور مستتر نہیں۔ جن خصائل اور جن خصوصیتوں اور شعائر کی وجہ سے ترقی کے گذشتہ زمانوں میں کوئی قوم شناخت کی جاتی اور عزّت دیجاتی رہی ہی۔ وہی شعائر اب بھی اس کی خصوصیات میں داخل ہیں اور قومیّت کے اجزائے لازمیہ۔ یہی ایک اصول ہی جو جوش قومیت کے قائم رکھنے کے لئے سدِ سکندری کا کام دیتا ہی۔ کوئی قوم اُس وقت تک حقیقی صلاح اور فلاح کی مالک نہیں ہو سکتی جب تک اس میں جوش قومیّت نہ ہو جوشِ قومیّت اُس وقت تک نہیں پیدا ہو سکتا جب تک قومی خصوصیتیں زندہ اور موجودہ نہ ہوں۔ خصوصیّات قومی کیا ہیں۔ ایک قومی جھنڈا یا قومی نشان۔ جس کا کوئی نشان

۱؎ دُنیا میں ہر شے کی طاقت اور حرمت ایک نسبت رکھتی ہی۔ نسبت کا توڑنا اور اس سے اعراض خود اپنے تئیں ذلیل کرنا اور توڑنا ہے۔ جب تک ایسی نسبت قائم نہ رہے نہیں کہا جا سکتا کہ ایسی قوم بہ حیثیت قومیّت کے ایک قوم ہی۔ جن قوموں میں قومیّت ایک فرض عین سمجھی جاتی ہی اور جو اپنی قومیت کے دلدادہ یا فدائی ہیں ان کی نگاہوں میں بھی ایسے قوم فروش یا قومیت شکن لوگ عزت اور وقعت کی نگاہوں سے نہیں دیکھے جا سکتے۔ گو کہ وہ زبانِ حال سے اس کی نسبت ایسے لوگوں سے کچھ قیل و قال نہ کریں ۱۲

اَور کوئی تمیزی خصوصیّت نہیں ہو وُہ قوم مردہ ہو۔ ہر مقام ہر زمانے میں اپنے ہی نشان سے شناخت کی اور عزّت دیجاتی ہو اور شناخت کی جانی چاہئیے۔ چاہے کوئی کتنی ہی ترقّی کرلے اور کیسے ہی عروج پر پہنچ جاوے جب تک وُہ اپنے نشان کے نیچے نہیں آیگا اُسے اُس قوم میں سے نہیں کہا جاویگا صرف تعلیم یافتہ - مہذّب امیر بادشاہ خود مختار ہو جانا خوشی کا موجب نہیں۔ خوشی کا موجب اور عزّت کا باعث کیا ہے -

قومیّت کا حامی ہونا قومیّت کو قائم رکھنا قومیّت کو نباہنا۔

جس قوم یا جس قوم کے افراد میں یہ خصوصیّات نہیں ہیں وُہ ایک قوم کے برائے نام افراد ہیں۔ اُن میں قومیّت اور قومیّت کا جوش نہیں ہے۔ لوگ شخصیّت کے قائم اور باقی رکھنے یا نباہنے میں کوشاں رہتے ہیں۔ لیکن جب قومیّت کے مرحلے پر پہنچتے ہیں تو انہیں یہ قاعدہ یاد نہیں رہتا جس طرح شخصیّت بغیر خصوصیات شخصیّت کے قائم نہیں رہ سکتی - اِسی طرح قومیّت کا ہی بغیر خصوصیات قومیّت کے باقی یا قائم رہنا مشکل ہے۔ ؎

منہ زِ نہار اَے غافل زحدِّ خود قدم بیروں
کہ ریزد خونِ خود صیدے کہ آید از حرم بیروں

میرزا سُلطان احمد

خوش ہو وہ شخص جس نے دانائی حاصل کی ہو۔ دانائی کی تجارت چاندی سے بہتر ہو اور اس کا منافع خالص سونے سے اچھا۔ اسکی قیمت لعلوں کے ڈھیر سے بڑھکر ہو۔ لعل کیا کوئی چیز بھی اس کے مقابل نہیں ہوسکتی۔ اس کے داہیں ہاتھ میں درازی عمر ہو اور بائیں میں دولت اور عزّت۔ اس کے اندازِ خوش آیند انداز ہیں اور اسکی راہوں میں امن ہی امن ہو۔

(ترجمہ) (میر نذیر حسین)

"نقاب اور گھونگٹ"

ملبوسات پر کچھ لکھنا شیخ محمد اکرام صاحب کا حصّہ ہے جو اس کے قبل کلاہ و دستار اور دوپٹے پر پُرلطف مضامین لکھ چکے ہیں۔ اور باقی جن کپڑوں کی نسبت اُن کا وعدہ ہے اُن میں انصافاً نقاب اور گھونگٹ کو بھی شامل کرنا چاہئے۔ مگر میں چاہتا ہوں کہ شیخ صاحب سے پہلے ان دونوں پر بطریقِ اجمال اپنے خیالات ظاہر کروں۔ اُمید ہے کہ مجھ کو پیش قدمی کی اجازت دیدی جائیگی۔

نقاب اور گھونگٹ دونوں ایشیا کی پیدائش ہیں۔ یورپ کے فیشن میں جہاں کہیں نقاب کو استعمال کیا جاتا ہے وہ اس کے اصلی مقصد سے کوسوں دُور ہے۔ وہاں باریک ریشم کی نقابیں ڈالی جاتی ہیں۔ جن سے چہرہ چھپانے کی غرض نہیں اظہارِ حُسن اور زیبائش کی افزونی مدِنظر ہوتی ہے۔ یہ نقابیں عمُدہ سیاہ ہوتی ہیں۔ جنمیں سرخ سفید چہرے کا جھلکنا بہت بھلا معلوم ہوتا ہے گویا چاند پر ہلکے سے ابر کا ایک ٹکڑا ہے۔ جس میں سے چاندنی چھن رہی ہے۔ نقاب میموں کی چھجہ دار ٹوپی میں لگی ہوئی ہوتی ہے اور نیچے کا حصّہ ٹھوڑی میں پھنسا دیا جاتا ہے۔ اِس لئے نقاب کا کپڑا آنکھوں سے کئی انگشت دُور رہتا ہے۔ اور پلکیں ہلنے جُلنے میں آزاد رہتی ہیں۔ تاہم یورپین ڈاکٹروں کی شکایت ہے کہ اس نقاب کے فیشن سے آنکھوں کو بہت نقصان پہنچتا ہے۔

ایشیائی نقاب کی نسبت خبر نہیں کہ اس کا رواج کب اور کہاں سے شروع ہوا اس کی مختلف صورتیں اور مختلف نام ہیں۔ مگر مقصود صرف ایک ہے کہ رُخ غیر نظروں سے بچایا جائے۔ ترکوں۔ عربوں۔ ایرانیوں میں نقاب کے الگ الگ طریقے ہیں۔ کہیں ایک لمبی چادر سر سے پیر تک لپیٹ لی جاتی ہے۔ اس طرح کہ ماتھا۔ ٹھوڑی۔ ناک تو ڈھک جائے اور آنکھیں کھلی رہیں۔

کہیں بُرقع ہوتا ہے۔ جس میں ماتھے کے قریب ایک چھوٹا سا کپڑا ٹانک دیتے ہیں جو چہرہ کو بخوبی ڈھک سکے۔ اس کپڑے میں چند سُوراخ ہوتے ہیں۔ جنکے سبب آنکھیں اپنا کام کر سکتی ہیں۔

مگر کسی ملک میں نقاب کے افسانے فارس کی طرح عوام کے زبان زد نہ ہونگے - وہاں کے شعرا نے اس ذرا سے ٹکڑے پر بڑی بڑی طبع آزمایاں کی ہیں - کہتے ہیں کہ کسی زمانے میں ایران کے امرد لڑکے بھی نقاب ڈالتے تھے -

عرب کی شریف زادیاں منہ پر نقاب ڈال کر بازاروں میں چلتی پھرتی اور خرید فروخت کرلیتی ہیں اسی کے قریب ایران اور ترکستان کی نسبت مشہور ہے -

نقاب پوشی ایشیائی شرم وحیا - عفت وعصمت کا ایک قابلِ قدر نمونہ ہو - جس کے باعث عورتیں آزاد رہکر بد نگاہوں سے محفوظ رہتی ہیں -

ہندوستان جس کی نسبت مشہور ہے کہ مسلمانوں کی صحبت سے یہاں پردہ کا رواج ہوا - ہزاروں برس سے گھونگٹ نکالنے کا عادی ہو - ممکن ہو کہ ملک کے بعض حصوں میں اس کی عادت نہ ہو مگر اکثر مقامات پر اس کے وجود کا پتہ لگتا ہے -

لکھا ہو کہ مہاتما بدھ کے ظہور سے پہلے ہند میں گھونگٹ کی رسم موجود تھی - چنانچہ جب انکی رانی گوپا نے اس رسم کو ترک کردیا تو تمام ملک میں ایک عام چرچا اور غل پڑ گیا تھا - ہندوستان کے نامی گرامی شعرا کے کلام میں گھونگٹ کا بڑے لطیف اور پُر درد لفظوں میں ذکر پایا جاتا ہے - یہاں آجتک گھونگٹ کا طریقہ جوں کا توں موجود ہے -

ہندوں میں ادنیٰ اور متوسط درجے کی عورتیں باہر چل پھر سکتی ہیں جن میں گھونگٹ عرب و ایران کی نقاب کا کام دیتا ہے - مگر گھونگٹ میں کئی خرابیاں ہیں جو نقاب میں نہیں - گھونگٹ اوڑھنی یا چادر کے اس سرے کا نام ہے جو سر پر سے کھسکا کر چہرہ پر جھکا لیا جاتا ہو - جو کبھی آدھے چہرے اور کبھی تمام چہرے کو ڈھک لیتا ہے - چونکہ اس میں آنکھوں کے لئے کوئی روزن نہیں ہوتا بیچاری عورتیں ایک ہاتھ سے گھونگٹ اٹھا کر راستہ چلتی ہیں - اور انہیں بڑی دقت کا سامنا ہوتا ہے -

دستور ہے کہ بیاہی ہوئی لڑکیاں اپنے میکے کے آدمیوں یہانتک کہ میکے کی آبادی کے تمام مردوں سے منہ نہیں چھپاتیں - مگر سسرال میں جاکر ان کو سب کے سامنے گھونگٹ

نکالنا پڑتا ہے۔ اور بیچاریاں اس پر تمام عمر کاربند رہتی ہیں۔ نقاب اور گھونگٹ کے ان ظاہری معنوں کے بعد ذرا باطنی معانی پر بھی نظر ڈالنی چاہیئے۔ یہ تمام موجوداتِ عالم جس کو جسم کی آنکھیں محسوس کرتی ہیں ایک پردہ نشین کی نقاب اور ایک حیادار کا گھونگٹ ہے۔

خود ہمارا جسم نقاب ہے۔ ہماری ظاہری زندگی گھونگٹ ہے۔ جو نظر باز ہیں پردۂ نقاب اور حجابِ گھونگٹ اُٹھنے کے متمنّی رہتے ہیں۔ اور اُن کی یہ آرزو عوام میں عرفان کہلاتی ہے۔

مہاتما بُدھ کا جنہوں نے اسرار باطن کے بہت سے پردے اُٹھائے تھے اُن کی رانی پر ذرا سا پرتو پڑا تھا جو انہوں نے اس ظاہری گھونگٹ کو اُٹھا ڈالا۔ اگر کوئی کامل نظر پڑ جاتی تو گوپا کا بھی بیڑا پار تھا ÷

حسن نظامی (دہلوی)

دُنیا

چمنِ جنارِ خار ہے دُنیا — خونِ صد نو بہار ہے دُنیا
زندگی نام رکھ دیا کس نے — موت کا انتظار ہے دُنیا
ہے نسیمِ جہاں خزاں پرور — دیکھنے کو بہار ہے دنیا
ہے تمنّا فزا ہوائے جہاں — کیا شکستِ خمار ہے دنیا
خون روتا ہے شوقِ منزل کا — رہزنِ رہ گزار ہے دُنیا
جان لیتی ہے جستجو اس کی — دولتِ زیرِ مار ہے دنیا
یاس و اُمید کا ملاوا ہے — کوئی جاتی بہار ہے دنیا
خندہ زن ہے فلک زدوں پہ جہاں — چرخ کی رازدار ہے دنیا

ہیں جہاں کو غموں کے خار پسند
اس چمن کو نہیں بہار پسند

(سید نذیر حسین)
(مرفگ)

موت

حوادثِ زندگی میں موت بھی نہایت دلچسپ واقعہ ہے۔ عام حادثۂ زندگی ہونے کی جہت سے اُس کے حقائق پر بہت کم غور و تامّل کیا جاتا ہے۔ روز دس پانچ آدمیوں کو مرتے دیکھنے اور سُننے سے ہمارے کان اور آنکھ اس کے ایسی عادی ہو گئے ہیں کہ دم بھر کے لئے بھی ہم اپنے ذہن کو اُس کی ماہیت دریافت کرنے کے لئے رجُوع نہیں کر سکتے۔ جب ہم کو بھی اَوروں کی طرح ایک دن مرنا ہے تو خیالِ موت قبل از موت واویلا ہے۔ حقیقت میں اس کا نام تک لینا بسا اوقات ناگوار ہوتا ہے۔

موت کی علامات اور تکالیفِ نزع اور دم نکلنے کا وقت مرنے والے کے بُشرہ کے مکروہ آثار اور جسم کی غیر ارادی حرکات دیکھ کر بیساختہ یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ مرنے میں بہت سختی اور ایذا ہوتی ہے جس کے مقابلے میں دُنیا کی اَور تکلیفیں ادنیٰ اور حقیر ہیں۔ جس قدر خوف ہم کو موت سے ہے وُہ زیادہ تر بلحاظِ مشاہدہ احوال کے ہی جو مرنے کے وقت یا قریب زمانہ موت کے ہم مریض کا دیکھتے ہیں۔ محبوب صورتوں اور چیزوں کی جدائی ایک لمحہ کے لئے شاق ہوتی ہی۔ پھر بھلا اس رنج کا کیا اندازہ ہو سکتا ہی جو مرنے والے کو مرنے کے وقت ہوتا ہی۔ جب وہ نگاہِ حسرت سے اپنی عمر بھر کی کمائی کی طرف اور آشنا چہروں کی جانب دیکھے اور یہ خیال کرے کہ کوئی دم میں ہمیشہ کے لئے اُن سے بچھڑ جاؤنگا۔ خواہ یہ تکلیفِ نزع ہمارے اعمالِ سابقہ کے نتیجے ہوں یا رنجِ مفارقتِ احباب ان کا باعث ہو۔ لیکن موت ایک عظیم واقعہ ہے اور اس کی عظمت نہ اس وجہ سے ہی کہ اس کے عارض ہونے سے ہمارا شمار مُردوں میں ہونے لگتا ہی بلکہ اس وجہ سے کہ یہ بعض لوگوں کا مدعا اور مقصودِ خاص ہے۔ ہزاروں مفلس رندِ طلبگارِ موت رہتے ہیں اور افلاس اور تنگدستی کے سامنے موت کو ہیچ جانتے ہیں۔ سینکڑوں مریض صعوباتِ مرض سے تنگ آکر آمادۂ موت ہو جاتے ہیں

اور بہت سے ذی آبرو و اہلِ حمیت ننگ و عار سے بچنے کے لئے اسکو اختیار کر لیتے ہیں۔ بہت سے مجاہد اشاعتِ دین کے لئے لڑکر مر گئے۔ بہت سے عاشقوں نے اپنے معشوقوں کے کہنے پر اپنی جانیں دے ڈالیں۔ ہزاروں جنرل شہرت حاصل کرنے کے لئے مر گئے۔ اِن سب کا مقصود طلبِ موت یا سعی الی الموت سے یہ تھا کہ جس حالت میں وُہ تھے اُس سے مرجانے کو بہت زیادہ آسان جانتے تھے۔ اِن لوگوں کے نزدیک موت میں زیادہ لذت تھی بمقابلہ اس حالت کے جس کا ذائقہ اُن کے مذاق کے مخالف تھا اور جس چیز کو مر کر حاصل کیا وہ اُن کو جانوں سے زیادہ عزیز تھی۔ پس موت میں ایک ایسا اسرار ہے جو کسی طرح ظاہر نہیں ہوتا۔ کبھی لوگ اس سے خائف بھی پائے جاتے ہیں۔ اور کبھی اس کی آرزو میں دست بدعا۔ یہ ایک عجیب امر ہے خوف و رجا اس سے دونوں وابستہ ہیں۔

اگر موت میں تکلیف ہے تو نامرد و بہادر دونوں کے لئے یکساں ہے اور اگر کوئی تکلیف نہیں ہوتی تو خوف بیفائدہ ہے۔ علاماتِ موت بعنوان و اشکالِ مختلف ظاہر ہوتی ہیں۔ ہر چند کبھی دو مرنے والوں کی حالت علامات کے لحاظ سے یکساں نہیں ہوتی۔ مگر بعض علاماتِ عامہ ایسی ہیں جو اکثر موت کے وقت ظاہر ہوتی ہیں۔ مثلاً ناک کا خمیدہ ہوجانا۔ پاؤں کا سرد ہونا اور سردی کا اوپر کی طرف چڑھنا مریض کا کپڑوں کو نوچنا۔ آواز میں گرانی آجاتی ہے۔ کلام بہ تکلف کیا جاتا ہے۔ سانس لینے میں دقت ہوتی ہے۔ بصارت کم ہوجاتی ہے۔ آخر الامر دل کا فعل ہمیشہ کے لئے بند ہوجاتا ہے اور اِسی سے مراد ہلاکت ہے۔

اکثر لوگوں کا یہ خیال ہے کہ موت لامحالہ تکلیف دہ ہوتی ہے۔ مگر کوئی وجہ ہمارے پاس نہیں کہ ہم یہ خیال کریں کہ مرنے میں پیدا ہونے سے زیادہ تکلیف ہوتی ہے۔ یہ خیال زیادہ تر اس وجہ سے ناشی ہوتا ہے کہ مرتے وقت چند حرکات غیر اختیاری اور نیز چہرے کا بگاڑ واقع ہوتا ہے لیکن یہ بات نہایت صحت کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ ان حرکات و تشنج اور بشرہ کے مکروہ آثار سے ہم کو مطلق تکلیف نہیں ہوتی بلکہ اکثر تو اس طرح واقع ہوتے ہیں کہ ہم کو اُن کا علم بھی نہیں ہوتا۔

ہمیں قیصر جولیس کا قول یاد رکھنا چاہیئے کہ نامرد ہر روز مرا کرتا ہے لیکن بہادر صرف ایک مرتبہ موت کا مزہ چکھتا ہے۔ جو اس دنیا میں آیا ہے وُہ ضرور ایک دن موت کا شکار ہوگا۔ ؎

ہر آں کہ زاد بناچار بایدش نوشید ز جامِ دہر مے کُلُّ مَنْ عَلَیْہَا فَان

سوائے ذاتِ خداوندی کے اور کسی کو بقا نہیں ؎ نہ گل رہیگی نہ گل میں رہیگی بُو باقی۔ فدایہ ہو نگی تجھ پہ رہیگا تو باقی

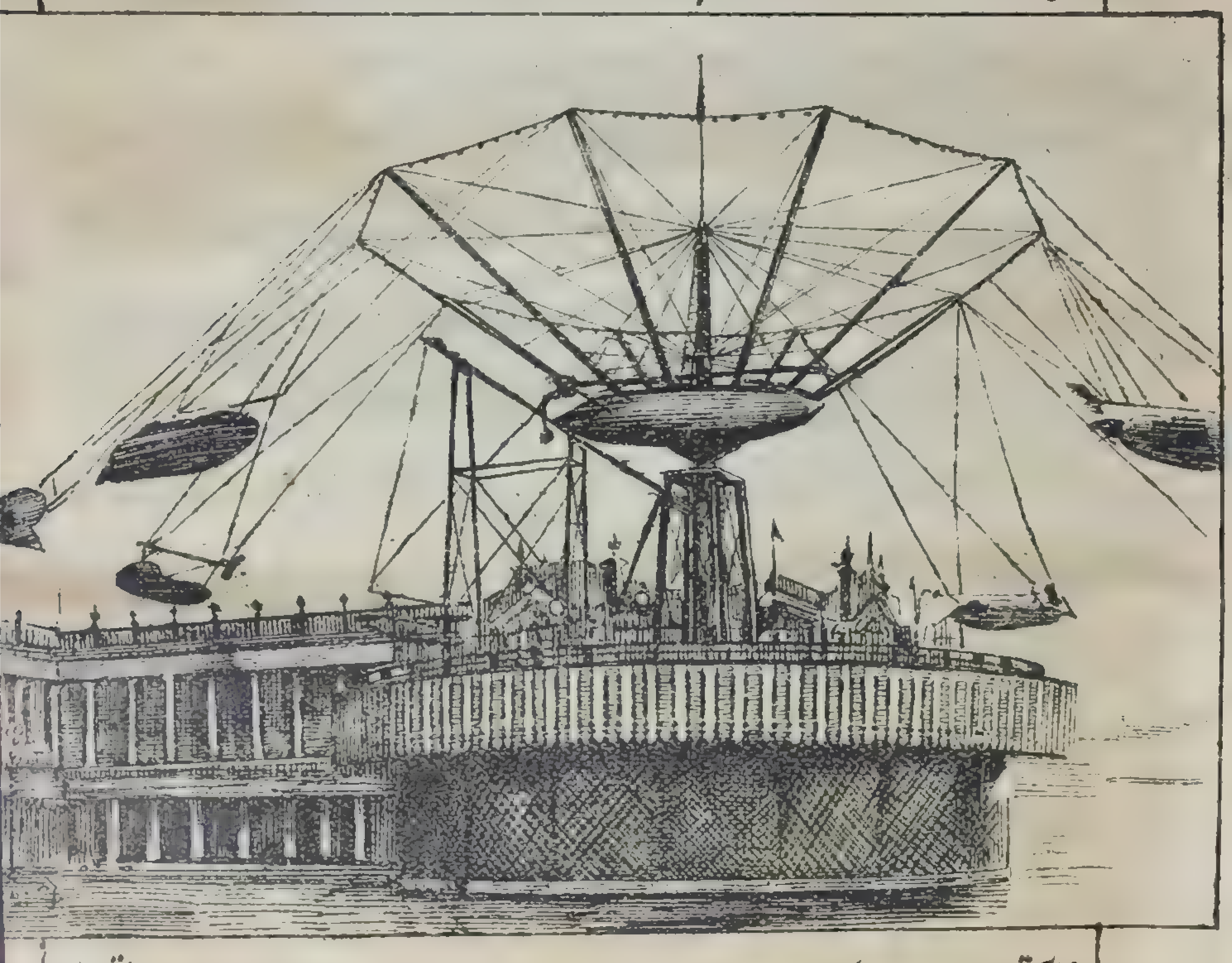
محمد شفیع الدین خاں مرادآبادی

اطالین نمائش

جن ذرائع سے مغربی دُنیا میں علوم و فنون کی ترقی کی کل کو چلایا گیا ہے۔ اُن میں ایک مقبول اور دلپسند ذریعہ نمائشیں ہیں۔ نمائشیں کئی طرح کی ہوتی ہیں۔ سب سے اعلیٰ تو وُہ ہیں جو مختلف مُلکوں کی متفقہ کوشش کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ اور تمام شائستہ دنیا پر کم و بیش اثر ڈالتی ہیں۔ زمانہ حال میں اس قسم کی نمائشوں میں چکاگو کی مشہور نمائش۔ پیرس کی عالمگیر اگزبشن اور سب سے نئی سنٹ لوئس کی نمائش قابلِ ذکر ہیں۔ یہ نمائشیں تو تاریخی یادگاریں ہیں اور جب اقوامِ مغرب کی ترقی کی تاریخ لکھی جائیگی تو اُس میں ان نمائشوں کے سال سنگِ نشان کا کام دینگے۔ ان کے لئے روپیہ اس قدر درکار ہے۔ کہ اکثر مغربی قومیں باوجود اپنے تموّل کے ان کے مصارف سے عاجز آتی جاتی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ سنٹ لوئس میں خاطر خواہ مالی کامیابی نہیں ہُوئی۔ اس لئے ان نمائشوں کا مفصّل تذکرہ ہم غریبوں کے لیے جو ایک نادار مُلک میں پیدا ہُوئے ہیں۔ مفید نہیں۔ ہم ابھی اُس مقام سے جس کا تقاضا ایسی نمائشوں کا اہتمام ہوتا ہے منزلوں دُور ہیں۔ ان کے سوا یورپ اور امریکہ میں کئی نمائشیں بعض فنون کے لئے مخصوص ہوتی ہیں۔ مثلاً زراعت کی نمائش جُدا۔ جس میں مُختلف قسم کے بیج۔ کھاد۔ آلات کشاورزی اور دیگر اسبابِ زراعت دکھائے جاتے ہیں۔ دُودھ اور مکھن کی نمائش الگ۔ جس میں مختلف کارخانوں کو باہمی مقابلہ کا علیحدہ موقعہ دیا جاتا ہے۔ پنساری اور عطّار اپنی نمائش علیحدہ رکھتے ہیں۔ فوجی نمائش جداگانہ ہے۔ تصویروں کی نمائش ایک مستقل چیز ہے۔ جس میں صاحبانِ فن اپنا کمال دکھاتے ہیں۔ غرض ہر پیشے اور ہر ہُنر کے لوگ اپنی اپنی ترقی کی تدابیر کرتے رہتے ہیں۔ مگر ان دونوں قسموں کے علاوہ ایک اَور قسم نمائش کی ہے۔ جس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ہر طبقے کے لوگوں کو چھوٹے سے پیمانے پر واقفیتِ عامہ بڑھانے کا موقعہ مل جائے اور ساتھ ہی تفریح کا مقصد بھی حاصل ہو۔ یہ نمائشیں ہمارے ہاں کے میلوں کا جواب ہیں۔ اور انہیں مہذّب میلوں کا لقب

دیا جاسکتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے۔ کہ میلا ایک دو دن کی دل لگی۔ چند گھنٹوں کی گھبراہٹ۔ جانے کی دُھوم دھام۔ واپس آنے کی مارامار۔ دھکّے کھانے کے لُطف اور بد پرہیزی کرنے کی اجازت کا نام ہوتا ہے اور اس کا مقصد صرف تفریح ہوتا ہے۔ جو بچپن اور آغازِ شباب تک تو اس سے حاصل ہوتی رہتی ہی۔ لیکن اس کے بعد دن بدن زائل ہونے لگتی ہی اور آخر جاتی رہتی ہی۔ مگر یہ مہذب میلے ہفتوں بلکہ مہینوں رہتے ہیں۔ لوگ اطمینان سے اُن میں جاتے ہیں بیفکری سے اُن میں چلتے پھرتے ہیں۔ ہر طرح کے تماشے اور دلچسپی کے سامان ایک احاطے کے اندر جمع ہیں جن سے ہر شخص حسبِ مذاق و توفیق فائدہ اُٹھا سکتا ہی اور اُن میں جانا اور انہیں دیکھنا سیر کی سیر اور تعلیم کی تعلیم ہوتی ہے۔ لنڈن کے اس قسم کے میلوں میں سے ایک میلا چند ہفتے ہوئے ختم ہوا ہے۔ جب میں مئی کے مہینے یہاں آیا تو شروع تھا اور اکتوبر کے اخیر تک رہا۔ اس میلے کی ترکیب یہ ہی کہ ایک وسیع احاطہ اس کے منتظموں نے گھیر رکھا ہے۔ جس کا نام ارلز کورٹ ہے۔ اس میں ہر سال نئی نمائش ہوتی ہی۔ جو کئی مہینے تک رہتی ہے۔ چند سال ہوئے یہاں پیرس کی زندگی کا نقشہ دکھایا گیا تھا۔ اس کے بعد ایک برس یہاں "نمایش آتش" تھی۔ جس میں مکانات کا جلنا۔ آگ بجھانے والی فوج کا مستعدی سے اُن کے بچانے کو دوڑنا۔ اور جانفشانی سے لوگوں کے جان و مال کو بچا لینا دکھایا گیا تھا۔ اس مرتبہ ملکِ اطالیہ کی باری تھی۔ اور نمائش میں جانا یہ معنے رکھتا تھا کہ آپ اچانک آنکھ بند کر کے اطالیہ کے مشہور مقامات میں سے کسی کی سیر کر رہے ہیں۔ داخل ہوتے ہی دربان اطالیہ کے لباس میں ملبوس نظر آتے تھے۔ دوکانیں وہیں کی سنگتراشی مصوّری۔ اور دیگر صنعتوں کے نمونوں سے پُر ہیں۔ جہاں کہیں لوگوں کے واسطے کھانے پینے کا سامان مہیّا کیا گیا تھا۔ وہاں خادم اور خادمہ خاص وردیاں پہنے تھے۔ جن کی کاٹ تراش اطالیہ کی وضع کی نقل تھی۔ احاطہ کی دیواریں رنگا رنگ کے پردوں کی بنی تھیں۔ جن پر اطالیہ کے قدرتی مناظر کے نقشے آنکھ کو دھوکا دیتے تھے۔ کہ وہ سچ مچ جنوب یورپ کے مناظر دیکھ رہی ہے۔ احاطہ کئی حصّوں میں منقسم تھا۔ جن میں سے بعض حصّے مسقّف

تھے اور بعض کھُلے ۔ مسقّف حصّوں میں صنّاعی کی نمائش اور دوکانیں تھیں اور کھُلے حصّوں
میں سیر تفریح کی باتیں ۔ ایک صحن پھُولوں کی کیاریوں سے رشکِ گلشن بنا ہُوا تھا اور اس کے
وسط میں بینڈ کے لئے جگہ تھی ۔ جہاں مقررہ اوقات پر ہر روز باجا بجتا تھا اور موسیقی کے
دلدادہ اس کے گرد کُرسیوں پر بیٹھے باجا سُنتے رہتے تھے ۔ مگر جو حصّہ اس نمائش کا مجھے
سب سے دلچسپ معلوم ہوتا تھا وُہ ایک اَور صحن تھا ۔ جو دو بلند عمارتوں کے درمیان واقع تھا۔
اور جس میں ایک خوبصورت حوض صاف پانی سے لبالب بھرا رہتا تھا ۔ اِس حوض کے
دونوں طرف ایک نہر سی بنی ہُوئی تھی اور اس کے وسط میں ایک کل تھی ۔ جسے اُڑنے کی
کل کہتے تھے ۔ اِس کی صُورت کا کچھ اندازہ مندرجۂ ذیل نقشے سے ہو سکیگا ۔ کشتیاں سی جو



نظر آتی ہیں ۔ ان میں لوگ بیٹھ جاتے تھے ۔ یہ کشتیاں نہایت مضبوط رسّوں سے آویزاں تھیں اور
اُن تمام رسّوں کے سرے ایک بڑے ستون کے سرے سے لوہے کے حلقوں کے

ذریعہ سے بندھے تھے۔ یہ ستون دُخانی کل کے ذریعہ سے گھومتا تھا تو ساری کشتیوں کو حرکت ہوتی تھی۔ یہانتک کہ چکّر کھاتے کھاتے ایسا درجہ آتا تھا کہ کشتیاں ہوا میں اُڑتی معلوم ہوتی تھیں اِس کل کا اصُول بالکل وُہی تھا۔ جو اُن چکّروں کا ہوتا ہے جو ہمارے ملک میں عام میلوں پر موجُود ہوتے ہیں اور جن کے ذریعہ سے کاٹھ کے گھوڑے جن پر شوقین لوگ سوار ہوتے ہیں۔ گھومنے لگتے ہیں۔ مگر اسی خیال کی ترقّی سے ایسی نفاست پیدا ہوئی تھی کہ اس مشین کو دور سے چلتے دیکھنا نہایت ہی مزا دیتا تھا اور اس میں سوار ہونا اُس سے زیادہ دلچسپ تھا۔ اور اسی لئے نہ صرف تماشائیوں کا ایک گروہ کثیر اس کے گرد جمع رہتا تھا۔ بلکہ سوار ہونے والوں کا بھی ہجُوم ہوتا تھا اور میرا خیال ہے کہ سارے تماشوں میں یہی سب سے مقبُول تھا اور اس کے مالک کو سب سے زیادہ نفع ہوا۔ حوض کے وسط میں اس کا نصب ہونا اس کے لُطف کو دوبالا کرتا تھا اور رات کے وقت جب حوض پر چاروں طرف سبز و سُرخ شیشوں میں چراغ جلتے تھے اور سارے صحن میں روشنی ہوتی تھی تو اس مشین کی سیر عجب بہار دیتی تھی۔ اس پر بیٹھ کر گھومنے سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ رنگین روشنی کی مسلسل قطاریں چکّر لگا رہی ہیں۔ ایک عجیب بات اِس کے متعلق یہ تھی کہ اس میں میمیں بہ کثرت سوار ہوتی تھیں۔ گو میں نے کئی مردوں کو اس سواری سے گھبراتے دیکھا اور یہ کہتے سُنا کہ خواہ کتنی ہی احتیاطیں کر لی گئی ہیں۔ پھر بھی خطرناک ہے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ انگلستان میں عورتیں عمُوماً بزدلی کی کمزوری سے خالی ہیں اور بہت سے مردانہ کھیل شوق سے کھیلتی ہیں۔ سمندر میں غوطے لگانا۔ پہاڑوں کی چوٹیوں پر چڑھنا ان کے لئے ایسا ہی آسان اور انکو اتنا ہی مرغوب ہے جتنا مردوں کو۔ مگر طرفہ یہ ہے کہ اِن کشتیوں میں سوار ہوتے وقت یا اور کسی ہنسی خوشی کے موقعے پر اظہارِ نزاکت سے بھی دریغ نہیں کرتیں اور کشتیوں کے چلتے ہی وہ چیخیں مارتی ہیں۔ کہ اگر چیخوں کے بعد فوراً قہقہے کی آواز تسلّی نہ دیدے تو سُننے والے ڈر جائیں کہ کوئی حادثہ ہو گیا۔

اس حوض کے پانی سے دو اور کام لئے گئے تھے۔ اس کے دونوں طرف نہریں

سی نکلتی تھیں - اُن میں سے ایک کے اختتام پر ایک ڈھلوان آہنی سڑک بنی تھی - جس کے نیچے مضبوط لکڑی کی شہتیریوں سے ڈھلوان فرش بنایا گیا تھا - اس سڑک پر ایک پیتون والی کشتی بجلی کے زور سے چلتی تھی اور ڈھلوان سے زور شور کے ساتھ اُترتی ہوئی دھم سے پانی میں گرتی تھی اور گر کر جھاگ اُچھالتی ہوئی اُچھلتی تھی اور پھر نہر میں تیرتی ہوئی کنارے جا لگتی تھی - اس کا بھی ایک دھندلا سا نقشہ ہدیۂ ناظرین ہے - اس کھیل کو بھی قبولِ عام کا فخر حاصل تھا اور رونق



کے دن تو ہزاروں آدمی دن بھر میں اس میں سوار ہوتے تھے - اور کشتی اُوپر سے ایسی ترکیب سے گرائی جاتی تھی کہ کسی کو کبھی دھکے سے نقصان نہیں ہوا حالانکہ بظاہر اس کا ڈھلوان سے لڑھکتا ہوا آنا اور پانی میں گرنا سخت خوفناک معلوم ہوتا تھا - اسی نہر کے دُوسرے حصّے سے یہ کام لیا گیا تھا کہ وُہ ایک مصنوعی غار میں سے ہو کر گذرتا تھا - جو اطالیہ کی قدرتی غاروں کی نقل تھی - اور جس کے اندر لوگ کشتیوں میں بیٹھ کر ہو آتے تھے - ان غاروں کو گروٹو کہتے ہیں اور ان کی

ساخت اس قسم کی ہوتی ہے - کہ کہیں کہیں روشنی کی شعاع اندر آ گھستی ہے اور طرح طرح کے رنگ نظر آتے ہیں - اور کہیں بالکل تاریکی ہوتی ہے - سیّاح ان غاروں میں بڑی خوشی سے گھستے ہیں - اِس شوق کو ایک چھوٹے پیمانے پر پورا کرنے کا سامان یہیں کر دیا گیا تھا - اِسی سلسلے میں تھوڑی دُور ایک اَور جگہ تھی جسے دیکھ کر یہ گمان ہوتا تھا کہ ملکِ اطالیہ کا کوئی ٹکڑا کاٹ کر کسی جادو کے ذریعے سے لندن میں لا کر سجا دیا ہے - یعنی وہاں کے مشہور تاریخی شہر وینس کی نقل پیش کی گئی تھی - اس مصنوعی وینس کے دروازے کے اندر جاتے ہی کیا نظر آتا تھا؟ جنوبی یورپ کا صاف نیلگوں آسمان - اُس پر بیشمار تارے - گلی کوچوں کی بجائے پانی کی نہریں رواں تھیں - جن میں کشتیاں چل رہی تھیں اور لوگ اُن میں بیٹھ کر دوستوں کو ملنے ایک گھر سے دُوسرے گھر جاتے تھے اور دوکانوں سے سودا سلف خریدتے تھے - کشتی والے اپنی دُھن میں کچھ الاپتے جاتے تھے اور کشتی کو کھیتے جاتے تھے - مکانوں کا نقشہ ہُوبہُو وینس کا تھا اور وسطِ شہر میں ایک چوک تھا جہاں خاص اطالیہ کے گویّوں کی ایک جماعت وہیں کی زبان میں پیارے پیارے گیت گا رہی تھی - یہ ایسے گیت تھے جو ہمارے ایشیائی راگوں سے بہت ملتے - اور انگریزی طرزوں سے بالکل جُدا تھے -

اُڑنے کی مشین اور پانی میں گرنے والی کشتی کچھ اس نمائش کی خصوصیات میں نہ تھیں کرسٹل پیلیس میں بھی موجود ہیں - مگر یہاں زیادہ اچھی بنائی گئی تھیں - لیکن گروٹو کی سیر اور وینس کا نقشہ یہ اسی کا خاص حصّہ تھیں اور کہیں اَور نظر نہ آسکتی تھیں - ان کے سوا ایک بڑی خصوصیت اس نمائش کی ایک بہت ہی بڑا پہیّہ ہے - جس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ پیرس کے ایفل ٹاور کا جواب ہے - اس کی بلندی کا یہ حال ہے کہ اگر اُن گاڑیوں میں جو اس میں لگی ہیں بیٹھ جاؤ اور یہ گھمایا جاوے - تو جس وقت آپ انتہائے بلندی پر پہنچ جاویں تو لندن باوجود اپنی وسعت کے آپ کی آنکھ کی پتلی میں سما جائے - مگر افسوس ہے کہ یہ سیر بہت مقبول نہیں ہُوئی اور اِس کثیر خرچ کے اعتبار سے جو اسکے بنانے میں ہُوا ہوگا - مشکل معلوم ہوتا ہے کہ بنانے والے کو بہت فائدہ ہوا ہو - تاہم یہ پہیّہ بھی چلتا

ہی رہتا تھا۔ اور کچھ نہ کچھ لوگ اس پر بھی سوار ہو ہی لیتے تھے - ایک دفعہ عجب تماشا ہوا - لوگ اس پر سوار تھے اور بیشتر اُوپر کی طرف حرکت کر چکے تھے کہ پہیے کی کل بگڑ گئی اور حرکت بند ہو گئی - جو اوپر تھے وُہ اوپر رہ گئے - اور چونکہ رات کو کل کی مرمت نہیں ہو سکی - اِس لئے انہیں صبح تک آسمان اور زمین کے درمیان بے خواب و خور مُعلق رہنا پڑا - نقصان تو سخت نہ ہُوا - کیونکہ خدا کے فضل سے جانیں بچ گئیں



اور کمپنی والوں نے سب صاحبان کو پانچ پانچ پونڈ بطور ہرجانے کے نذر کیے - بعض لوگ تو اُن میں ایسے تھے کہ انکی تکلیف کا یہ کافی معاوضہ نہ تھا - لیکن بہت سے ایسے تھے جن کے وسائل محدود تھے اور انہیں ایک رات کی تکلیف کے عوض میں ستر اسّی روپئے مل جانا غنیمت معلوم ہُوا - شہر بھر میں اس واقعہ کا کئی دن چرچا رہا - اور لطیفہ یہ ہُوا کہ اس واقعے کے بعد بجائے پہیے کی طرف

رجوع کم ہونے کے چند دن تک ایک کثیر تعداد لوگوں کی اس میں سوار ہونے کو آتی رہی۔ اس خیال سے کہ اگر پھر کوئی ویسی ہی دِقّت پیش آئے تو پانچ پانچ پونڈ ملیں۔ مگر نہ ایسی اُفتاد روز ہوتی ہے اور نہ ایسی رقم بے محنت آئے دن ہاتھ لگتی ہے۔

اس قسم کی بہت سی کھیل تماشے کی چیزیں تھیں۔ جن کے ذریعے سے ہزاروں پونڈ روز نمائش گاہ میں آتے تھے۔ مگر کچھ کھیل تماشے کی چیزوں پر ہی تماشا ختم نہ تھا۔ اِسی نمائش میں اطالیہ کی بندوقوں اور توپوں کے نمونے تھے۔ جن سے ملک کے اسلحہ اور اُس کی جنگی حالت کا پتہ چلے۔ اِسی میں وہاں کی تصاویر تھیں۔ جن سے فنِ نقاشی کی ترقّی کا حال کھلے۔ اِسی میں سنگ مرمر اور دُوسرے پتھروں کے خوبصُورت اور سڈول بُت تھے۔ جو سنگ تراشی کے اعلیٰ نمونے کہلا سکتے تھے۔ اِسی میں لکڑی کا اچّھا اچّھا کام تھا۔ اور اسی میں اطالیہ کی دوسری صنعتوں کے نمونے دکھلائے گئے تھے۔ کہیں سوّیاں تیار ہو رہی تھیں۔ کہیں شیشے اور بلّور کا کام دیکھنے والوں کے سامنے بنایا جاتا تھا۔ کہیں چکنی مٹّی کے چھوٹے چھوٹے بُت ایک شخص اس خُوبی سے منٹوں میں بنا کر رکھتا جاتا تھا کہ دیکھنے والوں کو حیرت ہوتی تھی۔ غرض سارا میلا ہم خرما و ہم ثواب کا مصداق تھا۔ اور اس کی بہت سی باتیں ایسی تھیں۔ جو قابلِ تقلید معلوم ہوتی تھیں۔ تاکہ ہم لوگ اگر میلوں کے بغیر گزارہ نہ کر سکیں اور فطرتِ انسانی کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ شاید نہ کر سکینگے تو اتنا تو ہو کہ جو کچھ کیا جائے سلیقے سے کیا جائے اور اس میں کچھ فائدہ مدِّنظر رکھ لیا جائے +

عبد القادر (از لندن)

چاند کا منظر

اس مضمون میں میں چاند کے خوفناک سین پر جو قوی دُور بین لگا کر دیکھنے سے محسوس ہوتا ہے اور انسان کے دل پر عجب حیرت انگیز اور پُرہول اثر ڈالتا ہے ایک مختصر نظر ڈالتا ہوں۔ دُوربین لگا کر چند ساعت نظر جمائے رہنے کے بعد چاند کا ہوش رُبا منظر جس کی خوفناک خاموشی دیکھ کر انسان اپنی ہستی کو بھول جاتا ہے نظر آنا شروع ہوتا ہے۔ شادابی و سرسبزی کا کیا ذکر مُردار پہاڑوں کی بھُوت کی سی ہولناک صورت دکھائی دیتی ہے۔ ان پہاڑوں کا سلسلہ جن میں حیوانات و نباتات کی سکونت و پرورش کا کچھ پتہ نہیں چلتا دُور دُور تک سانپ کے بل کی طرح اینچ پیچ کھاتا ہوا پھیلتا چلا گیا ہے۔ اور ان کے بیچ بیچ آتش فشاں پہاڑ جن میں سیاہ کوئیں اور غار محسوس ہوتے ہیں اور جنکو دیکھ کر گیلی لیونے پرطاؤس کی آنکھوں سے تشبیہہ دی تھی۔ حلقہ حلقہ نظر آتے ہیں۔ غرض چاند میں پہاڑوں کا ایک گورکھ دھندا نظر آتا ہے۔ یہاں پر انسان کی حیرت زدہ نظر ٹھہر جاتی ہے اور وہ انکے باطنی حال دریافت کرنے کی بیکار کوشش کرتا ہے۔ پھر بیچارہ انسان مایوس ہو کر ظاہری سماں پر نظر دوڑاتا ہے اور قیاس و فکر سے کام لیکر اپنے دل کی بھڑاس نکالتا ہے۔ کوئی مینار سیدھا مینار کی طرح کھڑا اور کوئی مخروطی شکل کا سر بُریدہ پیالے کی طرح مُنہہ کھولے ہوئے نظر آتا ہے۔ ان پہاڑوں میں ایسے ایسے مہیب تاریک کنڈ اور پُرہول اندھیرے غار محسوس ہوتے ہیں کہ اگر فاصلے کے ساتھ اطمینانِ قلب نہ ہوتا تو دیکھ کر انسان کا دم نکل جاتا۔ اس خوفناک منظر کو دیکھتی بھالتی جب نگاہ پہاڑوں کی جڑ کی طرف جا پڑتی ہے تو عجیب و غریب وادیاں نظر آتی ہیں۔ جنہیں تمام حجر نشفہ یعنی لاوا کے سنگریزے اور کُل معدنیات کے منجملہ پرت محسوس ہوتے ہیں اور یہ اس زمانہ بعید کی خبر دیتے ہیں۔ جس وقت چاند زمین کی طرح اک آباد سیارہ تھا اور اُس میں حرارت غریزی باقی تھی۔ جس کی وجہ سے چاند کے آتش فشاں پہاڑ جن کا بیجان ڈھیر آج ہم دم بخود خاموش پاتے ہیں ہیجان اور جوش میں آتے تھے۔ چاند میں زلزلہ آتا تھا۔ اور آتش فشاں پہاڑوں سے خاکستر۔ خاک۔ انگارے غٹ کے غٹ بخارات۔ پگھلے ہوئے معدنیات۔ جلتا ہوا مائع مادہ۔ گرمی کے بھبکتا ہوا

بطن قمر سے جوش کھا کر اُبلتا تھا اور سینکڑوں کوس اک آگ کا دریا بہتا ہوا چلا جاتا تھا جس کو آج ہم منجمد حالت میں مرا ہوا زبان نکالے پاتے ہیں۔ اور زیادہ غور و تامل سے یہ بات معلوم ہوتی ہو کہ جُوں جُوں چاند کی حرارت زائل ہوتی گئی اس کے ساتھ ساتھ آتش فشاں پہاڑوں کا جوش بھی کم ہوتا گیا اس لیئے کہ جو آخر وقت میں مائع اُبل کر پہاڑوں کی ڈھلان سے نیچے کو بہلے ہے وہ تھوڑی ہی دُور جاتے جاتے تھم گیا ہے۔

غرض اس حیرت انگیز سین کو دیکھ کر ہمارے دماغ میں خیالات کا ایک طُوفان اُٹھتا ہو اور چاند کے گذرے ہُوئے حالات کو جو زمانہ ماضیہ کی گھنگھور تاریکی سے آلودہ ہیں جاننے کے لیئے ہمارا جی تڑپ جاتا ہو اور بیساختہ ہماری زبان سے یہ مصرع نکلتا ہے۔

دَوڑ پیچھے کی طرف آے گردشِ ایّام تو

(اقبال)

پھر جب قوتِ متخیلہ تھک جاتی ہے اور ہمارا ذہن ان خیالات کی طرف منتقل ہوتا ہو تو مایوس حیرت زدہ نگاہ دُوسری طرف جا لگتی ہے اور چاند کے مشرقی بازو پر ایک بہت بڑا کھانچا نظر آتا ہو جس پر غور کرنے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ابتدا میں اس کی گہرائی پچاسوں ہزار فیٹ تھی مگر اب وہ پہاڑوں کی بڑی بڑی چٹانوں کے ٹوٹ ٹوٹ کر گرنے سے بھرتا جاتا ہے۔ اس کھانچے کے اندر جس کا پیٹ اندر سے اُبھرا ہُوا ہے سیاہی مائل سبزی نظر آتی ہو اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے بھیگے ہوئے پتھروں پر سبز سبز کائی جمی ہو۔ یہ دلفریب رنگ جس کو دیکھ کر ایک ٹکٹکی سی بندھ جاتی ہو ہم کو کسی نہ کسی قسم کے نباتات کے وجُود کا گمان دلاتا ہو۔ لیکن ساتھ ہی اس کے یہ خیال گذرتا ہو کہ پانی اور ہوا بغیر جس کے وجود کا چاند میں کوئی نشان نہیں ملتا نباتات کا پرورش پانا اور اسکا زندہ رہنا کیونکر ممکن ہو سکتا ہے۔ کیا خُوب کسی نے اس اعتراض کو دفع کرنے کے لیئے اس بلا کے نکتے کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ممکن ہو کہ چاند میں کاربونک ایسڈ گاس جو آتش فشاں پہاڑوں سے ہیجان اور جوش و خروش کے وقت بخارات کے ساتھ کثرت سے خارج ہوتا ہو اور جو نباتات کو پرورش کرنے میں شیر مادر کا کام کرتا ہے اب تک موجُود ہو۔

یہ سوہنجتی سانجتی جب نظر دُوسری جانب کو مڑتی ہے تو کوپرنیکس جو چاند کا ایک شاندار عظیم آتش فشاں پہاڑ ہے ہماری نگاہوں کو اپنی اجنبی شکل کا تماشائی بنا لیتا ہے۔ اصل پہاڑ کے دو طرفہ چوٹیاں جن کی بلندی بارہ ہزار فیٹ کے قریب حساب کی گئی ہے۔ سیدھی مینار کی طرح سر بفلک کشیدہ نظر آتی ہیں اور اُن کے چاروں طرف ننھی ننھی آتش فشاں پہاڑیاں جن کے تنگ مخرج لب کو دیکھ کر بھڑ کے چھتے کا گمان ہوتا ہے کثرت سے نظر آتی ہیں۔ کوپرنیکس کے عجیب و غریب کھبے کی دیواریں جس کے بیچ کی گنگھور خوفناک تاریکی دیکھ کر انسان کا دل بیٹھا جاتا ہے نیچے کی طرف بالکل سلامی دار نظر آتی ہیں۔ اِس کے ہوش ربا وادیوں کو دیکھنے سے یہ یقین ہوتا ہے کہ کوپرنیکس سے کئی صدیوں تک سوختہ و گداختہ جلتا ہوا سیال مادہ اس کثرت سے اُبال کھاتا رہا ہے کہ سینکڑوں کوس تک لاوا کی دھاریں بہتی چلی گئی ہیں اور تمام وادیوں کو ڈھانک دیا ہے۔ ان دھاروں کی لہریں جو اس وقت منجمد ہو کر سنگلاخ دیواریں بن گئی ہیں ایسا اُوپر تلے پیچ و تاب کھاتی ہوئی دُور تک پھیلتی چلی گئی ہیں کہ دیکھتے دیکھتے انسان کی نگاہ تھک جاتی ہے۔ اسی سلسلے میں جابجا معدنیات کے اَن گڑھ میناروں کا جھرمٹ نظر آتا ہے جن کی مخروطی چوٹیاں قطار کی قطار چاند کی آٹھویں تاریخ کے بعد سُورج کی کرن سے ایسا چمک اٹھتی ہیں کہ اُن کے دلفریب سلسلے پر موتیوں کی لڑی کا گمان ہوتا ہے۔

جس وقت چاند بدر بنجاتا ہے تو علاوہ اس سین کے جس کو مَیں اُوپر لکھ آیا ہُوں ایک اَور نرالا اور انوکھا منظر دکھائی دیتا ہے۔ جس کی حقیقت دریافت کرنے میں ہماری عقل حیران رہجاتی ہے ذرا سا غور کرنے سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ گویا چاند کے ایک کنارے سے دُوسرے کنارے تک سینکڑوں شعاع نُور کی ندیاں بہتی چلی گئی ہیں اور اُن سب کا مرکز خروج کسی نہ کسی آتش فشاں پہاڑ میں نظر آتا ہے۔ چنانچہ ٹائیکد نامی چاند کا ایک آتش فشاں پہاڑ ہے جس سے ایسی ایسی نُور کی ندیاں بہت سی پیدا ہُوئی ہیں اور ہر سمت میں دُور دُور تک بہتی چلی گئی ہیں۔ ان میں سے ایک تو اتنی لانبی ہے کہ بلا مُبالغہ اُس کی چمکتی ہُوئی لہر کا نشان سترہ سَو میل تک حساب کیا گیا ہے۔

سب سے زیادہ حیرت انگیز بات تو یہ ہے کہ ان خیالی ندیوں کا بہاؤ عجب بلا کا بہاؤ ہے کہ پہاڑوں کے روکے بھی کہیں نہیں رُکا ہے۔ مُڑنے کا کیا ذکر جدھر رُخ کیا ہے بس اُسی طرف بڑے بڑے پہاڑ چٹان ناہموار وادیاں ٹیگرا غار کنڈ غرض جو کچھ سامنے راہ میں پڑا ہے سب کو صاف قطع کرتا ہوا نکل گیا ہے۔ دُوسری بات قابل نوٹ کرنے کے یہ ہے کہ جن پہاڑوں سے یہ شعاع نُور کی ندیاں نکلی ہیں وُہ پہاڑ بھی اسی رنگ رُوپ کے ہیں اور ان میں بھی ایسی ہی چمک دمک نظر آتی ہے اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ان پہاڑوں کی ترکیب میں بھی وُہی اجزا غالب ہیں۔ جن سے صانع قدرت نے اِن چمکتی ہُوئی لہروں کو پیدا کیا ہے۔

اب یہ خیال کرنا چاہئے کہ یہ نُور کی ندیاں جن کو چاند میں ہم اس طرح لہراتے دیکھ رہے ہیں۔ آخر ہیں کیا چیز؟ اس گُتھی کے سُلجھانے میں بڑی بڑی دماغی قوتوں نے کوشش کی ہے مگر آجتک ایسی نہیں سُلجھی جسے سُلجھنا کہتے ہیں۔ بعض نے یہ قیاس کیا ہے کہ یہ شعاعی لہریں سیال لاوا کی دھاریں ہیں جو بہتی بہاتی دُور تک چلی گئی ہیں اور اب مُنجمد ہو کر سُورج کی کرن سے چم چم چمکتی نظر آتی ہیں۔ کیونکہ اس طرح کا منظر ہم زمین پر موجود پاتے ہیں۔ اٹمنا سے جس قدر جلتا ہوا سیال مایع اُبال کھا کر نکلتا ہے وُہ آخر ندیوں کی صُورت ہر طرف بہتا ہوا چلا جاتا ہے۔ چاند کا منجم اگر اپنی دُوربین لگا کر زمین کی سیر کرے تو اُس کو بھی یہ لاوا کی دھاریں جو اٹمنا سے بہکر نکلی ہیں۔ چاند کی شعاع نُور کی ندیوں کی طرح چمکتی ہُوئی نظر آئینگی لیکن پھر تھوڑی ہی دُور کے بعد یہ ندیاں نظروں سے غائب ہو جائینگی۔ اور چاند کا منجم حیران ہو جائیگا اِس لئے کہ اٹمنا سے جو لاوا کی دھاریں نکلی ہیں وُہ کوس دو کوس جاتے جاتے گھاس پات جنگل جھاڑیوں میں چھپ گئی ہیں اور جہاں کہیں پہاڑ اُن کے سدّراہ ہو گیا ہے تو آگے بڑھنا کیسا وہیں پھیل کر ندی سے جھیل بن گیا ہے۔

اِس تقریر کا حاصل یہ ہے کہ چاند میں جو شعاع نُور کی لہریں نظر آتی ہیں وُہ سیال لاوا کی دھاریں کسی طرح نہیں ہو سکتیں اِس لئے کہ اگر ایسا ہوتا تو وُہ پہاڑوں کے حائل ہونے سے چھوٹی موٹی

کی طرح وہیں کی وہیں رہجاتیں - پہاڑوں کو کاٹتے ہوئے ناک کی سیدھ میں اُن کا اسی شان سے بہتے چلے جانا ہرگز ممکن نہ ہوتا - دوسرا نکتہ یہ ہے کہ ان لہروں کا لگاؤ محض سطحی نہیں معلوم ہوتا ہے بلکہ پہاڑوں کی طرح جرمِ قمر کو پھاڑ کر وہ اندر سے نکلے ہیں - کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ اکثر آتش فشاں پہاڑوں کے تاریک کنڈ میں بھی اُن کا ٹان چمکتا دمکتا نظر آتا ہے -

ناسمتھ نے اس دلفریب منظر کی یوں تاویل کی ہے کہ جس طرح بولی مٹی کا گولہ دفعتاً گرم ہونے یا سرد ہونے میں چٹخ کر تمام سے شق ہو جاتا ہے - اسی طرح چاند کا کرہ جس وقت تازہ تازہ صانعِ عالم کے قدرتی کارخانے سے ڈھل کر نکلا تھا اور جلتا ہوا اک سُرخ انگارہ تھا اُس وقت اپنے جرم کے چھوٹے ہونے کی وجہ سے جلد ہی جلدی ٹھنڈا ہونے میں تمام سے شق ہو گیا اور دراڑوں کی راہ سے اندر کا جلتا ہوا سیال مائع باہر اُبل آیا - لیکن چونکہ اُوپر کی جمی ہوئی پرت ابھی بالکل ٹھنڈی نہیں ہوئی تھی اس وجہ سے یہ سیال مائع باہر نکلتے ہی فوراً جم نہ سکا بلکہ عرصے تک اُسی طرح رقیق حالت میں رہا اور تمام پھیل پڑا - یہ قیاس کچھ ایسے ٹھکانے کا معلوم ہوتا ہے کہ شعاعِ نور کی لہروں میں جن کو میں اُوپر بیان کر آیا ہوں - ارتفاع کا نہ ہونا جس کی وجہ سے ان کا سایہ نہیں پڑتا اور پھر ان لہروں کے جا بجا زیادہ پھیلے ہوئے نظر آنے کا سبب پورا پورا فوراً ہی سمجھ میں آجاتا ہے - اور یہ بات بھی کسی حد تک ممکن معلوم ہوتی ہے - کہ چاند میں پہاڑوں کی خلقت شعاعِ نور کی لہروں کے پیدا ہونے کے ہزاروں ہزار لاکھو لاکھ برس پیچھے ہوئی ہے ÷

سید راحت حسین
(از بھاگلپور)

ناظرینِ مخزن

یہ سُنکر بہت خوش ہونگے کہ سرجن لفٹنٹ کرنیل جارج رینکنگ صاحب ایم۔ ڈی۔ آئی۔ ایم۔ ایس۔ سکرٹری بورڈ آف اگزامنرس کلکتہ ان دنوں ایک اعلیٰ قسم کی انگلش ہندوستانی ڈکشنری کی تصنیف میں مشغول ہیں جسکی واقعی ملک میں سخت ضرورت تھی۔ جس قدر لغت کی کتابیں پہلے موجود ہیں وُہ ایسی جامع نہیں جیسی یہ ثابت ہوگی۔ کرنیل صاحب ممدوح کا نام ایسا نہیں جو ہندوستان کے علمی دائرے میں غیر مانوس ہو۔ السنہ مشرقی کے ایک ایسے ماہر شخص کے قلم سے نکلنا ہی اس کتاب کی خوبی و عمدگی کی کافی دلیل ہے۔ کیا انگریزوں اور کیا ہندوستانیوں۔ کیا مُبتدیوں اور کیا امتحانات کے امیدواروں کیا یورپین سیاحوں اور کیا ہندوستانی تاجروں غرض سب کے لئے یہ یکساں طور پر مفید و کارآمد ثابت ہوگی۔ درحقیقت کرنیل صاحب نے ایسی ڈکشنری تصنیف فرما کر ہمارے مُلک پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ اس ڈکشنری میں انگریزی لفظ کے معنے پہلے اُردو حروف میں دیئے ہیں۔ پھر رومن میں۔ اگر کسی لفظ کے مختلف معنے ہیں تو انگریزی میں اُس کے مختلف معنوں کو الگ الگ لکھ کر اُن کے جُداگانہ اُردو معنے بیان کئے ہیں۔ ہر ایک لفظ کی تذکیر یا تانیث بھی لکھ دی ہے اور مشکل ترکیبوں کو مثالیں دیکر واضح کر دیا ہے۔ یہ ڈکشنری عنقریب تیار ہو جائیگی۔ قیمت باوجود ان تمام خوبیوں کے عـــہ ہے۔ درخواست بنام مسرس تھیکر سپنک اینڈ کو کلکتہ ہونی چاہئے۔

ریویو

الکاشف:۔ اس نام کا ایک ماہواری رسالہ ہمارے دوست قاضی حمید الدین صاحب پروفیسر آف آرٹس سنٹرل کالج سیالکوٹ نے نکالا ہے اس رسالہ کا مقصد علوم و فنون کو ترقی دینا ہے اور اسمیں علمی دلچسپیاں مہیا کرنیکے علاوہ سائنس اور صنعت و حرفت پر بھی مفید مضامین لکھے جاتے ہیں۔ قاضی صاحب نے ملک کی ایک بڑی ضرورت کو پورا کرنیکا بیڑہ اُٹھایا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ انہیں اپنے ارادوں میں ہر طرح سے کامیابی ہو اور یہ رسالہ ملک کیلئے بہت مفید ثابت ہو۔ قیمت سالانہ ع ۱۲/ لکھائی چھپائی عمدہ۔ درخواست بنام ایڈیٹر صاحب ہو۔

علمی جنتری ۱۹۰۵ء

اس مفید اور کارآمد جنتری کو سید محمد عبد اللہ صاحب آہن علم نے بڑی محنت اور جانفشانی سے ترتیب دیکر شایع کیا ہے۔ اس جنتری میں علاوہ اور مفید باتوں کے تواریخی معلومات اور مشاہیرِ عہد کے حالات خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔ قیمت اسکی غالباً ۲/ ہے۔ درخواست کرنے پر سید محمد عبد اللہ صاحب علم سوداگر چرم کانپور سے مل سکتی ہے۔

سپاسِ جنابِ امیر رضؓ

ذیل کی نظم درج کرکے آج ہم اُن احباب کے تقاضوں سے سبکدوش ہوتے ہیں۔ جو پروفیسر اقبال صاحب کے فارسی کلام کے لئے اکثر دفعہ بیحد اشتیاق ظاہر کیا کرتے ہیں فارسی نظمیں عموماً مخزن میں درج نہیں ہوتیں تاہم احباب کے اصرار سے ہم اسے ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں۔ یہی نظم باظہارِ عقیدت شیخ صاحب صبح کے وقت پڑھا کرتے ہیں۔

اے محوِ ثنائے تو زبانہا — اے یوسفِ کاروانِ جانہا
اے بابِ مدینۂ محبت — اے نوحِ سفینۂ محبت
اے ماحیِ نقشِ باطلِ من — اے فاتحِ خیبرِ دلِ من
اے سرِ خطِ وجوب و امکاں — تفسیرِ تو سورہائے قرآں
اے مذہبِ عشق را نمازے — اے سینۂ تو امینِ رازے
اے سرِ نبوتِ محمد — اے وصفِ تو مدحتِ محمد
گردوں کہ برفعت ایستاد است — اے بامِ بلند تو فتاد است
ہر ذرہ در گہت چو منصور — در جوشِ ترانۂ انا الطور
بے تو نتواں باو رسیدن — بے او نتواں بتو رسیدن
فردوس ز تو چمن در آغوش — از شانِ تو حیرت آئنہ پوش
جانم بغلامیِ تو خوشتر — سر بر زدہ ام ز جیبِ قنبر
ہشیارم و مستِ بادۂ تو — چوں سایہ ز پا فتادۂ تو
از ہوش شدم مگر بہوشم — گوئی کہ نصیریِ خموشم
دانم کہ ادب بہ ضبطِ راز است — در پردۂ خامشی نیاز است
اما چہ کنم کہ مے تولا — تند است بروں فتد ز مینا

زاندیشهٔ عاقبت رهیدم
جنسِ غمِ آلِ تو خریدم

فکرم چو بجستجو قدم زد — در دَیر شد و درِ حرم زد
در دشتِ طلب بسے دویدم — دامن چو گرد باد چیدم
در آبله خارها خلیده — صد لاله تهِ قدم دمیده
افتاده گره بروئے کارم — شرمندهٔ دامنے غبارم
پویاں سپے خضر سوئے منزل — بر دوشِ خیال بسته محمل
جویائے مئے و شکسته جامے — چوں صبح بباد چیده دامے
پیچیده بخود چو موجِ دریا — آواره چو گرد بادِ صحرا
وامانده ز دردِ نارسیدن — در آبله شکسته دامن
عشقِ تو دلم ربود ناگاه — از کار گره کشود ناگاه
آگاه ز هستی و عدم ساخت — بتخانهٔ عقل را حرم ساخت
چوں برق بجز منم گذر کرد — از لذّتِ سوختن خبر کرد
بر باد متاعِ هستیم داد — جامے ز مئے حقیقتم داد
سرمست شدم ز پا فتادم — چوں عکس ز خود جدا فتادم
پیراهنِ ما و من دریدم — چوں اشک ز چشمِ خود چکیدم
خاکم بفراز عرش بردی — زاں راز که با دلم سپردی
وصلِ تو بکنار رشتیم شد — طوفانِ جمالِ زشتیم شد
جز عشق حکایتے ندارم — پروائے ملامتے ندارم

از جلوهٔ علم بے نیازم
سوزم گریم تپم گدازم

اقبال

شعرائے قوم کو خطاب

یہ مختصر نظم ہمارے مکرم جناب آنریبل میاں محمد شاہ دین صاحب بیرسٹر ایٹ لا متخلص بہ ہمایوں کی فکر رسا کا ایک تازہ نتیجہ ہے۔ چونکہ اس نظم کا مضمون نہایت غور طلب اور نتیجہ خیز ہے اور شعرا کی خاص توجہ کا مستحق ہے۔ اِس لئے ہم خاص شکریے کے ساتھ اس قابلِ قدر نظم کو درج کرتے ہیں

نالوں سے کوئی چرخ کو چکر میں لائے کیوں
سینے میں دل کو رکھ کے کرے ہائے ہائے کیوں

اے بوالہوس فسانۂ عشق اب تو کر تمام
الفاظ خشک پر کوئی آنسو بہائے کیوں

زندہ دلی تمہاری مبارک رہے تمہیں
آتا نہیں یہ دل جو بتوں پر تو آئے کیوں

کرتی نہیں ہے جن پر اثر داستانِ حسن
پھر یہ سبق اُنہیں کوئی ازبر پڑھائے کیوں

ہر سمت جبکہ آگ لگی ہو تو میرِ بزم
پروانے اور شمع کا قصہ سنائے کیوں

جذباتِ دل کو کیوں ہو تصنع سے کچھ بھی لاگ
بُت کو خدا بنا کے کوئی سر جھکائے کیوں

مر کر بنا کرے کوئی کب تک غبارِ راہ
اس اپنی مُشتِ خاک کا خاکا اُڑائے کیوں

مثلِ پرند کون ہوا میں اُڑا کرے
دامِ خیال میں کوئی گردن پھنسائے کیوں

قُمری کی طرح کیوں کوئی کُوکُو کیا کرے
آزاد دل کو سرو کا بندہ بنائے کیوں

اے ہم نوا چمن کی ہوا ہی بدل گئی
مدت سے طرزِ نغمہ سرائی بدل گئی

یہ چہچہے خزاں میں کوئی کیوں سنا کرے
گُل ہی نہ ہو تو بُلبلِ شیدا کو کیا کرے

بجلی نے جبکہ اپنا نشیمن جلا دیا
رنگِ چمن پہ کون دل و جاں فدا کرے

چھپتا نہیں گلاب نہیں موتیا نہیں
گلچیں سوکھی شاخوں سے پتے چُنا کرے

پروانہ وار کیوں ہو نثارِ چراغِ حسن
موہوم غم کی آگ میں دل کیوں جلا کرے

جمتا نہیں ہے اب تو یہ رنگ اختلاط کا — کب تک گلے نسیم کے نکہت ملا کرے
خوں پانی ہو کے خشک خزاں میں ہوا تو کیوں — دعویٰ شہید ہونے کا برگِ حنا کرے
آہٹ خزاں کی جس نے چمن میں سُنی نہیں — ہاں بیٹھ کر وُہ نغمۂ بلبل سُنا کرے
اے ہم صفیر حالتِ گل اب یہ ہے کہ تو — شاخِ شجر سے نوحۂ ماتم بپا کرے
برباد ہوتا دیکھے چمن کو جو باغباں — پھر تیرے دلفریب ترانوں کو کیا کرے

وُہ گیت گا کہ باغ میں بس جان ڈال دیں
اور صحنِ بوستاں سے خزاں کو نکال دیں

اَے شاعرانِ قوم زمانہ بدل گیا — پر مثلِ زُلفِ یار تمہارا نہ بل گیا
بیٹھو گے کب تلک سرِ رہ تم لکیر کو — بجلی کی طرح سانپ تڑپ کر نکل گیا
دیوانہ وار بیٹھے ہو سینوں پہ رکھ کے ہاتھ — یہ کس کا ہاتھ سب کے دلوں کو مسل گیا
آخر ہر ایک دل کو ہے اُلفت سے کچھ تو لاگ — کیا اِک تمہیں پہ عشق کا جادو ہی چل گیا
یہ کیا غضب کہ ڈوب گئے سات آسماں — آنسو تمہاری آنکھ سے گر اِک نکل گیا
روشن ہوئے ہیں نورِ بصیرت سے دو جہاں — سوتے میں کوئی آنکھوں پہ گر پاؤں مل گیا
اُٹھو وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی — دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا
اِک تم کہ جم گئے ہو جمادات کی طرح — اِک وُہ کہ گویا تیر کماں سے نکل گیا
ہاں ہاں سنبھالو قوم کو شاید سنبھل ہی جائے — گر گر کے ملکِ ہند کچھ آخر سنبھل گیا

دِن گذرا پر تمہاری وُہی ایک بات ہے
سر پر کھڑی وُہ دیکھو قیامت کی رات ہے

اَے نوجوانو! آؤ کہ کچھ کر دکھائیں ہم — طرزِ قدیم شعر و سخن کو مٹائیں ہم
دِل کے بتوں کو توڑ کے فطرت پرست ہوں — نامِ خُدا پہ کعبے میں ایمان لائیں ہم
لفظوں کا جادو چھوڑ کے ہوں معنی آفریں — فکرِ رسا کے خوب کرشمے دکھائیں ہم

اِک طرح دلفریب کی بُنیاد ڈال دیں
اور دل سے محو کر دیں وُہ اگلی ادائیں ہم
آئینِ نَو کو سیکھیں اس عہدِ جدید میں
بوسیدہ ہو گیا ہو جو دفتر جلائیں ہم
رنگِ چمن کچھ اَور ہے غنچے کی بُو کچھ اَور
گل کو نئی بہار کے نغمے سُنائیں ہم
ہندوستان میں ایک نئی رُوح پھونک دیں
جو قوم مرچکی ہے اُسے پھر جلائیں ہم
ایسے برس پڑیں کہ ہو شاداب مُلکِ ہند
حُبِّ وطن کی کالی گھٹائیں اُٹھائیں ہم
کیا خُوب ہیں خیال ہمایُوں صد آفریں
لیکن خفا نہ ہو تو تمہیں سچ بتائیں ہم

جو کچھ لکھا ہے اس میں اثر کا مزا نہیں
ناصح جو بے عمل ہو کسی کام کا نہیں

محمد شاہ دین

سپوت بیٹا

آتا ہے ہند سے تو اَے نوجوان سپاہی
مجھ کو بھی کچھ بتا جا - رکھے تجھے الٰہی
اُنیسویں کی پلٹن ہے اِک وہاں بہادر
جس کا ہر اک سپاہی مشہور ہے دلاور
کچھ اُن کا حال کہنا اور مجھ کو یہ بتانا
کیا ہیں وُہ سب سلامت اور خرّم و توانا
بیٹا مرا ہے اُن میں - میرا عزیز لڑکا
جس کی ہے سب سے بڑھکر دُنیا میں - مجھکو پروا

احساں کرے گا ماں پر اُس کی خبر بتا کر
لے رانڈ کی دُعائیں اس کی خبر سُنا کر"

آتا ہُوں ہند سے مَیں - موجُود جنگ میں تھا
حصّہ مرا بھی اُس جا تیغ و خدنگ میں تھا

"اُنیسویں جو پلٹن ہے خوب جانتا ہُوں　　اُس کے سپاہیوں کی جُرأت کو مانتا ہُوں
افسر ہوں یا سپاہی سب سے ہُوں میں شناسا　　ہمراہیوں سے اپنے ہر اک ہے دوست میرا
لایا پیام ہُوں اِک تیرے لئے بڑی ماں
رابرٹ کا تیرے پیغام - خوش خوش سُنو بڑی ماں"

"رابرٹ کو میرے تم کیا پہچانتے ہو بیٹا؟　　سچ سچ بتانا جو کچھ تم جانتے ہو بیٹا
اَے نیک خو سپاہی اُس کا پیام کیا تھا　　کہنا اُسی کے الفاظ - اُس کا کلام کیا تھا
ہائے - وہ لفظ کہنا جو اس کے منہ سے نکلے　　لختِ جگر کے میرے جو اپنے مُنہ سے نکلے
تجھ کو خبر نہیں وُہ - کیسا مجھے ہے پیارا　　اپنی ضعیف ماں کی ہے - آنکھ کا وُہ تارا
فُرقت میں اُس کی ماں کا کیا حال ہو رہا ہے
یہ دل مرا غموں سے - پامال ہو رہا ہے"

"ہیولاک کی لڑائیاں اُس نے لڑی ہیں ساری　　دُشمن پہ وار سارے اُس کے ہُوئے ہیں کاری
دوبار لکھنؤ پر وُہ چڑھ کے خُوب اُڑا ہے　　تلوار سے لڑا ہے اور توپ سے لڑا ہے
کر شکر اُس خدا کا جس نے اُسے بچایا
ہر معرکے میں اُس پر حق کا رہا ہے سایا"

صد شکر یا الٰہی - طاقت نہیں بیاں کی　　تُو نے سُنی دُعائیں اُس کی غریب ماں کی
اَے دو جہاں کے مالک اَے کردگار میرے　　اس رانڈ ناتواں کی سُن لی - نثار تیرے
گولے کی زد سے روکا تلوار سے بچایا　　اپنے کرم کا نقشہ دِل پر مرے جمایا
پر ہاں مجھے بتا دے پیغام اُس کا کیا تھا
اپنی ضعیف ماں کو کہنے کو کیا کہا تھا"

"اَے ماں بہادری سے تیرا لڑا ہے لڑکا　　اور ہر زباں پہ اُس کا پھیلا ہوا ہے چرچا
کرنل کی جاں کو اُس نے رن میں بچا لیا تھا　　سرکار میں یہ قصّہ سارا لکھا گیا تھا

اِس کے صلے میں اس کو تمغہ عطا ہوا ہے — زاید براں وظیفہ اس کو دیا گیا ہے

ہے خوش نصیب لڑکا تیرا بہت بڑی ماں
خوش قسمتی کا اسکی تارا رہے درخشاں

"اے نیکدل سپاہی تیری زباں پہ رحمت — جس خانداں سے ہے تو اُس خانداں پہ رحمت
اے پیارے عہ مرنے والے تو کاش آج ہوتا — اس میرے جھونپڑے میں کیا رنگ راج ہوتا
دُکھ درد جو سہے تھے سب محو ہو گئے ہیں — سالوں کے رنج و غم کو یہ لفظ دھو گئے ہیں
پر ہاں ابھی تو باقی کچھ پُوچھنا تھا تُم سے — حالت تھی اس کی کیسی اور کیا کہا تھا تُم سے

رابرٹ کا حال کیا تھا اور رنگ و روپ کیا تھا
لِلّٰہ مجھے بتا دو تم سے جو کچھ کہا تھا"

"سُرخی سے اس کی رنگت تانبا سی ہو رہی ہے — داڑھی نکل کے خوبی عارض کی کھو رہی ہے
ایسا بدل گیا ہے وُہ نازنیں شمائل — پہچان اس کی اماں تم کو بھی ہو گی مشکل
مرد جوان کیا ہے ہم نے تمہارا بچہ — دِل اس کا پر وُہی ہے ہرگز نہیں ہے بدلا
رکھتا ہے یاد تجھ کو۔ کرتا ہے تیری باتیں — اور جانتا نہیں ہے وہ ایسی ویسی باتیں

لیکن جہاز اُس کا سمجھو لگا کنارے
جلدی ہی خود ملیگا وُہ آ کے تم کو بارے"

"ہیں سچ مچ آ رہا ہے سچ مچ ملے گا مجھ کو؟ — کب میرا پیارا ننھا دیدار دے گا مجھ کو
تم نے کہا تھا جلدی آیا وُہ چاہتا ہے" — جھوٹا نہیں مَیں اماں سچ مچ وُہ آ چکا ہے"

"او میرے پیارے رابرٹ! اماں تمہاری واری"
"او ماں مَیں تیرے قرباں۔ حق نے سُنی ہماری"

عبد الرشید چشتی مرحوم

عہ خاوند سے مراد ہے جو مر چکا ہے ۱۲

بھونرا

بھونرا لوبھی پھول کا کلی کلی رس لے (ہندی دوہرا)

طائرِ خوش خبر ہے نام مرا ــہ
اُلفتِ حُسن ہے پیام مرا

مری بستی ہے پھول کی خوشبو
غنچہ و گل کی دید کام مرا

وادیٔ کوہ سیرگاہ مری
باغ مسکن ہے صبح و شام مرا

نہیں کس گل سے رسم و راہ مری؟
سب پہ پھیلا ہوا ہے دام مرا

پھول پھولے نہیں سماتے ہیں
مسکراتے ہیں سُن کے نام مرا

جتنے یہ کج کلاہ غنچے ہیں
جھک کے لیتے ہیں سب سلام مرا

مانتے ہیں صنوبر و شمشاد
سروِ آزاد ہے غلام مرا

بادۂ اُنس کا نشہ ہے مجھے
مَے اُلفت سے پُر ہے جام مرا

حُسن کو ڈھونڈھتا ہوں ہر گل میں
ذوقِ دید اس قدر ہے عام مرا

جستجوئے گل است ہستیٔ من
ہوشیاری نثارِ مستیٔ من

شاہدِ گُل کا حُسنِ جاں پرور
کوئی دیکھے گا مجھ سے کیا بڑھ کر؟

ابھی اس کے جمالِ رعنا تک
نہیں پہونچی نگاہِ ذوقِ نظر

ابھی اس بھینی بھینی خوشبو سے
نہیں مہکا مشامِ بادِ سحر

ابھی اس پیارے پیارے چہرے کو
نہیں دھویا ہے اوس نے آکر

اس کی شہرت کا چار سُو پیغام
نہیں لے کر گئی نسیمِ سحر

ــہ ذوق ؎ بلا سے ہووے مرا مرغِ نامہ بر بھونرا ۔ کہ اسکو دیکھ کے وہ منہ سے خوش خبر تو کہے ۱۲

حال پر عندلیبِ نالاں کے
نہیں کی اُس نے مُسکرا کے نظر

اس دلآویز حُسنِ زیبا کی
نہیں گلچیں کو خواب میں بھی خبر

مَیں ہُوں اس حال میں بھی گُل سے قریں
ہیں عنایات اس قدر مجھ پر

ہم نفس ہُوں انیس و محرم ہوں
میری اُلفت میں اس قدر ہے اثر

جملہ آرائے خلوتستم من
بزم پیرائے جلوتستم من

دادِ گلگشت دے رہا ہُوں مَیں
محوِ ہر رنگ و ہر ادا ہُوں مَیں

پیار کرتا ہُوں جا کے گیندے کو
مُنہہ بنفشے کا چومتا ہُوں مَیں

آنکھ نرگس سے جا لڑاتا ہُوں
مائلِ چشمِ فتنہ زا ہُوں مَیں

لگ چلا ہنس کے سیوتی سے کبھی
کبھی چنپا سے جا ملا ہُوں مَیں

کبھی جُوہی سے چھیڑ کر بیٹھا
دِل لگی میں کوئی بلا ہُوں مَیں

یاسمن ہی سے میری سرگوشی
موتیا سے سخن سرا ہوں مَیں

ہے نسیمِ سحر سے یارانہ
رازدارِ دلِ صبا ہُوں مَیں

دِل دُکھاتا نہیں کسی کا کبھی
رہروِ جادۂ صفا ہُوں مَیں

سِرِّ خُذ مَا صَفا سے واقف ہُوں
علمِ دَع مَا کَدِر پڑھا ہُوں مَیں

دلم از نورِ مِہر معمور است
رسمِ بیگانگی ز من دُور است

فنِ نظّارہ میں ہوں مَیں یکتا
سب کو لازم ہے اقتدا میرا

مجھ سے اہلِ نظر یہ گُر سیکھیں
مَیں ہُوں ذوقِ سلیم کا پُتلا

حُسن ہی سے مجھ کو ہے لگاؤ مگر
دِل کسی پھول کو نہیں دیتا

روگ دِل کو نہیں لگاتا مَیں
گو مَے شوق کا ہُوں متوالا

میرا مطلوب ہر جگہ موجود　　میرا محبوب ہر طرف پیدا
نہیں میرا مثالِ بلبلِ زار　　شیوۂ کار جھینکنا رونا
گل کو نفرت نہیں دلاتا مَیں　　شوق اپنا جتا کے حد سے سوا
نہیں مَیں زید و عمرو کا پابند　　مَیں مقید ہوں دامِ الفت کا
ہے ہر اک گل نگاہ میں میری　　شوخ سے شوخ سادہ سے سادا

در تصوّر چہ انجمن دارم
جلوۂ گل چمن چمن دارم

نیرنگ

"اے ہمصفیر میرے سینے میں دل نہیں ہے"

مَیں کیا کروں جو نکلیں نالے بھی میرے موزوں　　موزونیٔ طبیعت اک دین ہے خدا کی
مرغِ قفس ہوں گھبرا گھبرا کے چیخ اُٹھا ہوں　　فرصت کہاں ہے مجھ کو نغمے کی اور صدا کی
شاعر ہوں مَیں نہ حاشا شاعر کا ہوں وہی　　ہاں مشق کر رہا ہوں فریادِ بے صدا کی
کیوں عشق کا لگاؤں مَیں روگ اپنے جی کو　　اور کیوں کروں مسیحا سے التجا دوا کی
انسان آپ حسنِ انسان پہ ہو عاشق　　یہ عاشقی نہیں ہے نخوت ہے انتہا کی
اور ہو بھی تو نتیجہ اس کا یہ ہے کہ دل میں　　سو خار کی خلش ہے کاوش ہے خارِ پا کی
معشوق کو کس عاشق نے پاک دل سے چاہا　　کس مہ جبیں نے اپنے جانباز سے وفا کی
کیا عاشقی یہی ہے لکھا کروں قصیدے　　تعریف میں حیا کی انداز کی ادا کی

مَیں ننگ جانتا ہُوں مضمون ناف و پستاں
تفضیح اور اپنے محبُوب دلربا کی

ہے مجھ کو وصل و ہجراں دونوں میں ایک لذّت
فرقت سے ہُوں نہ نالاں قسمت کا ہوں نہ شاکی

اَے عاشقو بتاؤ دِل کیا ہوا تمہارا؟
اَے مرنے والو تم نے جان عزیز کیا کی

اَے مَے کشو تم اتنی کیُوں پی گئے کہ اب تم؟
بیخود پڑے ہُوئے ہو سر کی خبر نہ پا کی

اَے گلبنِ سخن کے دیرینہ باغبانو
دیکھو بہار میرے صحرائے پُرفضا کی

قدرت کے پاک ہاتھوں سے یہ چمن لگایا
شاہد ہے اس پہ بُلبل کے آنسوؤں کی پاکی

اس پاک صاف گلشن میں آہ ایک کوئل
تانیں ٹھہر ٹھہر کر لیتی ہے کِس بلا کی

ہر چند کوک اسکی سیدھی سی اِک صدا ہے
تاثیر اس صدا میں لیکن ہے انتہا کی

قانون تار و پودِ قدرت کا بج رہا ہے
اور بہ رہا ہے نغمہ امواج میں ہَوا کی

جنبش سے شاخِ گل کی ہے شکل وجد پیدا
پتوں کی تالیوں میں ہے شان مرحبا کی

اے شاعرو تمہاری قوال گائیں غزلیں
محفل میں اور گُونجے آواز واہ وا کی

یہ لذّتِ مسرّت تم کو رہے مُبارک
مَیں نے خوشی سے تم کو بخشی تمہیں ہبا کی

رقت اُس ۱؎ "آہے آہے" پر ہو تمہیں کو مجھ کو
سودا نہیں کہ ناچوں آواز پہ درا کی

مَیں شورشِ جہاں سے خود دُور بھاگتا ہُوں
پروا نہیں ہے مُجھ کو تحسین و مرحبا کی

اس شاعری میں مجھ کو بتلاؤ ملگیا کیا؟
شاہ دکن نے کوئی خلعت مجھے عطا کی؟

ہاں پاگیا بہت سے میں ہمخیال اپنے
میرے لئے بہت کچھ نعمت ہے یہ خدا کی

دن رات میری پرنم آنکھوں میں پھر رہی ہیں
دیرینہ صحبتیں ان دیرینہ آشنا کی

جو دُور کالے کوسوں سے کان میں لگائے
آواز پر وطن کے مرغانِ خوشنوا کی

فونوگراف میں جو بھر بھر کے لے گئے ہیں
یہ خوشگوار آہیں نادر سخن سرا کی

اور آہ وہ جوانی کی نیند سونے والے
جو بیخبر پڑے ہیں آغوش میں فنا کی

۱؎ "آہے آہے" محفل حال و قال میں قوالوں کی وہ صدا جس پر وہ زیادہ زور دیکر گاتے ہیں۔

جب یاد آگئے ہیں آنسو نکل پڑے ہیں
اور ہاتھ اُٹھا کے میں نے اُن کے لئے دُعا کی

"اے ہمصفیر میرے سینے میں دل نہیں ہے"
اک فرد ہاتھ میں ہے یارانِ باصفا کی

نادر علی خان نادر

خیالاتِ منظوم

(بُری صحبت)

شریفوں کے بچّے بُری صحبتوں میں
جہاں تک ہو امکان ہرگز نہ بیٹھیں

یہ مانا کہ ہیں صاحبِ عزم و ہمّت
ہمیشہ وہ محفوظ رکھینگے عصمت

اگر کچھ نہیں اور بدنام تو ہیں
مگر بد سے بدتر ہیں بدنام جو ہیں

سفید اُن کی ناموس کی ہے جو چادر
ابھی گو یا رکھی ہے دھوبی نے لاکر

یہ ممکن نہیں گو بچائیں وہ از بس
بجز داغ کے صاف لے آئیں واپس

سفیدی میں میل اور دھبّہ ذرا سا
نظر آئے گا دُور سے بدنما سا

یہ ہے ذکر اُن کا تو ہی ہیں جو دل کے
مگر ہیں جو ان میں طبیعت کے بودے

کہاں ہے علو ہمّتی ان میں رکھی
وُہ پھنس جائینگے شہد میں جیسی مکھی

جو سمجھائے گا اُنکو سمجھینگے دشمن
قریبوں سے ہو جائیگی سب سے اَن بن

نشہ عیش و عشرت کا جائیگا چڑھتا
غرض انہماک ان کا جائیگا بڑھتا

نکلنے کا خود بھی کریں گر ارادہ
نکلنا تھا کیسا پھنسینگے زیادہ

(ترقی کی کیفیت)

یہ اکبر سے پُوچھا خداوندِ عالم — قناعت فتوحات سے کب کروگے؟
کہا اُس نے قائم نہیں دہر میں کچھ — جو بڑھتے سے ٹھہرے تو اُلٹے پھروگے
مگر قولِ عارف ہے اس سے بھی بڑھکر — نہ مانا اگر اس کو مصیبت بھروگے
کہ دُنیا میں اب دورِ بائی سکل ہے — جو اک لحظہ ٹھہرے تو فوراً گروگے

پیرزادہ محمد حسین عارف

ایک ناکام بیرسٹر کا انجام

لُٹائی خُوب ہی باوا کی دولت ہم نے لنڈن میں — گیا تھا چھوڑ تنہا باغباں گلچیں کو گلشن میں
خریدارِ متاعِ جلوہ "تھا یاں "حسن بے پروا" — بھرے تھے پھُول رنگارنگ آزادی کے دامن میں
نہ تھی مضمر نقابوں میں یہاں عارض کی رنگینی — نہ تھے نازو ادا پنہاں یہاں پردے کی چلمن میں
نظر آیا یہاں پریوں کا ہم کو جمگھٹا ایسا — لگا دی آگ جس نے صبر اور دانش کے خرمن میں
کبھی گرجا میں جاکر ہم نے جھانکا ماہرویوں کو — کبھی تاک آئے ہم جاکر کسی گلرو کو گلشن میں
کبھی پہونچے تھیٹر میں تو چھنوا آئے دل اُن سے — ہے جادو جن کی باتوں میں ہر شوخی جنکی چتون میں
کبھی "پکنک" کے جلسے میں ہوئے شامل تو دن بھر — حمائل ہاتھ تھے "شمپین" کی بوتل کی گردن میں
ہمیں گلیوں میں شب کو بارہا یہ مُرغِ دل اپنا — نظر آیا کسی گیسوئے زریں کے نشیمن میں
کبھی گھوڑ دوڑ میں جاکر لگائیں بازیاں ہم نے — کہ اس میں جیتنا اور ہارنا داخل ہے فیشن میں

"مٹن چاپ" اور "کٹلٹ" کھا کے ہم ہنستے تھے خوب اُنپر
مگن رہتے ہیں جو دال اور چپاتی اور سالن میں

پہن کر کوٹ اور پتلون ہوتی تھی ہمیں حیرت
بسر ہوتی ہے کیونکر پائجامے اور اچکن میں

بررتے اینڈ تے "وسٹ اینڈ" میں جب جا نکلتے تھے
تو خم آنے نہ دیتا تھا کلف کا لرکا۔ گردن میں

ہماری "ٹائی پن" کے آگے سورج کی کرن یوں تھی
پڑا میلا سا اک تاگا ہو گویا چشمِ سوزن میں

خط آتا تھا جو باوا کا کہ کچھ پڑھتے بھی ہو بیٹا
تو لکھ دیتے تھے ہم "محنت سے خوں بھی خشک ہے تن میں"

نہیں شک اس میں گُر سیکھے ہزاروں ہم نے فیشن کے
نہ سیکھا ایک نکتہ بھی مگر قانون کے فن میں

کتابیں بن گئیں گلدستۂ طاقِ فراموشی
ہُوئے رہ رہ کے برسوں فیل ہم "اگزیمنیشن" میں

ولایت میں غرض ہم نے اُڑائے ایسے گلچھرّے
کہ لی جمشید نے حسرت سے کروٹ اپنے مدفن میں

مگر کب تک یہ گلچھرّے! جو ہوتا گنجِ قاروں بھی
تو ایندھن کے لئے کافی نہ ہوتا ایسے گلخن میں

اُٹھے جب صبح کو اک دن تو جیبوں میں نہ کچھ پایا
ہُوئی خالی بھری تھی جس قدر اسٹیم انجن میں

شرابؔ و مطربؔ و ساقی چھُٹے یکلخت سب ہم سے
سکھایا بے زری نے فلسفہ آخر کو لندن میں

ہُوئے جب ہمنشیں پرسانِ حال اُن سے کہا ہم نے
"میں دامن ہی نہیں رکھتا جو اُلجھے خار دامن میں"

ظفر

فلکِ اخضری ہے جام مرا

یہ نظم میرزادہ بشیر احمد صاحب کے مضمون "میرا ساغر آسمان ہے" کا منظوم ترجمہ ہے۔ اصل مضمون مخزن ماہ ستمبر سنہ ۱۹۰۴ء میں چھپا تھا۔ اُس پر مغز نثر کا یہ دل کش اور رنگین ترجمہ باعث دلچسپی ہوگا:۔

لگاؤں گا نہ تجھے مُنہ میں او مئے انگور
کہ تو ہے مایۂ فسق و فجور و عُجب و غرور

میں وہ نہیں کہ ترا جام پی کے ہوں بدمست — وہ بادہ کش ہوں کہ کہتے ہیں مجھ کو مستِ الست

مری شراب ہی تجھ سے کہیں مصفا تر — لطیف و خوش مزہ و خوشگوار و زیبا تر

تری شراب سے پرہیز گار ہوں ساقی — کہ مستِ بادۂ جوشِ بہار ہوں ساقی

وہ رند ہوں کہ خُمِ آسماں ہے جام مرا — بلند صوفی و واعظ سے ہے مقام مرا

ایاغ ساقیِ گردوں جو میرا بھرتا ہے — دماغ عالمِ بالا کی سیر کرتا ہے

ہوں مستِ نشۂ جامِ مظاہرِ قدرت — غضب کے ہوش رُبا ہیں مناظرِ قدرت

پہاڑیوں کی فضائیں ہیں خوشگوار عجب — رواں ہیں کوہ کے دامن میں آبشار عجب

مقام یہ نہیں دیکھے ہیں نیشکر! تو نے — کیا نہیں ابھی کہسار کا سفر تو نے

یہ دلفریب مقامات چل دکھلاؤں — پہاڑیوں کی ہوائے خنک کھلاؤں

پئیں گے رل کے مے آفتاب چل تو سہی — عجب بہار ہے گلگشت کو نکل تو سہی

نثار میں ترے اے کردگار! قدرت کے — کہ چپے چپے پہ جلوے ہیں تیری صنعت کے

ازل ہی صانعِ ارض و سما تھی ذات تری — دلیل ہے تری ہستی کی کائنات تری

کہاں تھا میں مری قسمت مجھے کہاں لائی — عدم سے جانبِ ہستی کشاں کشاں لائی

گراں ہے ہجر ترا جانِ ناشکیبا کو — تلاش ہے اسی جلوے کی چشمِ مینا کو

کرے نہ روح مری کیوں تری طرف پرواز — کہ زیست ہو تری قربت میں تفرقہ انداز

میں کاش عمرِ رواں! تجھ کو چھوڑ کر بھاگوں — طلسم خانۂ ہستی کو توڑ کر بھاگوں

مکیں جو روح کا خالی مکان دیکھتے ہیں — تو سر اٹھا کے سوئے آسمان دیکھتے ہیں

کوئی عقاب کی چنگل میں جیسے ہو کودک — نگاہ یاس سے ماں دیکھتی ہو سوئے فلک

نجات دے مجھے ان شورشوں سے تو یارب
کہ مجھ کو ہے ترے جلوے کی جستجو یارب

سرور جہان آبادی

نخلستان

صحرائے لق و دق میں ہو اک درختِ خرما   فرشِ زمیں پہ جس نے ڈالا ہے اپنا سایا
جو میزباں رہا ہے اکثر مُسافروں کا   بیٹھا ہے اُس کے نیچے اک مردِ اجنبی سا
جو اپنا لحنِ دل کش جنگل کو ہے سُناتا

آے قافلوں کے مسکن - اے کارواں کی ملجا   بھولے ہوؤں کے مونس - بھٹکے ہوؤں کے ماوا
کھوئے مسافروں نے آرام تجھ سے پایا   سُنتا رہا ہے تیری تعریف کا ترانا
عدنانیوں کے مُنہہ سے ہر عہد میں زمانہ

ارضِ عرب پہ تیرے احسان ہیں سراسر   دل کش کیئے ہیں تو نے بیت الحرم کے منظر
یثرب کے باغ و صحرا آباد تجھ سے اکثر   بصرے کو شان تجھ سے کوفے کو ناز تجھ پر
سرسبز تجھ سے دائم ہے سرزمینِ بطحا

تعریفی گیت تیرے گایا کیئے پرندے   سُورج نے بھی سُنے ہیں - یہ راگ چھپتے چھپتے
یا اُس نے سر نکالا مشرق میں جب افق سے   اُس نے سُنا ہے اکثر چڑیوں کو یوں چہکتے
آے وُہ جسے نہیں ہے غم موسمِ خزاں کا

گر آسماں کے نیچے تو شاندار تنہا   عظمت دکھاتے اپنی ایسے کھڑا نہ ہوتا
سنسان کیسے ہوتے - وادی و کوہ و صحرا   پھر کون قافلوں کا مہماں نواز ہوتا
گویا کہ تو سبب ہے جنگل کی آبرو کا

ہے دل میں آرزو یہ پوجوں مَیں تیری مورت   شاخوں سے تیری ہم کو دکھلا کے اپنی صورت
سکھلائی مسجدوں میں محراب کی ضرورت   ہے پتّا پتّا تیرا تیغِ دو دم کی صُورت
تاجِ زمرّدیں سے ہے سبز نور پیدا

پیغام دے رہا ہے تیرا ہر ایک پتّا   اس تازہ میہماں کو جس کو کہ شوقِ کعبہ
پہنچا گیا ہے تجھ تک اور موت کا فرشتہ   کہتا ہے اس سے آکر۔ ہے قصد اب کدھر کا
چلئے ہمیں بُلایا اُس نے کہ جو ہے یکتا

وُہ ہے خطاب کرتا اس نعشِ بیکفن سے   ہے ہے اِس آرزو میں نکلا تھا تو وطن سے
اس شوق میں ہی گذرا تو دشت سی چمن سے   تو نے نہ چھوڑی یہ دُھن گو جان نکلی تن سے
بیشک لباسِ کعبہ ماتم ترا کرے گا

نیچے ترے کھڑا ہے اک سُرخ رنگ خیمہ   اِک بے نقاب چہرہ ہے جس میں جلوہ فرما
تو اس سے چپکے چپکے یُوں کہ رہا ہے گویا   اَے قابلِ پرستش دوشیزہ تو نکل آ
تجھ کو یہاں نہیں ہے نامحرموں کا کھٹکا

وُہ مقبرے پہ گنبد جو ہے دکھائی دیتا   خلوتکدہ ہے جو اک مہمانِ دائمی کا
صدیوں سے قبر میں جو پھیلا کے پاؤں سویا   ڈالا ہے بعدِ مُردن تو نے بھی اُس پہ سایہ
پھولوں کا ہار لاکر شام و سحر چڑھایا

اَے خوشنما پکھیرو۔ اے دلربا پرندو   اِک بات پُوچھتا ہوں اس کا جواب تم دو
سنسان جنگلوں میں تم کیوں چہک رہے ہو   آئیگا کون سُننے اس لحنِ دِل رُبا کو
شاید تمہارے نغمے سُنتا ہی نخلِ خرما

محمود شیرانی (از لندن)

تازہ غزلیں

اب بھی جو سال بھر یہ چمن میں نہ آئیگی
عُقبیٰ میں کیا بہار مجھے بخشوائے گی

اَے آہ تو نہ کھول سکیگی درِ قبول
مانا کہ جا کے دیر تلک غُل مچائیگی

راتیں تو اب ہیں عمرِ طبیعی کی بھی اخیر
کیوں اَے شبِ فراق کہانتک ستائیگی

سُنتے ہیں ضبطِ آہ سے بنتا ہی دل کا کام
اُس کو بھی دیکھ لینگے اگر جی میں آبنیگی

مشقِ خرامِ ناز میں یہ موج کیا ضرور
پاپوش سے کسی کی اگر جان جائیگی

بیٹھے بٹھائے دِل میں جو حسرت کو دُوں جگہ
کیا آ کے آرزو کوئی آفت نہ ڈھائیگی

مَیں چاہتا ہوں جب تو ملاتی نہیں ہے آنکھ
ڈھونڈے گی جب تو پھر نہ مجھے دُنیا پائیگی

بچھڑے ہوؤں سے ملنے کی ہے آرزو کمال
کس شوق سے عدم کی طرف روح جائیگی

کیا حسرتِ وصال کی تشویش ناصحا
مَیں خود مُوا ہوا ہُوں مجھے کیا ستائیگی

فصلِ خزاں ہے آنے دو شبنم کو باغ میں
بے اختیار دیر تک آنسو بہائیگی

لے کر چلی ہے ساتھ جو دردو غم و الم
اَے رُوح کس خرابے میں بستی میں جائیگی

یہ کوَن زندگی ہے کہ مر مر کے ہو بسر
کیا شاؔد سنکھیا نہ مرے ہاتھ آئیگی

(شاؔد)

پابندِ عشق ہو کے جو شوریدہ سر ہوں مَیں
زندان ہے مجھ کو وسعتِ عالم جدھر ہوں میں

بے نشہ مَیکشوں کی طرح بے خبر ہوں مَیں
کس کی نگاہِ مست کا یارب اثر ہوں میں

فرقت میں شام ہی سے لبوں پر ہے جانِ زار
مالک سحر لَو لگی ہے چراغِ سحر ہوں مَیں

پہلو میں میرے آتے ہی بیچین کیوں ہوئے
کس مُنہ سے کہ رہے تھے قرارِ جگر ہوں مَیں

اُلفت بُتوں کی دل میں ہے میرے خُدا کی شاں
جو پتھروں پہ جم کے اُگا وُہ شجر ہوں مَیں

دونوں نے مل کے اُس کی گلی میں گرا دیا
ممنونِ لغزشِ قدم و دیدۂ تر ہوں میں

(حامد علیخاں بیرسٹرایٹ لا۔ لکھنو)